ڈائرکٹوریٹ آف ڈِسٹینس اینڈ ''آن لائن'' ایجوکیشن

یونیورسٹی آف جموّں، جموّں

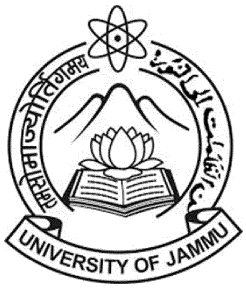

کلاس	: ایم۔اے	مضمون	: اُردو
کورس نمبر	: 306 (پریم چند کا خصوصی مطالعہ)	سمسٹر	: سوم
یونٹ	: I-IV	اکائی	: 1-14

پروفیسر شہاب عنایت ملک

کورس کوآرڈی نیٹر، ایم۔اے، اردو، ڈی۔ڈی اینڈ اُو۔ای

صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

ڈاکٹر افتخار احمد

ٹیچر انچارج، ایم۔اے اردو

ڈی۔ڈی اینڈ اُو۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

(c) جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام: نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

۱۔ ڈاکٹر نہال احمد انصاری (اکائی 1,2,3,4,5,6)

اسسٹنٹ پروفیسر اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کالج آف ٹیچر ایجوکیشن

۲۔ ڈاکٹر امام الدین (اکائی 7,8,9)

۳۔ ڈاکٹر امتیاز احمد (اکائی 10,11,12,13,14)

اڈیٹنگ : ڈاکٹر افتخار احمد

ٹیچر انچارج، ایم۔اے اردو، ڈی۔ڈی اینڈ اُو۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU

Assignment Questions

M.A URDU 3rd Semester

Course Code : 306 (Special Study of Preem Chand) **Total Marks : 20**

(نوٹ) مندرجہ ذیل سوالوں میں سے صرف دو کے جواب لکھئے۔نمبر مساوی ہیں

سوال نمبر۱۔ پریم چند کے فن پر ''آریہ سماج'' تحریک کے کیا اثرات پڑے؟ وضاحت کیجئے۔

سوال نمبر۲: پریم چند کی ناول نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے۔

سوال نمبر۳: پریم چند کی افسانہ نگاری پر بھرپور روشنی ڈالیے۔

SYLLABUS

Examination to be held in Dec. 2020, 2021 and 2022

TITLE OF THE COURSE:	STUDY OF PREM CHAND
CREDITS: 4	MAXIMUM MARKS : 100
TIME: 2.30hrs.	a) SEMESTER EXAM: 80 MARKS
	b) INTERNAL AA : 20 MARKS

Objectives:

This course deals with Urdu linguistics. An effort shall be made acquaint the students with various aspects of Urdu language, particularly those specified below:

UNIT-I

(i) انیسویں صدی میں سماجی وسیاسی بیداری (ii) پریم چنداور قومی اصلاحی تحریکات (برہموسماج، آریہ سماج، علی گڑھ تحریک)

(iii) پریم چند: حیات وشخصیت۔

UNIT-II

(i) پریم چند سے قبل اردو ناول (ii) پریم چند کی ناول نگاری

(iii) پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (بازار حسن، گئودان)

UNIT-III

(i) پریم چند سے قبل اردو افسانہ (ii) پریم چند کی افسانہ نگاری

(iii) پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ (نئی بیوی، نجات، کفن)

UNIT-IV

(i) پریم چند سے قبل اردو ڈرامہ (ii) پریم چند کی ڈرامہ نگاری

(iii) پریم چند سے قبل اردو خطوط نگاری (iv) پریم چند کے خطوط

(v) پریم چند کے مضامین

Books Prescribed: مجوزہ کتب برائے مطالعہ

۱) پریم چند قلم کا سپاہی، از امرت رائے ۲) پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، از قمر رئیس

۳) پریم چند کے مضامین، از قمر رئیس ۴) پریم چند کا فن، از شکیل الرحمٰن

۵) پریم چند۔ایک نقیب، از صغیر افراہیم ۶) پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، از صغیر افراہیم

۷) ترقی پسند تحریک اور اردو ناول، از ڈاکٹر ریاض احمد ۸) اردو ہندی افسانہ تعمیر، تشکیل اور تنقید، از ڈاکٹر سیما صغیر

۹) پریم چند۔حیاتِ نو، از مانک ٹالا ۱۰) پریم چند کے مختصر افسانے، از ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، علی گڑھ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

.....

NOTE FOR PAPER SETTER:

There are four units in the course No: URD-302

This Paper shall be devided in four Units viz Unit-I, Unit-II, Unit-III and Unit-IV. The Paper setter shall be set two question from each Unit, asking candidates to attempt one question from each Unit. The total number of questions to be attemted in this Paper shall be 4, which will carry equal marks. Unit wise distribution of marks shall be as Unit-I = 20, Unit-II = 20, Unit-III = 20, Unit-IV = 20. Total is 80.Distribution of Internal
Assessments shall be two home assignments = 10x2 =20.

فہرست مضامین

اکائی نمبر۱ : انیسویں صدی میں سماجی وسیاسی بیداری

اکائی نمبر۲ : پریم چنداور قومی اصلاحی تحریکات (برہموسماج آرسہ سماج،علی گڑھ تحریک)

اکائی نمبر۳ : پریم چند: حیات وشخصیت

اکائی نمبر۴ : پریم چند سے قبل اردو ناول

اکائی نمبر۵ : پریم چند کی ناول نگاری

اکائی نمبر۶ : پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (بازارحسن، گئودان)

اکائی نمبر۷ : پریم چند سے قبل اردو افسانہ

اکائی نمبر۸ : پریم چند کی افسانہ نگاری

اکائی نمبر۹ : پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ (نئ بیوی، نجات، کفن)

اکائی نمبر۱۰ : پریم چند سے قبل اردو ڈرامہ

اکائی نمبر۱۱ : پریم چند کی ڈرامہ نگاری

اکائی نمبر۱۲ : پریم چند سے قبل اردو خطوط نگاری

اکائی نمبر۱۳ : پریم چند کے خطوط

اکائی نمبر۱۴ : پریم چند کے مضامین

انیسوی صدی میں سماجی وسیاسی بیداری

سبق کی ساخت:

1.1 تمہید

1.2 مقاصد

1.3 انیسوی صدی میں سماجی وسیاسی بیداری کا آغاز

1.4 انیسوی صدی میں سماجی بیداری کی تحریک

1.5 انیسوی صدی کے کچھ اہم سماجی اصلاح

1.6 انیسوی صدی میں سیاسی بیداری کی تحریک

1.7 خلاصہ

1.8 فرہنگ

1.9 نمونہ امتحانی سوالات

1.10 سفارش کردہ کتابیں

1.1 تمہید

انیسوی صدی ہندوستان کے سماجی اور سیاسی تحریک کا صدی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں ہندوستان میں کئی تحریکیں چلائی گئی جنہوں نے ہندوستانیوں میں سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کا کام کیا۔ ان تحریکوں کا مقصد ہندوستانی سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنا اور ان میں تعلیمی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی سمجھ پیدہ کرنا تھا جس میں یہ تحریکیں کافی حد تک کامیاب رہی۔ ان تحریکوں کو چلانے والے سبھی رہنما عالم و فاضل تھے اور سماج پر اپنی پکڑ رکھتے تھے۔

ان رہنماؤں نے تنظیمیں قائم کراور اپنے تصنیفات کے ذریعہ پرے قوم میں سماجی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی ۔ جس کے نتیجے میں ہندوستان میں انیسوی صدی میں کئی سماجی اور سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر دیکھائی دے رہی ہیں جو اپنے سماجی اصلاح اور سیاسی بیداری کے میدان میں عمل درامد ہیں۔

1.2 مقصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ

انیسوی صدی میں ہندوستان کے سماجی بیداری سے واقف ہوجائینگے۔

انیسوی صدی میں ہندوستان کے سیاسی بیداری سے واقفیت حاصل کرلینگے۔

انیسوی صدی کے ہندوستان کے سماجی وسیاسی تحریکوں کے بارے میں جان جائینگے۔

انیسوی صدی کے ہندوستان کے سماجی وسیاسی رہنماؤں سے واقف ہوجائنگے ۔

1.3 انیسوی صدی میں سماجی وسیاسی بیداری کا آغاز

ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام جنوبی ہند میں ۱۷۴۰ء سے لے کر ۱۷۶۳ء کے مابین انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی اور مسلسل معرکہ آرائیوں میں انگریزوں کی کامیابی اور مشالی اور مشرقی ہند میں پلاسی اور بکسر کی فیصلہ کن جنگوں اور ۱۷۶۵ء میں مغل شہنشاہ شاہ عالم کے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی حقوق عطا کرنے کا کام سلطنت مغلیہ کی کمزوری اور ہندوستانیوں کی نا اتفاقی کی وجہ سے ہوئی۔اور دھیرے دھیرے برطانوی مقبوضات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں نئے عہد کا آغاز کب ہوا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں نئے دور کا آغاز سولہوی صدی سے ہوا جب سے بھگتی تحریک شروع ہوئی۔اس بھگتی تحریک نے روحانی اور سماجی مساوات کا

سبق پڑھایا۔اسی زمانے میں یوروپین تاجر اور پادری بھی ہندوستان آئے ۔اٹھارہوی صدی کے اواخر سے ہندوستان یوروپین طاقتوں کے برتر اور بالاتر فوجی نظام سے آشنا ہوا اور مغربی عقلیت پسندی اور سائنسی انداز فکر سے روشناس ہوا اور مغربی علوم وفنون کی اشاعت شروع ہوئی اور اس کی وجہ سے زبردست ذہنی یا فکری بیداری پیدہ ہوئی اور سماجی، مذہبی، معاشی اور سیاسی مسئلوں پر سائنٹفک انداز سے غور کیا جانے لگا اور ان کو عقلیت پسندی کے نقطۂ نگاہ سے جانچا جانے لگا۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب جسے عام طور پر انگریز محض غدر کے نام سے پکارتے ہیں ۔ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔حالانکہ بعد میں انگریز مورخین نے بھی اسے آزادی کا جنگ یا انگریزوں کے خلاف بغاوت کا نام دیا۔ یہ سچ ہے کہ اس بغاوت کا بہانہ وہ کارتوس بنا جسے استعمال کرنے سے ہندوں اور مسلمانوں نے انکار کیا تھا۔لیکن اس بغاوت کے پیچھے کی چنگاری نے ہندوستانیوں کے دلوں میں سماجی وسیاسی بیداری کی آگ بھر دی۔ اس جنگ کے بارے میں گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتا ہے کہ یہ غدر محض ایک ہنگامہ نہیں تھا بلکہ با قاعدہ ایک بغاوت تھی۔ایک عوامی سطح کی بغاوت جس میں ابتدا میں تو سپاہی شامل تھے لیکن بعد میں مزدور، کسان اور عوام بھی شامل ہوگئے۔اس کے برعکس اعلیٰ طبقہ جس میں امراء، زمیندار، ساہوکار اور تعلقدار شامل تھے انگریز کی طاقت کے سامنے سرخم کر لیے۔انگریزی حکومت نے بڑی شطرانہ چالیں چلیں اور ملک کے اس طبقے کو اپنے قبضے میں کرلیا۔جن سے مل کر عوام کے بغاوت کا سامنا کیا جاسکے۔ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں انگریزوں نے طبقاتی جنگ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے کے مخالف بھڑکانے کی کوشش کی جانے لگی۔نچلا طبقہ ہر اعتبار سے نظرانداز ہوتا گیا۔

لیکن زندگی کے ایسے حادثے اور ظلم وجبر عوام کو بیدار کردیا کرتے ہیں۔انگریزی حکومت اقتدار کے نشے میں یہ بھول گئی کہ عوام کے درمیان رخنہ ڈالے اور انتشار پھیلانے کے بجائے عوام کے دل میں اپنے لئے نفرت کا بیج بورہی ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ انھیں جگا بھی رہی ہے۔اعلیٰ طبقہ تو اپنی حفاظت و عافیت کی وجہ سے انگریزوں کی خوشامد اور وفاداری میں لگا رہا۔لیکن ایسے طبقوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔اصل اور زیادہ تعداد عوام، مزدور اور کسان کی تھی جو نمائندہ حیثیت کے مالک تھے۔اور انگریز انھیں نظرانداز کررہے تھے اور دبا رہے تھے جو انگریزوں کی بہت بڑی غفلت تھی۔اور انگریزوں کی یہی بھول اور غفلت ہندوستان میں تحریکوں کو جنم دیتی ہے۔

ہندوستانی سماجی معملوں اور مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات نے ہندوستانیوں میں قوم پرستی کے جذبے کو بیدار کیا اوراس کا گہرااثر ہندوستانی فلسفے، مذہب، تمدن، سیاست اور سماج پر پڑا۔انیسوی صدی کے وسط سے ایشیا میں سیاسی اور سماجی بیداری کا آغاز ہوا۔ڈکٹرسن یاٹ سن، جمال الدین افغانی، تلک، اروبندوگھوش، گوکھلے جیسے عظیم سیاسی رہنما اس صدی میں پیدہ ہوئے اور ہندوستان میں قوم پرستی کی جڑیں مضبوط کی۔ان کی رہنمائی میں سماجی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئی۔غیرملکی سیاسی غلبےاور اقتدار کے خلاف ہندوستان کی پرانی تہذیب نبرد آزما ہوئی اور ہندو مذہبی کتابوں کی تعبیر اور تشریح ہندوستانی قوم پرست فاضل انسانیت دوستی کے نقطۂ نگاہ سے کرنے لگے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کتابوں کی تعلیمات کس درجہ آفاقی اور عالم گیر ہیں۔انھوں نے یہ بات بھی ثابت کرنا چاہی کہ یوروپ کی سائنسی تصورات کی بنیاد ان میں ملتی ہے۔چونکہ برطانوی سامراج نے ہندوستانی حکمرانوں کوشکست فاش دے دی تھی اس لئے اس کے سیاسی نفوق اور برتری کے خلاف ردعمل کےطور پر روحانی اور مذہبی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور اس طرح سے اس زبردست صدمہ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی۔

انیسوی صدی میں اس قسم کے ہندو دانشوروں نے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں احیاء ہندویت کا زبردست جذبہ پیدا کیا اوراس کی وجہ سے جارحانہ ہندوقوم پرستی کوفروغ حاصل ہوا۔بعض ہندودانشوروں نے ہندوسماج کی سماجی اصلاح پر بہت زیادہ زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی اصلاح پر بھی۔انھوں نے تعلیم کے میدان میں بھی زبردست کام کیا۔اس سلسلے میں راناڈے، مہاتماہنسراج اور سوامی شردھانند کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ہنس راج کی قیادت میں شمالی ہندوستان کے بہت سے شہروں میں آریہ سماجیوں نے ڈی۔اے۔وی اسکول اور کالجوں کا جال بچھادیا۔سوامی شردھانند نے ہندقدیم کے انداز پر ہردوار کے قریب گروکل کا کانگڑی قائم کی۔

یوروپین فاضلوں اور عالموں نے قدیم سنسکرت لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا۔ ولکسن اور ایچ،ایچ ولس نے اہم سنسکرت کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شہرت حاصل کی۔میکس مولر، شوپن ہار اور دوسرے نامور یوروپین فاضل ہندو مذہبی فاضلوں نے ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی علون آثار قدیمہ یا اثریات اور ہندو دیومالا کا بھی گہرا مطالعہ کیا اوران فنون اور موضوعوں پر پرمغز اور معرکتہ الآرا کتابیں تصنیف کیں۔ان کتابوں کے مطالعے نے ہندوستانیوں میں خود اعتمادی کا زبردست جذبہ پیدہ کیا اور ہندو علماء اور فضلاء ان علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ان میں بھنڈارکر اور بال گنگادھر

تلک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۸۷۵ء میں تھوسافیکل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا خاص قصد ہندو فلسفے کا مطالعہ اور اس کی تشریح اور اشاعت کرنا تھا۔ اس سوسائٹی کے بانیوں میں میڈم بلا دلٹیکی اور ہنری الکاٹ تھے۔ اس سوسائٹی سے جو فاضل خاص طور سے متاثر ہوئے انھوں نے سائنٹفک انداز میں ہندو یوگ کے اصولوں کی تشریح اور تعبیر کی۔ ان میں مسز اینی بسنٹ سب سے زیادہ نمایا تھیں۔ وہ پرانوں کے فلسفے سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ وہ ہندومت کی پوری طرح سے قائل تھیں۔ ۱۹۱۳ء سے انھوں نے ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا اور ان کا شمار کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔

ہندومت کی حمایت اور دفاع کے لیے نامور ہندو دانشور سوامی وویکانند نے زبردست تحریک شروع کی۔ وہ سوامی رام کرشن کے چیلے تھے۔ سوامی رام کرشن نے بنگال میں روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لیے بہت کام کیا تھا۔ سوامی وویکانند اعلیٰ پائے کے مقرر تھے۔ وہ ویدانت اور یوروپین دونوں فلسفوں کے زبردست فاضل تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں منعقد عالمی مذہبی پارلیمنٹ میں شرکت کر کے ہندومت کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور ایک حد تک یورپ کے ملکوں میں روشناس کرایا۔ انھوں نے رام کرشن مشن کی زبردست تنظیم کی۔ مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قوم پرست تھے۔ وہ ہندوستانیوں میں خوداعتمادی اور بےخودی کا جذبہ پیدہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کے سالانہ جلسے کانگریس کے سالانہ جلسوں کے ساتھ کئی سال ہوتے رہے۔ اس کانفرنس کی وجہ سے سماجی اصلاح کی تحریک کو بہت زیادہ تقویت پہنچی۔

1.4 انیسوی صدی میں سماجی بیداری کی تحریک

انیسوی صدی میں ہندوستان میں کئی سماجی بیداری کی تحریکیں چلی جس نے سماج میں کئی بدلاؤ لائے۔ ان تحریکوں نے لوگوں کو علمی، ذہنی اور تہذیبی طور پر بیدار کیا۔ لوگوں کو اچھے اور برے میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور انہیں برائیوں کے جال سے باہر نکالا۔ اس سماجی بیداری کی تحریکوں نے عورتوں کے حالات میں کافی بدلاؤ لایا۔ عورتوں

کوکئی غیر ضروری اور دردناک رسموں سے نجات دلائی اوران کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے لئے مہم چلائی۔اس صدی میں ہندوستانی سماج اور سیاست میں کافی بدلاؤ دیکھائی دیتا ہے۔ان بدلاؤں میں جن تنظیموں نے اہم کردارادا کیااور سماجی و سیاسی بیداری پیدا کی ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

برہمن سماج۔ ہندو مذہب میں پہلی سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریک تھی۔ اس کے بانی راجارام موہن رائے تھے جونہایت ہی ایک دانشورانسان تھے۔راجارام ہوہن رائے کوعربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، لاطینی، یونانی اور ہبرو زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔راجارام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں برہمن سماج کی بنیاد ڈالی تھی۔جیسے دیوندرناتھ ٹیگور اور کیشو چندرسین نے آگے بڑھایا۔اس سماج کوقائم کرنے کا اہم مقصدایک خدا کی عبادت کرنا،لوگوں کو بوت پرستی سے روکنااور سبھی مذہب کے لوگوں میں آپسی بائی چارگی پیدا کرنا تھا۔ برہمن سماج کا پھیلاؤ اتر پردیش، مہاراشٹر، پنجاب، مدراس تک تھا۔اس سماج نے ہندوسماج کے اندر برائیوں اور غلط فہمیوں کودور کر کے سماجی بیداری لانے کی کوشش کی اور ستی کے رسم، مردوں کے ایک سے زیادہ شادی کرنے، طفل شادی، پردہ رسم جیسے غیر ضروری رسموں کے خلاف مہم چلائی اوران کی مخالفت کی، ساتھ ہی ساتھ عورتوں کی تعلیم اوران کی ترقی کے لئے اہم اقدام اٹھائے۔

آریاسماج۔ آریاسماج کی بنیاد بمبئی میں ۱۸۷۵ء میں دیانندسرسوتی کے ذریعہ رکھی گئی تھی۔آریاسماج خالص طور پر ویداور ویدیک روایتوں پر عقیدہ رکھتا تھا۔اس نے لوگوں کے بیچ "ویدوں کی طرف چلو" کا نعرہ دیا۔یہ بھی بت پرستی، یگ اور مذہبی کرم کانڈوں میں عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ آریاسماج نے بھی خدا کی عبادت کی بات کی۔آریاسماج نے ہندوسماجی اصلاح میں اہم کردارادا کیا۔جدید ہندوستان میں یہ پہلی سماجی تحریک تھی جس نے عورتوں اور شدروں کو وید پڑھنے اوراعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کےحق کی بات کی۔یہ ذات پات کے خلاف تھے۔اس تحریک نے سب سے زیادہ عورتوں کے سماجی اصلاح اور ترقی کے لئے کام کیا۔سماج میں لڑکا اورلڑکی کو برابر کے حق کی بات کی اور سبھی طرح کے سماجی برائیوں جیسے کہ جہز، پردہ رسم، ایک سے زیادہ شادیاں، طوائف کے کام کے خلاف زبردست تحریک چلائی اورسماج میں اس کے خلاف بیداری پیدا کی۔آریاسماج نے عورتوں کی اصلاح وبھلائی کے لیے زیادہ کام کیا۔

رام کرشن مشن۔ رام کرشن مشن کی بنیادرام کرشن پرمہنس نے کی تھی۔رام کرشن کو ہندوستانی نظریہ اور تہذیب میں عقیدہ تھا۔وہ سبھی مذہبوں کوسچا مانتے تھے۔ان کے مطابق رام، کرشن، عیسیٰ، خدا سب ایک ہیں۔وہ غریبوں کے

ہمدرد تھے وہ اس انسان کو مہاتما مانتے تھے جو غریب کے لئے جیتا ہے اور اس کے حق میں کام کرتا ہے۔ وہ انسانیت کی خدمت کو ہی اصل عبادت مانتے تھے۔ انہوں نے کسی سیاسی نظریہ کا اظہار نہیں کیا لیکن سماجی اصلاح کا کام عقیدت اور دل سے کیا۔

تھیوسوفیکل سبھا۔ اس سوسائٹی کی شروعات ان یوروپین دانشوروں کے ذریعہ کی گئی جو ہندوستانی تہذیب اور ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ ۱۸۷۵ء میں میڈم ایچ۔ پی۔ بلاوٹسکی نے اس کی بنیاد امریکہ میں ڈالی تھی۔ وہ ایک جرمن۔ روسی نسل کی عورت تھی۔ ہندوستان میں اس کا مرکز مدراس کے قریب اڈیار میں تھا۔ یہ ہندو سماج میں تعلیمی بیداری کی تحریک تھی۔

وہابی تحریک۔ وہابی تحریک دراصل اس تحریک کا نام ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب نے نجد میں چلائی۔ یہ ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو غیر ضروری اوہام اور غیر شرعی اعمال و رسوم پیدا ہو گئے ہیں انہیں ختم کر کے دین کو اپنی قدیم سادگی پر واپس لایا جائے اور دین پر مر مٹنے کی جو تمنا صحابہ کرام میں موجود تھی اسے پھر سے زندہ کر دیا جائے۔

علی گڑھ تحریک۔ انیسوی صدی کے مسلم سماج کے اصلاح میں سرسید احمد خاں کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ سر سید نے علی گڑھ تحریک کی شروعات کی۔ ۱۸۵۷ء کے بغاوت کے بعد انگریز مسلمانوں کے خلاف سخت کروائی کرنے لگے۔ انگریزوں کا ماننا تھا کہ اس بغاوت کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ تھا اور مسلمان اس بغاوت کے اہم سازش کردہ ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اس کے لیے سخت سے سخت سزا دینا چاہتے تھے۔ سرسید نے اس تحریک کے ذریعہ انگریزوں کے اس غلط فہمی کو دور کیا اور مسلمانوں میں علمی، سیاسی اور سماجی اصلاح کی تحریک چلائی۔ سرسید نے مسلمانوں کے اندر پھیلی سماجی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے تہذیب الاخلاق نام سے ایک رسالہ نکالا۔ سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی اور سائنس پڑھنے کی صلاح دی اور قران کو صحیح طریقے سے سمجھنے کی نصیحت دی۔ انہوں نے تفسیر القران بھی لکھا۔ مسلمانوں میں تعلیم کو لے کر بیداری پیدا کی اور ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مسلم اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی جو اب ایک مرکزی یونیورسٹی بن گئی ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

دیوبند تحریک۔ ۱۸۶۶ء میں قائم کی گئی دیوبند اسکول آگے چل کر مسلمانوں کا ایک سیاسی، سماجی اور تعلیمی

تحریک بن گیا۔اس کے لیڈران گانگریس کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کی لڑائی میں شریک ہوئے۔ یہ تحریک علی گڑھ تحریک کا مخالف تھا کیونکہ علی گڑھ تحریک انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بھلائی کرنے کی حمایتی تھی وہیں دیوبند انگریزوں کا مخالف تھا۔ وہ مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی اصلاح اور بیداری کی حمایت کرتے تھے لیکن وہ انگریزوں سے ملک کی آزادی اور قومی یکجہتی کے حمایتی تھے۔

پارسی اصلاحی تحریک ۔۱۸۵۱ء میں کچھ انگریزی تعلیم یافتہ پارسیوں نے رہنمائے مجد اینان سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد پارسیوں میں سماجی و مذہبی اصلاح کرنا تھا۔اس تحریک کے رہنما نوروجی فردوجی، دادا بھائی نوروجی اور آر۔کے۔قامہ تھے۔اپنے خیالات کو پرسی سماج تک پہچانے اوران میں سماجی و مذہبی بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک رسالا نکالا گیا جس کا نام ''راست گفتار'' تھا۔ اس تحریک کے ذریعہ پارسی عورتوں میں علمی اور تہذیبی بیداری پیدا کی گئی اوران کے حالات کو مزید بہتر بنایا گیا۔

1.5 انیسوی صدی کے کچھ اہم سماجی اصلاحات۔

انیسوی صدی میں سماجی اصلاح کی جو تحریکیں شروع ہوئی انہوں نے ہندوستانی سماج میں کئی اصلاح کی اور سماج میں رائج برائیوں کو ختم کیا۔ان میں سے کچھ ایسی اہم اصلاحیں رہیں جو ہندوستانی سماج پر گہرا چھاپ چھوڑ گئیں۔ ان اصلاحوں میں ستی رسم پر پابندی، لڑکیوں کو بچپن میں ہی مار دینا، طفل شادی پر پابندی، بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کرنے کا حق دینا، تعلیم نسواں، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کا رسم اور داس رسم کو ختم کرنے جیسی اصلاح کافی اہم ہیں۔

ستی رسم ۔ ستی جیسی رسم میں بیوی کو شوہر سے محبت اور وفاداری کے ثبوت کے طور پر شوہر کے مرنے کے بعد اس کے چتا پر زندہ جل جانا پڑتا تھا۔اس رسم میں یہ عقیدہ بھی ڈال دیا گیا تھا کہ ایسا کرنے سے بیوی کو جنت حاصل ہوتی ہے۔ یہ رسم انسانیت کے خلاف تھی جس پر مغل بادشاہ اکبر نے بھی پابندی لگائی لیکن یہ مکمل طور پر بند نہیں ہوئی۔انیسوی صدی میں راجا رام موہن رائے کی کوششوں اور اس کے خلاف مسلسل تحریکوں کے بعد انگریزی حکومت نے ۱۸۲۹ء میں اس پر قانون بنا کر پوری طرح پابندی لگائی۔

لڑکیوں کو بچپن میں مار دینے یا بچپن میں ہی شادی کر دینے کی رسم و رواج۔لڑکیوں کو بچپن میں ہی مار دینے کی رواج خاص طور پر بنگالیوں اور راجپوتوں میں رائج تھا۔ جہیز کی وجہ سے لڑکیوں کو معاشی بوجھ سمجھ کر ان کو بچپن میں ہی مختلف طرح کی تکلیفیں دے کر مار دینا کسی بھی سماج کے لیے شرم کی بات ہے۔ ہندوستانی دانشوروں نے اس رسم کی پر زور مخالفت کی اور اس پر انگریزی حکومت کے ذریعہ پابندی عائد کروائی۔اسی طرح بچپن میں شادی کر دینے کی رسم خوب رائج تھی جسے ۱۸۷۲ء میں قانون بنا کر پابندی عائد کر دی گئی۔

بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کرنے کا حق۔سماج میں خاص کر برہمنوں کے یہاں لڑکی کو شوہر کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بھلے ہی شوہر کا انتقال شادی کے دوسرے ہی دن کیوں نہ ہو گیا ہو اسے تا عمر تنہا زندگی گزارنی پڑتی تھی۔اس کو سماج کی کئی پابندیوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔اسے بدنظر مانا جاتا تھا اور اسے کسی بھی طرح کے جشن میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔اس رسم کے خلاف کئی دانشوروں نے آواز اٹھائی۔ خاص طور ایشور چندر ودیدھا ساغر کا نام آتا ہے جن کی کوششوں سے ۱۸۵۶ء میں قانون بنا کر بیوہ عورتوں کو شادی کرنے کا حق دیا گیا۔

تعلیم نسواں۔انیسوی صدی میں تعلیم نسواں کی حالت بے حد خراب تھی۔ ہندوؤں میں مذہبی نظریہ تھا کہ لڑکیوں یا عورتوں کو تعلیم دینے سے دیوتا ناراض ہو جاتے ہیں اس طرح ہندو سماج کی عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھا گیا تھا۔لیکن ۱۸۱۹ء میں کلکتہ میں انگریزی دانشوروں کے ذریعہ ترون نسواں سوسائٹی قائم کیا گئی اس کے ذریعہ ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں گرل اسکول کی بنیاد ڈالی گئی۔اس کے علاوہ چارلس ووڈ نے بھی تعلیم نسواں پر زور دیا۔اس کے علاوہ سبھی ہندوستانی سماجی ،مذہبی اور سیاسی تحریکوں نے تعلیم نسواں کے فروغ پر زور دیا۔

داس رسم۔ ہندوستان میں یونان یا امریکہ کی طرح داس رسم نہیں تھی۔لیکن بندھواں مزدور کی رسم تھی جس کو داس رسم کی طرح دیکھا گیا۔ ہندوستان میں ان کے ساتھ ان کے مالک اچھے اخلاق سے پیش آتے تھے۔ پھر بھی ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے داس رسم کو غیر قانونی قرار دے دیا اور ہندوستان میں اس رسم پر پوری طرح پابندی عائد کر دی گئی۔

1.6 انیسوی صدی میں سیاسی بیداری کی تحریکیں

انیسوی صدی کی تیسری دہائی سے انگریزی حکومت نے ہندوستان میں تعلیمی پالیسی کی بنیاڈالی ۔ یہ تعلیمی پالیسی رڈ میکالے جواس وقت انگریزی حکومت کا کانونی مشاور تھا کے سفارشات پر ڈالی گئی۔اس تعلیمی پالیسی کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں ایسی نسل پیدا کی جائے جو جسمانی طور پر ہندوستانی دیکھائی دے لیکن ذہنی طور پر وہ انگریز ہو۔ یہ سرکاری دفتروں میں کلرک کی جگہوں پر کام کرے اور انگریزی یا مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کرتی رہے۔ وڈ ڈیسپیچ کے شفارس پر ۱۸۵۷ء میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت اور ترویج کے لیے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستان میں جدید ذہنی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اوران اداروں سے بڑے بڑے دانشور تعلیم حاصل کر کے نکلے۔جنھوں نے سماجی، سیاسی، ادبی، تعلیمی، مذہبی اصلاحی اور معاشیات میں شہرت حاصل کی۔ ان میں دادا بھائی نوروجی، بھنڈارکر، بدرالدین طیب جی، جسٹس سید محمود، فیروز شاہ مہتہ، راناڈے، رمیش چندر دت، جسٹس امیر علی، بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، سریندناتھ ٹیگور، سوامی وویکانند، جگدیش چندر بوس اور پی سی رے کا نام قابل ذکر ہیں۔

مہاراشٹر کی سماجی اور ذہنی بے چینی نے نئی الجھنوں اور سوسائٹیوں کو جنم دیا۔راناڈے نے ستیہ سودھک سماج کی بنیاد ڈالی جس کا خاص مقصد مرہٹوں میں سماجی اصلاح کرنا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں بمبئی میں کیشپ چندر سین نے پرارتھنا سماج قائم کی۔راناڈے اور چندر دا کر اس کے خاص رہنماؤں میں تھے۔ یہ انجمن خالص سماجی اصلاح کے لیے قائم کی گئی تھی اسے مذہبی مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس نے بیوہ عورتوں کی شادی، مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کرنے اور ساتھ کھانا کھانے پر زور دیا۔

بھنڈارکر نے سنسکرت کے زبردست عالم اور نامور فاضل کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی۔انھیں بھی سماجی اصلاح سے بہت زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن مہاراشٹر میں سماجی اصلاح اور تجدد کی تحریک کی علمبرداری مہادیو گوند راناڈے کے حصے میں آئی۔انھوں نے سماجی کانفرنس قائم کی۔

انیسوی صدی کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندوستانی قوم پرستوں نے یہ مطالبہ پیش کرنا شروع کیا کہ ہندوستانیوں کو اہم سرکاری ملازمتیں دی جائیں۔ اپنے اس مطالبے کی تائید میں انھوں نے ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کو پیش کیا جس میں صاف طور سے کہا گیا تھا کہ ساری نوکریاں اور عہدے بلا تخصیص وامتیاز و

تفریق مذہب و رنگ و ملت ،جنس و ذات ہندوستانیوں کو حاصل ہوں گی۔ اس کے ساتھ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے اس تاریخی اعلان کو بھی پیش کیا جس میں غیر مبہم لفظوں میں اس کا اعلان کیا گیا تھا کہ برطانوی رعایا کے جملہ افراد قانون کے روبرو مساوی ہیں۔ اور سرکاری ملازمتیں قابلیت کی بنیاد پر ہندوستانیوں کو ملا کریں گی۔ اور اس بارے میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ برتا جائے گا۔ لیکن لارڈ ولٹن اور لارڈ کرزن کی جابرانہ مستبداور ہندوستانی مخالف پالیسیوں نے رنگ اور نسل کی بنیاد پر ہندوستانیوں سے امتیازی سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے انیسوی صدی کے آخر اور بیسوی کے اوائل میں کانگریس کی طرف سے ہندوستان میں نیا بتی اداروں کے قائم کیے جانے کا مطالبہ پیش کیا جانے لگا تا کہ ہندوستانیوں کی آواز برطانوی حکومت تک ان کے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعے پہنچے۔ راجہ رام موہن رائے ، دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشن گوکھلے کے سیاسی نظریے بڑی حد تک برطانوی سیاسی نظریوں کا چربہ تھے اور یہ لوگ برطانوی سیاسی اداروں کے بہت زیادہ قائل تھے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہندوستان قوم پرستی اور ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس کے قائم کرنے کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی ایک ایسی سیاسی جماعت قائم کی جائے جو ملک کے حکومتی انتظام اور سیاسی معاملوں کے بارے میں ہندوستانیوں کے خیالات اور خواہشات حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اپنے قیام کے ابتدائی دور میں کانگریس محض ایک بحث ومباحثہ کرنے والی جماعت تھی اس کے جلسوں میں جو تقریریں ہوتی تھیں وہ اس زمانے کے برطانوی لبرل رہنماؤں کی تقریروں کے انداز میں کی جاتی تھیں۔ سردار جنک سبھا مہاراشٹر کی سب سے اہم سیاسی جماعت تھی۔ ۱۸۷۲ء میں اس نے اپنے نمائندے کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا جو ہندوستانی مسئلوں کے بارے میں پارلیمنٹری کمیٹی سے گفت وشنید کرے گو اس فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ ۷۹۔۱۸۷۸ء کے زبردست قحط میں اس نے قحط کے مارے ہوئے مصیبت زدوں کی زبردست مدد کی۔ ۱۹۰۵ء کی ہندوستان گیر سودیشی تحریک کے شروع ہونے سے بہت پہلے یہ مہاراشٹر میں سودیشی چیزوں کے استعمال کی تحریک شروع کر چکی تھی۔ ویشنو کرشن چپلونکر اور بنکم چندر چٹرجی نے اپنی تحریروں اور تصنیفوں کے ذریعہ ہندو قوم پرستی کو بہت زیادہ تقویت پہنچائی۔ چٹرجی بنگال میں علمی تحریک کے علم بردار تھے۔ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے اپنا مشہور ناول آنند مٹھ تصنیف کیا جو ۱۷۵۷ء کی سیاسی بغاوت کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ انھوں نے ہندو بنگالیوں میں جارحانہ ہندو قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا۔

برطانوی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا ہندوستان کے سماجی حالات پر زبردست اثر پڑا۔اب قانون بنانے والی جماعتوں نے بتدریج ایسے قانون پاس کیے کہ جن سے ہندوعورتوں کی سماجی پوزیشن پہلے سے زیادہ بہتر ہوئی۔ شادی بیاہ کے رسوم اور رواج میں مفید اصلاحیں کی گئیں۔کیشپ چندرسین،سوامی دیانندسرسوتی،مہادیوگوندراناڈے،مالا باری اور تیلانگ جیسے سماجی مصلحوں نے ان اصلاحوں کا مطالبہ کیا۔ان سماجی اصلاحوں کے بارے میں برطانوی حکومت کا رویہ عدم مخالفت کا تھا۔وہ ہندوستانیوں کے رسم ورواج میں مداخلت کرنا ناپسند کرتی تھی اور نہ وہ ملک کا سماجی نظام بدلنا چاہتی تھی۔اس لیے کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں سماجی اصلاح آگے چل کر سیاسی رنگ نہ اختیار کرے جو بالاآخر اس کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے۔اس عدم مداخلت کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت اپنا سیاسی غلبہ ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتی تھی اور زیادہ سے زیادہ معاشی فائدے حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ہندوستان کے دانشور جنھوں نے ہندجدید کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مغربی سیاسی فلسفے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ان میں انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں شامل تھے۔سریند ناتھ بنرجی، لالہ لاجپت رائے اور وی۔ڈی ساورکر نے اس اطالوی رہنما کے حالات زندگی انگریزی،اردو اور مرہٹی زبان میں لکھے۔برک،گلیڈسٹن، کاٹڈن، جان برائٹ، جان اسٹورٹ مل، ہربرٹ اسپینسر کے سیاسی نظریوں سے ہندوستانی سیاسی نظریوں سے ہندوستانی سیاسی رہنماؤں نے بہت زیادہ خوشہ چینی کی۔گاندھی جی، ٹالسٹائے، رکسن اور تھوریو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ برگسان، ہیگل اور نیٹشے کے فلسفے نے اربندوگھوش اور اقبال کو متاثر کیا۔کارل مارکس،لینن، اسٹالن، مسولینی اور ہٹلر نے ہندوستانی کمیونسٹوں،سوشلسٹوں اور دوسرے انقلابیوں کو متاثر کیا۔اس طرح فرانسیسی،امریکن اور روسی انقلاب کے نظریوں نے بھی ہندوستانی مفکروں کو خاصا متاثر کیا۔

ویشنوکرشن چپلونکر مرہٹی کے نامور ادیب تھے۔انھیں مرہٹی زبان اور ادب کا شواجی کہا جاتا ہے۔انھوں نے مہادیوگووندراناڈے اور سوامی دیانندکی تحریکوں کی بڑی شدومد سے مخالفت کی۔وہ انگریزی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزی تعلیم شیرنی کے دودھ کے مانند ہے۔کیونکہ اس کے حاصل کرنے سے قومی تنومندی اور آزادی کے جذبے پیدا ہوتے ہیں۔لیکن وہ مغربی کی اندھی تقلید کے شدید مخالف تھے۔وہ مہاراشٹر کی قدیم روایتوں، اداروں اور ثقافت کے زبردست حامی تھے۔ ۱۸۸۰ء میں انھوں نے تلک کے ساتھ ایک نیوانگلش اسکول قائم کیا اور اس کے ہیڈ

ماسٹر بھی ہو گئے ۔ وہ عوام میں تعلیم پھیلانا چاہتے تھے ۔ اس کے لیے انھوں نے کیسری اور مرہٹہ اخباروں کے نکالنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان دونوں اخباروں کی اشاعت کے لیے آریہ بھوشن پریس کے نام سے ایک پریس کھولا ۔

ہندی زبان اور ادب کا ہندو قوم پرستی کو فروغ دینے میں بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اس سلسلے میں للو لال ساگر، راجہ شو پرشاد اور سوامی دیانند کی تصانیف خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ مقبولیت سوامی دیانند کی کتاب ستیارتھ پرکاش کو حاصل ہوئی ۔ اس کے ذریعے انھوں نے آریہ سماج تحریک کے بنیادی اصول پیش کئے ۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں مغربی سیاسی ادارے قائم کیے ان میں گورنر جنرل اور گونروں کی ایگزیکیٹو کونسلیں ، گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر قانون ، قانونی کمیشن اور سپریم کونسل قابل ذکر ہیں ۔ ان اداروں کے قیام سے بھی ہندوستانی قوم پرستی کو تقویت پہنچی ۔

1.7 خلاصہ

انیسوی صدی کے سماجی اور سیاسی بیداری نے ہندوستانیوں میں ایک نئی جان ڈال دی اور ان میں خود اعتمادی کو بڑھا دیا۔ ہندوستانیوں میں سماجی و سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے کئی تحریکیں چلیں ۔ ان تحریکوں نے ہندوستانی سماج میں رائج قدیم دور سے چلی آ رہی غیر ضروی رسم و رواج جو انسانیت کے خلاف تھے کو ختم کر دیا۔ ان تحریکوں نے ہندوستانیوں کے اند سیاسی شعور پیدا کیا اور ہندوستانی اپنے ملک اور اپنے سیاسی حقوق کے کئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ہندوستانیوں کے اندر ایک نئی سیاسی نظریہ و فکر پیدا ہوا۔ اس بیداری سے سماج میں آپسی محبت اور بھائی چارگی کا بھی فروغ ہوا۔ اور سبھی ہندوستانی ذات پات ، مذہب سے باہر نکل انگریزوں کے خلاف متحد ہونے لگے۔ اور آزادی کی مانگ زور پکڑنے لگی ۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انیسوی صدی کے سماجی اور سیاسی بیداری نے نہ صرف سماج اور سیاست کا رخ بدلہ بلکہ ادب کا بھی روخ بدل ڈالا ۔

1.8 فرہنگ

متحد	اتحاد، ملا ہوا	تقویت	مضبوط کرنا، طاقت دینا
تفریق	جدا کرنا، فرق ڈالنا	مستبدا	خودمختار، اکیلے کام کرنے والا
مبہم	گول مول بات	مساوی	برابر، یکساں
مداخلت	دخل دینا، بیچ میں بولنا	اشاعت	شائع کرنا

1.9 نمونہ امتحانی والات

۱۔ انیسوی صدی میں سماجی وسیاسی بیداری پر ایک نوٹ لکھے؟

۲۔ انیسوی صدی کے اہم سماجی تحریکوں کے بارے میں لکھے؟

۳۔ انیسوی صدی میں ہندوستان میں سیاسی بیداری کے بارے میں لکھے؟

۴۔ انیسوی صدی کے وہم سماجی رسوں کو بیان کرے؟

1.10 حوالہ ذات وشفارسی کتابیں

اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک) صالحہ زریں

جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (صفحہ ۸۔۸۱)

اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ۔ نگینہ جبیں

سیاسی تاریخ ہند، جلد اول۔ میجر جنرل سرجان میلکم

پریم چنداور قومی اصلاحی تحریک (برہمن سماج، آریا سماج اور علی گڑھ تحریک)

سبق کی ساخت:

2.1 تمہید

2.2 مقاصد

2.3 پریم چنداور قومی تحریکے

2.4 برہمن سماج

2.5 آریا سماج

2.6 علی گڑھ تحریک

2.7 خلاصہ

2.8 فرہنگ

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

2.10 سفارش کردہ کتابیں

2.1 تمہید

پریم چند کے دور سے قبل ہندوستان میں کئی قومی تحریکے وجود میں آ چکی تھی جو ہندوستان میں مختلف سطح پر قومی اصلاحی کام کو انجام دے رہی تھیں۔ ان کے قائم کرنے والے الگ الگ فکر اور نظریہ مالک تھے۔ یہ تحریکیں ملک کے مختلف جگہوں سے الگ الگ ناموں سے چلائی جارہی تھی۔ ان تحریکوں میں راجارام موہن رائے کا برہمن سماج، سوامی

دیانند سرسوتی کا آریا سماج، سرسید احمد خاں کا علی گڑھ تحریک کافی اہم اور مشہور و معروف ہیں۔ان تحریکوں نے ہندوستانی قوم میں سماجی، مذہبی، تہذیبی اصلاح اور ترقی کی پرزور کوششیں کی۔ان میں کچھ تحریکے پریم چند کے ادبی زندگی میں قدم رکھنے سے قبل وجود میں آچکی تھیں اور کچھ ان کے دور میں بھی وجود میں آئیں۔ برہمن سماج، آریا سماج اور علی گڑھ تحریک پریم چند سے قبل وجود میں آچکی تھی۔ یہ سبھی تحریکے اپنے سطح پر سماج کے اندر پھیلی برائیوں، ظلموں اور ناانصافیوں کے خلاف آوازیں اٹھائیں اور سماج وقوم میں اصلاح لانے کی کوشش کیں۔ یہ تحریکے پورے ہندوستان میں اپنے اثرات چھوڑے۔ان تحریکوں کے اثرات پریم چند کی زندگی پر بھی پڑا اور ان کی ذاتی زندگی اور ادبی زندگی میں ان تحریکوں کے گہرے اثرات صاف صاف دیکھائی دیتے ہیں۔

2.2 مقاصد

اس سبق کے بعد آپ

- پریم چند کے دور سے آشنا ہو جائیں گے
- پریم چند کے دور قومی تحریک سے واقف ہو جائیں گے
- برہمن سماج کے تحریک سے واقفیت حاصل کرلیں گے
- آریا سماج کے اصلاحی تحریک سے آشنا ہو جائیں گے
- علی گڑھ تحریک سے واقف ہو جائیں گے

2.3 پریم چند اور قومی تحریکیں

پریم چند دنیا میں اردو اور ہندی ادب کے عظیم فنکار ہیں۔ پریم چند جس زمانے میں اپنی آنکھ اس دنیا میں کھولی اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔انگریزوں کے زیر سرپرستی ہندوستانی زمینداروں، امراء، نوابوں

اور راجاؤں نے ملک کے غریب، مزدور اور کمزور طبقہ کا استحصال کر رہے تھے۔ غریبوں اور کمزور طبقہ کا خبر لینے والا کوئی نہیں تھا۔ سماج امیری اور غریبی کے دو خانوں میں تقسیم تھا۔ امیری اور غریبی کے بیچ ایک گہری کھائی صاف صاف دیکھائی دے رہی تھی۔ ایک طرف جہاں بڑے زمیندار اور امراء کی زندگی عیش وعشرت کے ماحول میں گزر رہی تھی تو دوسری طرف غریب، مزدور اور کسان بھوک اور بے بسی کا عالم میں اپنی زندگی گزارنے کو بے بس تھے۔ انسانیت دم توڑ رہا تھا۔ پورے نظام کو انگریزوں نے اپنے چنگل میں اس طرح جکڑ لیے تھے کہ ہندوستانی سماج، ہندوستانیوں معاشی حالات، ہندوستانی تہذیب وتمدن مٹتی ہوئی دیکھائی دے رہی تھی۔ ہر طرف مفلسی اور بے بسی کا عالم تھا۔ انگریزوں کا ظلم وستم روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ پرانی غیر واجب روایتے سماج کو جکڑے ہوئی تھی۔ پورا ملک بے چینی اور بے اطمینانی کے آگ میں جھلس رہا تھا۔ ان سماجی اور سیاسی حلاتوں نے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں، دانشوروں، مذہبی لیڈروں، ادیبوں اور قوم پرستوں کو اندر سے جھنک جھور کر رکھ دیا۔ وقت اور حالات نے ان سماجی و مذہبی لیڈران، دانشوروں اور قوم پرستوں کو اپنے قوم وسماج کے اصلاحی کام کرنے اور زمینداروں اور امیروں کے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں حالات نے ہندوستان میں مختلف طرح کے تحریکے شروع کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ملک کے الگ الگ حصوں میں کئی تحریکے شروع ہوئی اور ان تحریکوں کے ذریعہ سماج میں سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی بیداری لانے کی کوشش کی گئی۔ ان تحریکوں میں راجا رام موہن رائے کی برہمن سماج، سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج اور سر سید احمد کی علی گڑھ تحریک کافی اہم ہے۔ ان تحریکوں اور تنظیموں نے سماج الگ الگ قوموں اور حصوں میں اصلاح و بہبود اور تعلیمی، معاشری بیداری کا کام کیا۔ ان تحریکوں نے اس وقت کے ادیبوں کو بھی متاثر کیا اور ہندوستان کے ہر زبان کے ادیب اپنے تخلیق کے ذریعہ ان اصلاحی تحریکوں سے منسلک ہو گئے اور اپنے انداز میں سماج میں بیداری اور انقلاب لانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس وقت اردو زبان میں لکھنے والے ادبا اور شعرا بھی ان تحریکوں سے اچھوتے نہیں رہے۔ ان ادیبوں نے بھی سماجی بیداری اور انگریزی حکومت کے خلاف قلم اٹھائے جن میں کرشن چند، پریم چند، بیدی وغیرہ کافی مشہور ہے۔ پریم چند ایک ایسے ادیب ہیں جنہوں نہ صرف اردو زبان میں مضامین لکھے بلکہ وہ ہندی زبان میں بھی کئی مضامین لکھے اور دونوں زبانوں میں انہیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ افسانہ کے ساتھ ساتھ کئی ناولیں بھی لکھی۔ پریم چند ترقی پسند تحریک کے اہم رکن تھے اور ایک حقیقت پسند خیال کے مالک تھے۔ پریم چند کے دور

سے پہلے ہندوستان میں کئی سماجی، سیاسی ، مذہبی اورقومی اصلاحی تحریکے اور کئی تنظیمیں وجود میں آ چکی تھی جن کا اثر ہندوستانی سماج پر بہت ہی گہرہ پڑا تھا۔ ان مختلف سماجی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی تحریکوں سے بھی پریم چند کافی متاثر تھے۔ اسکی جھلک ان کے تخلیقی کارناموں میں صاف صاف نظر آتی ہے۔

2.4 برہمن سماج

برہمن سماج جدید پچھمی تہذیب ونظریہ سے متاثر ہندو مذہب کا پہلا اصلاحی تحریک تھا۔ برہمن سماج کی بنیا دراجارام موہن رائے نے ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں ڈالی تھی۔ راجارام موہن رائے ایک بہت ہی دانشورانسان تھے۔وہ کئی زبانوں جیسے عربی، فارسی، سنسکرت، بنگلا کے ساتھ ساتھ انگریزی، لاطینی، یونانی اور ہبرو ایک جیسا مہارت رکھتے تھے۔ انہیں ترقی پسند نظریہ کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب اور سماج کے اصلاح کے بہت بڑے پیروکار مانا جاتا ہے۔ راجارام موہن رائے نے بنگال میں ہندوں کے اندر مذہبی اور سماجی اصلاح کرنے کے لئے برہمن سماج کی بنیاد ڈالی۔ وقت کے ساتھ برہمن سماج کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ بہت ہی کم وقت میں برہمن سماج پرے ملک میں تیزی سے پھیل گیا اور ایک تحریک کی شکل اختیار کرلیا۔ راجارام موہن رائے نے برہمن سماج تحریک کے ذریعے ہندوستان کے ہندوسماج کے قدیم اور تنگ نظری رسم ورواج اور قائدے قانون پر گہرا طنز کیا اور اس کے خلاف احتجاجی مہم کا آغاز کیا۔ ہندوسماج کی برائیاں جیسے جیسے ذات پات، لڑکا اور لڑکیوں کے شادی میں عمر کا زیادہ فرق کا ہونا، بیوہ عورتوں کا دوبارہ شادی کا نہ ہونے دینا، لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھنا، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی رواج، طوائف بازی، فرقہ وانہ سوچ اور لڑکیوں کو بچپن میں ہی شادی کردینے کا رسم جو اس وقت عام تھا وغیرہ کی مخالفت کی۔

برہمن سماج نے ہندوسماج میں عورتوں کے بدتر حالات کے خلاف آواز اٹھانے اور ان کا حقوق دلانے کے لئے ملک بھر میں زبردست تحریک چلائی۔ عورتوں کے ستی ہونے جیسے خوفناک رواج پر زبردست مورچا کھولا۔ ستی روایت میں عورتوں کو اپنے شوہر کے فوت کے بعد آخری رسم یعنی چتا پر زندہ لیٹنا ہوتا تھا اور زندہ جل جانا ہوتا تھا۔ ایسا کرنے سے انھیں نجات ملتی تھی۔ یہ شادی شدہ عورتوں کے لئے ایک خوفناک اور بے حد دردناک مذہبی رسم تھا۔ جس

سے سماج بہت جلد نجات چاہتا تھا۔ راجا رام موہن رائے کی نظر اس خوفناک اور دردناک روایت پر پڑی۔ اور انہوں نے اس رسم کے خلاف برہمن سماج کے زیر تلے زبردست مہم چلایا۔ ان کی پرزور تحریک نے وجہ سے انگریزوں کی نظر اس خوفناک برائی کے طرف گیا اور انگریزوں کے ذریعہ ۱۸۲۹ء میں اس رسم کے خلاف قانون بنا کر اس کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ ہندو سماج میں عورتوں کے ساتھ ناانصافی یہی ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت ہندو مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کا چلن تھا۔ یہ مرد حضرات ادھیڑ عمر میں جوان اور کم عمر کی لڑکیوں سے شادی کرتے تھے اور کچھ ہی دنوں میں انہیں بیوہ بنا کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے تھے۔ اور ہندو مذہب کے مطابق ان بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ انہیں کئی طرح کی پابندیوں اور ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان بیوہ عورتوں پر سماج نے طرح طرح کی پابندیاں عائد کی ہوئی تھی۔ یہ عورتیں کسی بھی نیک اور خوشی کے جشن یا تقریب میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ ان کے رہن سہن اور روزانہ کی زندگی پر بھی بہت سخت پابندیاں عائد تھی۔ ذلت کی زندگی گزارنے پر انہیں مجبور کیا جاتا تھا۔ ان کی زندگی ایک طرح سے جہنم بنا دیا گیا تھا۔

راجا رام موہن رائے نے عورتوں پر ہو رہے ظلموں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی بیڑا اٹھایا اور برہم سماج کے ذریعہ ان برائیوں کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ مظلوم اور لاچار عورتوں کے ساتھ مضبوطی سے کھڑے ہو کر سماج میں ہو رہے ان پر مختلف طرح زیادتیوں سے نجات دلایا۔ کم عمری یعنی بچپن کی شادی پر روک لگوایا۔ بیوہ عورتوں کا دوبارہ شادی کرنے کی آزادی ملی۔ عورتوں کو گھر کے دولت میں حصہ داری اور حق دلوایا۔ ابھی تک عورتوں کو گھر کے دولت میں کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ برہم سماج کے ذریعہ ہندو سماج کے اندر پھیلے برائیوں کے خلاف چلائی گئی تحریک پرے ہندوستان کے ہندو سماج میں بیداری پیدہ کی اور عورتوں کے خلاف ہو رہے ظلموں اور ناانصافیوں پر روک لگی۔

ہندوستان میں غریبوں، مزدوروں اور عورتوں کے ساتھ ہو رہے سماج میں ناانصافی اور ظلم وستم کے طرف پریم چند کی پینی نظر تھی۔ سماج کے ان سبھی حالات اور واقعات نے پریم چند کے سوچ اور نظریہ پر بہت گہرہ اثر ڈالا۔ پریم چند نے غریبوں، مزدوروں اور عورتوں کے ساتھ سماج میں ہو رہے ناانصافیوں کو اپنی تخلیق کا موضوع بنا دیا۔ ڈاکٹر نریش لکھتے ہیں ۔

"پتی کو پرمیشور کا درجہ دے کر ہندو سماج نے جس عورت کو گھر کی داسی اور مرد
کے بستر کی رونک بنا دیا تھا اور ستی ہونے پر مجبور کر رکھا تھا۔ پریم چند نے اسی

عورت کے لئے شوہر کے مرنے کے بعد جینے کا حق مانگا"

(ماہنامہ پردازادب۔نومبر،۱۹۸۰ء۔ص۔۴۵)

انہوں نے آہ بیکس، بیٹی کا دھن، نوک جھونک، معصوم بچہ، ابھاگن، بدنسیب ماں وغیرہ جیسے افسانوں اور ہم خرماوہم ثواب، روٹھی رانی، بیوہ، نرملا، غبن جیسے ناولوں میں ایک سے زیادہ بی بی رکھنے پر اعتراج جتایا۔ اور بیواؤں کے ساتھ ہوے والے ناانصافیوں اوران کے نفسیاتی اور جذباتی پہلوں کو منظر عام پر لایا۔اور قارئین کا توضع اس طرف مرکوز کیا۔ وہ اپنے ناول بیوہ میں کملا پرشاد کی زبانی کہتے ہیں۔

"اگر کسی ناگہانی حادسے یہ مکان گر پڑے تو ہم کل سے اسے پھر سے بنانا شروع کر دینگے مگر جب کسی عورت کی زندگی پر کوئی ناگپانی آفت پڑ جاتی ہے تو اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس نام کو روتی رہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے"۔

(بیوہ، پریم چند۔ص۔۱۳۵)

پریم چند نے نہ صرف بیواؤں کے حالات و مسائل کو دیکھا ور سمجھا بلکہ اسے اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنا کر سماج کی کڑوی حقیقت کو سماج کے سامنے پر اثر طریقے لایا تا کہ سماج کی نظران بے بس اور لا چار اور مجبور عورتوں کے طرف جائے اوران کو انصاف ملے سکے۔ پریم چند نے غبن میں رتن اور نرملا میں رکمینی جیسے کردار کو پیش کر بیوہ عورتوں کے حالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بیوہ ہو جانے کے بعد عورتوں سے ان کے حقوق چھین لئے جاتے ہیں اور انہیں بے بس اور لا چار بنا دیا جاتا ہے۔

2.5 آریہ سماج

ہندوستان کے ہندوں سماج میں سماجی اور مذہبی اصلاح کے میدان میں برہم سماج کے بعد جو دوسرا بڑا تحریک دیکھائی دیتا ہے، وہ ہے آریہ سماج تحریک۔آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں ڈالا۔اس

تنظیم کے بنیاد کا اہم مقصد ہندوستان میں دوبارہ پھر سے قدیم ویدک مذہب کو قائم ودائم کرنا تھا۔آریا سماج کی بنیاد جب ڈالی گئی تھی اس وقت اس کی کارگردگی محدود تھی ۔شروعاتی دنوں اس تحریک کا مقصد صرف سناتن مذہب کا تبلیغ اور ویدک تعلیم کا فروغ تھا۔جس کے ذریعے وہ ہندوسماج کا سدّھی کرن کرنا چاہتے تھے۔آریہ سماج ہندوؤں کو ویدک مذہب کے طرف روجوع کرانا چاہتا تھا۔اس کے لئے سوامی دیانند سرسوتی نے ہندوؤں کو "ویدطرف لوٹو" جیسا نارا دیا،اور ہندوؤں کو وید کے طرف لوٹنے کی گزارش کی۔اس کے عقیدت مند ہندو مذہب کے بنیادی اصولوں کو ماننے اور اس پر عمل کرنے پر عقیدہ رکھتے تھے۔دیانند سرسوتی کا خیال تھا کہ ہندوستان کو مذہبی،سماجی اور قومی طور پر ایک جا کر دیا جائے۔ سوامی جی کا ماننا تھا کہ آریہ مذہب ہی ہندوستان کا مذہب بنے۔اس لئے سوامی جی ہندو مذہب اور ہندوسماج کے اندر اصلاح کرنا چاہتے تھے۔آریہ سماج بت پرستی کو غیر مذہبی عمل کرار دیا اور سوامی دیانند سرسوتی نے ہندوؤں سے بت پرستی چھوڑنے کی گزارش کی۔آریا سماج کا دائرہ دھیرے دھیرے بڑھتا گیا اور اس کے ماننے والوں کی تعداد ہندوسماج میں روز بروز بڑھتا رہا۔آریا ہندوسماج کے اندر پھیلے برائیوں کے خلاف مسلسل آواز بلند کرنے لگا۔ ہندوسماج یا قوم کے اندر پھیلی مختلف قسم کی برائیوں جیسے لڑکیوں کو قتل کر دینا، بیواؤں کے ساتھ ظلم و نا انصافی کرنا،کم عمری میں بیوہ ہو جانے پر شادی کی اجازت نہ دینا،عورتوں پر طرح طرح کا بندیاں لگانا اور رسم ورواج کے نام پر ان کے عزت ووقار کے ساتھ کھیلنا ، جانوروں کی بلی دینا،مختلف طرح دیویاؤ کا پوجا کرنا،تنتر منتر کرنا وغیرہ کے خلاف آریہ سماج نے ملک کے مختلف حصوں میں زبردست تحریک چلائی اور ان برائیوں کو سماج سے ختم کرنے کی جدوجہد کی۔آریہ سماجی وید کو پاک کتاب مانتے تھے اور اس کا پڑھنا اور سننا ثواب مانتے تھے۔آریا سماج گئو رکچھا اور ہندوؤں کی شدّھی کرن پر بہت زور دیتا تھا۔اور لوگوں کو اس کے لئے آمادہ کرتے تھے۔

آریہ سماج کا کام سب سے زیادہ تعلیم ،سماجی اصلاح اور سماج کے کمزور طبقہ کے خدمت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ آریہ سماج کا سماجی نظریہ انسانی دوستی،مرد اور عورت میں برابری حق ،سچائی وایمانداری،انصاف پسندی،غیر جانبداری اور محبت کا پیغام دینا تھا۔آریہ سماج نے تعلیم کے پھیلاؤ پر بہت زور دیا اور زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے کھولے جہاں قدیم ویدک تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم روایتی طریقے سے دی جاتی تھی۔ان اداروں میں طلبا کو جسمانی،روحانی اور سماجی،تہذیبی تعلیم فراہم کی جاتی تھی۔ان طلبا کی ترقی اور فروغ ہندو تہذیب وتمدن کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

سوامی دیانند سرسوتی خود ذاتی طور پر برہمن سماج اور راجا رام موہن رائے سے کافی متاثر تھے۔ برہمن سماج کے ذریعہ چلائے گئے سماجی و مذہبی اصلاحی تحریک کا اثر بھی ان پر کافی تھا۔اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں تحریکوں کے مقاصد میں یکسانیت بھی نظر آتی ہے۔ دونوں ہندو سماج میں پھیلے برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ دونوں کے مذہب بھی ایک ہیں حالانکہ گہرائی سے دونوں کے بارے میں مطالعہ کرنے پر دونوں کے مذہبی عقیدے اور نظریے میں فرق تھوڑا دیکھائی دیتا ہے۔آریہ سماج جہاں مذہبی شدّت پسند نظر آتا ہے وہی برہمہ سماج کا مذہبی نظریہ وسیع اور لچیلا دیکھائی دیتا ہے۔آریہ سماج وید کو واحد الہامی کیاب مانتا اور دوسرے تمام مذہبی کیابوں کے تردید کرتا ہے وہی برہمہ سماج دوسرے مذاہب کے پاک اور مذہبی کتابوں کا عزت واحترام کرتا ہے۔لیکن اس نظریاتی اختلاف کے باوجود دونوں نے سماجی و مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ تعلیمی بیداری بھی پیدا کیے۔ دونوں تنظیموں نے کئی اسکولیں قائم کی جس میں بچوں کو مفت تعلیم مہیا کرائی جاتی تھی اور یہ اسکولیں آج بھی اپنی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ پریم چند برہمہ سماج کے سماجی اور مذہبی اصلاح کے مہم سے کافی متاثر تھے۔ظاہر سی بات ہے انہیں آریہ سماج سے بھی جذباتی اور روحانی لگاؤ ہو گیا تھا۔اس بات کا ثبوت ہمیں ان کے ناول ہم خرما وہم ثواب میں ملتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار ایک وکیل ہے جس کا نام امرت رائے ہے۔امرت رائے اپنا عقیدہ بدل کر سناتنی سے آریہ سماجی بن جاتا ہے اور پرے جوش کے ساتھ آریہ سماج کے خدمات میں لگ جاتا ہے اور اس کے لئے اسے اپنی شادی کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے جو اسے منظور ہوتا ہے۔

پریم چند کو اس بات کا بخوبی اندازا تھا کہ سماج میں جو بہت ساری برائیاں پھیلی ہوئی ہیں اس کے کئی وجوہات ہیں۔جس میں سے ایک وجہ وہ سماج میں تعلیم کی کمی بھی ہے۔ پریم چند اس بات کا قائل تھے کہ اگر سماج میں تعلیم کا فروغ ہوگا اور لوگ پڑھے لکھے گے تو ان کے اندر سمجھ پیدا ہوگی اور وہ اپنے حق کو جان پائنگے ،اچھائی اور برائی کے بیچ کے فرق کو سمجھ پائیں گے۔جس سے سماج میں اصلاح کرنا آسان ہوگا۔اس وجہ سے پریم چند برہمہ سماج اور آریا سماج کے تعلیمی کوششوں سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ تعلیم کے اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور سماج کے ہر فرد تک تعلیم کو پہنچانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ واردات کے اکثر و بیشتر افسانوں میں وہ تعلیم کے اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوکان ہستی اور میدان عمل جیسے ناولوں میں بھی تعلیم کے اہمیت اور ضرورت

ہر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پریم چند اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ اگر سماج میں تعلیم عام ہو جائے گا اور لوگ پڑھ لکھ جائینگے تو سماج کے کئی مسئلے خود بخود حل ہو جائنگیا ور سماج کی کئی برائیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔ میدان عمل میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے پریم چند کہتے ہیں کہ:

"یہ مدرسہ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے ہی میں تھا۔ نو بجے تک ڈکٹر صاحب خود تعلیم دیتے تھے۔ اگر چہ یہاں فیس بالکل نہ لی جاتی تھیا ور تعلیم کے جدید اور بہترین اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی پھر بھی لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مشکل سے دو ڈھائی سولڑکے آتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھولے بھالے معصوم بچوں کا فطری نشو نما کیسے ہو۔ وہ کیسے با ہمت، قناعت پسند، سچے خادم بن سکیں۔ یہی اس کا خاص مقصد تھا۔"

(میدان عمل، ۔ص۔۱۲۹)

پریم چند نے اپنے دور کے سیاسی وسماجی حالات کو اپنے تخلیق کا موضوع بنایا۔ وہ ہندوستان کے آزادی کے حمایتی تھے لیکن صرف سیاسی نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو صرف سیاسی آزادی حاصل نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سماجی، مذہبی اور معاشی آزادی بھی حاصل ہو۔ وہ سبھی ہندوستانیوں خاں اور عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑہ سبھی کے مکمل آزادی چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سماج رہنے والے غریبوں، مزدورں، دلتوں، عورتوں اور کمزور طبقوں سے آنے والے سبھی لوگوں کو ذات پات، اونچ نیچ، بھید بھاو سے آزادی ملے۔ سماجی کے سبھی رسم ورواج جوان کے آزادی پر پابندی عائد کرتی تھی ان سب سے انہیں چھوٹکارا حاصل ہو۔ سماجی بندھنوں، غیر ضروری روایات اور رسومات کے خلاف پرم چند احتجاج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے پریم چند کے سبھی تخلیقوں میں سیاسی اور سماجی لڑائی دیکھائی دیتی ہے۔ وہ اہراؤ، سرمایہ داروں اور سامراجیہ وادیوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں، ناولوں اور مضامینوں کو پڑھنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف انسانوں کے آزادی کے حمایتی تھے بلکہ انہیں جانوروں سے بھی ہمدردی تھی جنہیں انہوں نے اپنے تخلیقات کا اہم حصہ بنایا۔

پریم چند نے جتنے بھی افسانہ، ناول اور مضامین لکھے ان سب پر آریا سماج کا اثر صاف صاف دیکھائی دیتا ہے

۔ پریم چند اپنے تخلیقات کا موضوع سماج میں پھیلے انہیں برائیوں کو بناتے ہیں جن پر آریا سماج پہلے سے کام کر رہا تھا ان کے خلاف تحریک چلا رہا تھا۔ حالانکہ پریم چند کے کچھ مضامین میں کبھی کبھی ایسا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ آریا سماج کے کچھ نظریہ سے نا اتفاقی بھی رکھتے ہیں۔ اور ایسا اس لئے محسوس ہوتا ہے کیونکہ پریم چند سیکولر مزاج کے انسان تھے اور آریا سماج ہندو مذہب کا پیروکار تھی۔

2.6 علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک سماجی، تعلیمی اور ثقافتی تحریک تھی۔ اس کے بانی سر سید احمد خاں تھے۔ علی گڑھ تحریک کا مطالعہ ۱۸۵۷ء کی ہندوستانی بغاوت اور اس کے بعد ابھرے ہوئے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے پیش منظر کی جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ کی بغاوت جسے ہندوستان کی پہلی آزادی کا جنگ کہا جاتا ہے۔ ایک سائنسی ایجادات پر مبنی ترقی یافتہ اور سرمایہ دارانہ مغربی تہذیب کا ایک زوال پزیر اور روایتی تہذیب کے حامی مشرقی قوم کے بیچ تھی۔ اس جنگ میں مغربی تہذیب کو نہ صرف فتح حاصل ہوئی بلکہ وہ مشرقی تہذیب کے کھوکھلے پن کو بھی اجاگر کر دیا۔ اس واقعات نے ہندوستانی دانشوروں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس وقت کے دانشمندوں نے ابھرے ہوئے حالات پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی عوام کو سیاسی، سماجی، معاشرتی وتعلیمی اعتبار سے مضبوط کئے بغیر مغربی طاقتوں پر برتری حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اسی سوچ و فکر نے ہندوستان میں کئے تحریکوں کو جنم دیا جسے مختلف دانشوروں، مذہبی و سماجی لیڈران نے اپنے اپنے سطح پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں الگ الگ ناموں سے چلایا۔ انہیں دانشوروں میں سے ایک سر سید احمد خان بھی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے سماجی، مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی اصلاح اور اوران کے ذہن اور سوچ و فکر میں تبدیلی لانے کے لئے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کے ذریعہ سر سید مسلم معاشرے کو جدید تقاضوں سے روبرو کرانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور تہذیب کی اصلاح کرنے کی جستجو نے سر سید کو دنیا کی مختلف قوموں کی تہذیب کی تاریخ کے مطالعے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے اپنے مطالعے کی روشنی میں تہذیب وتمدن کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کرنے والے لوازم سے بحث کی۔ اس عمل میں وہ اس

نتیجے پر پہنچے کہ تہذیب وتمدن اور قوم کی ترقی کے لئے ایک قوم کی تہذیب کا دوسری قوم کے تہذیب سے میل جول ضروری ہے۔ایسا نہ ہونے کی صورت میں اس میں جمود طاری ہو جائے گا اور ترقی کی رفتار رک جائے گی۔

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں علی گڑھ تحریک کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو نہ صرف نئے خیالات اور جدید موضوعات سے مالا مال کیا بلکہ اردو نثر کو ایک نیا اسلوب بھی عطا کیا جس میں سلاست، روانی، شیرینی، اور مقصدیت نمایاں ہے۔ سرسید خود اپنے تحریر میں تصنع، عبارت آرائی اور غیر ضروری لفاظی سے گریز کرتے تھے اور وہ اس طرح کے تحریوں کے سخت مخالف تھے۔سرسید سادہ اور آسان زبان کے حامی تھے۔ ایسی زبان جس میں اپنے مافی الضمیر کو اس انداز سے ادا کیا گیا ہو کہ وہ مخاطب کے دل میں اتر جائے۔ نہ اس میں کسی قسم کا ابہام ہو، نہ الفاظ میں اشکال ہو اور نہ جملوں کی ساخت میں پیچیدگی۔ وہ ادب کے افادی پہلو کو سامنے رکھتے تھے۔ پریم چند کی تصنیفات پر علی گڑھ کے ادبی زبان کے اثرات صاف دیکھائی دیتے ہے۔پریم چند کو مطالعہ کرنے پر ہمیں صاف صاف اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند بھی اسی اصول کے پیروکار تھے۔ ان کے مضامین میں جدید خیالات اور موضوعات سے مالا لال دیکھائی دیتے ہیں خواہ ان کا افسانہ ہو ناول۔ زبان بالکل سادہ اور آسان استعمال کرتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کے اردو خدمات پر رشید احمد صدیقی لکھتے ہے۔

"اگر سرسید نے علی گڑھ تحریک کو اپنی اردو نثر سے اور اردو نثر کو علی گڑھ تحریک سے مقصد و محکمی نہ دی ہوتی تو جدید اردو کو وہ پروبال نصیب نہ ہوتے جس کی بدولت وہ بہت جلد اعلیٰ زبانوں کی صف میں داخل ہوگئی"۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب نے ہندوستان کی سماجی زندگی میں کافی گہرا اثر ڈالا۔ ہندوستانی سماج جو قدیم زمانے سے مذہب پسند رہی ہے اس میں بدلاو نظر آنے لگا۔ وہ سبھی تحریکے جو ابھی تک مذہبی رنگ لئے ہوئی تھی سماجی اصلاح کے طرف گامزن ہو جاتی ہے اور سماجی اصلاح کی کوششیں شروع کر دیتی ہیں۔ راجا رام موہن رائے نے جس طرح ہندوؤں کو قدیم اور فرسودہ معتقدات اور روایات سے آزاد کر کے مغربی تہذیب وتمدن کے رنگ وآہنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اور برہمن سماج قائم کر اس کے ذریعہ ہندوؤں کو قدامت پسندی اور تنگ نظری کے سحر سے آزاد کیا اور اسے بہت سی سماجی برائیوں سے نجات دلائیا ور تعلیم کی ترقی کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ اسی طرح سرسید نے بھی ۱۸۵۷ء کے جنگ کی ناکامی کے بعد اپنے چند رفقا کے ساتھ مسلم سماج کے اصلاح اور اس کی ترقی کے لئے جرات مندانہ

قدم اٹھایا۔انھوں نے مسلمانوں میں نہ صرف سیاسی اور سماجی اصلاح لانے کی کوشش کی بلکہ مذہبی، تعلیمی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی شعبوں میں بھی رہنمائی کی۔ اس کے نتیجے میں ہونے والی سماجی اور تمدنی تبدیلیوں نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔اب وہ زمانہ نہیں رہا جب داستانوں کے ذریعے وقت گزاری کی جائے اور دل بہلایا جائے۔ چنانچہ ایک ایسے صنف ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو عصری زندگی کا آئینہ دار بھی ہو اور اس کی رہنمائی بھی کرے۔ علی گڑھ تحریک اردو ادب کو ایک نیا روپ، نیا رنگ اور نیا عزم دیا۔ اردو نثر جو اکے مدت سے تشبیہات، استعارات اور مبالغہ آرائی میں گم تھی۔ علی گڑھ تحریک نے اس کو افکار کی نئی دنیا دیکھائی اور اردو ادب کو ایسی توانائی بخشی کہ وہ ملکی، سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی، تاریخی اور معاشرتی غرض کے ہر طرح کے افکار اور نظریہ کو مضامین کے ذریعہ سادگی اور صفائی کے ساتھ پر اثر انداز میں پیش کرنے کی کے قابل بن گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر اردو ادب میں نیا تجربہ کیا اور دلچسپی اور تفریح کے مقصد کو نظر انداز کر سماج کے حقیقی مسئلہ کو اپنے مضمون کا موضوع بنانا شروع کیا اور اردو ادب کو زندگی کے حقائق سے روبرو کرایا۔ اسی نیا تجربہ نے اردو ادب میں ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اردو ادب میں اب نہ صرف زندگی کے مسائل اور سماج کے حالات کو پیش کیا جانے لگا بلکہ اس میں انسانی زندگی کی تمنائیں اور آرزوئیں بھی شامل کیا جانے لگا۔

پریم چند کے تصانیف پر علی گڑھ تحریک کے اثرات صاف صاف دیکھائی دیتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر جس طرح اردو مضامین کی تصنیف کی بنیاد ڈالی پریم چند اسی راستے چلتے دیکھائی دیتے ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پریم چند نے نذیر احمد کی طریقہ تحریر کو اور پختگی کے ساتھ آگے بڑھایا تو غلط نہ ہوگا۔ علیگڑھ تحریک نے جنس طرح سماجی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کو اپنا تحریک کا مقصد بنایا وہی موضوع پریم چند کے تصنیفات میں دیکھائی دیتے ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانے اور ناولوں میں اپنے وقت کے سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کو بے حد پور اثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ خواہ وہ عورتوں کے مسائل ہو یا غریب مزدور اور کسان کا وہ اپنے تخلیق میں حقیقت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور سماج، سیاست کو طنزیہ انداز میں آئینہ دیکھاتے ہے۔

تعلیم نسواں اس زمانے کے سماج کا ایک پیچیدہ مسئلہ تھا جس سے پورے معاشرے کی تہذیبی اور تمدنی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ عورتوں کی جہالت اور بے ہنری سے معاشرہ طرح طرح کے عیوب اور انتشار کا شکار تھا۔ اس

زمانے میں قدامت پسند طبقہ تعلیم نسواں کا سخت مخالف تھا۔ لیکن علی گڑھ تحریک کے زمانے میں کچھ روشن خیال لوگ تھے جو تعلیم نسواں کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور اس کے فروغ کے لئے جدو جہد کی اور اس کی حمایت میں تحریقے چلائی اور مضامین بھی لکھے۔ نذیر احمد اس میں سب سے آگے تھے اور انھوں نے عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں کئی مضامین لکھی جن میں ناولیں بھی ہے۔اس وقت کے قلمکاروں نے عورتوں سے متعلق مسائل کو زور شور سے اٹھاے اور سماج کی نظر اس طرف کھینچا۔

پریم چند کے تخلیق کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضع طور پر نظر آتا ہے کہ پریم چند نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کو اپنے تخلیق کا موضوع بنایا اور ان کے مختلف مسائل پر کئی مضمومین لکھے اور سماج میں عورتوں پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ پریم چند نے سماج میں عورتوں کے ساتھ ہو رہے بھید بھاو اور ان کے حالات کو جس طرح سے قلم اٹھاتے ہے اس سے ان کے تخلیقات پر علی گڑھ تحریک کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ پریم چند نے سماج میں ذات پات، ظاہلیت اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف بے باک نظر آتے ہے۔ وہ اپنے تخلیقات میں غریب، مجبور، لاچار اور مظلوم عورتوں کے حق کی بات کرتے ہیں

اور امیر و جمیندا روں کے رویہ کے خلاف آواز بلند کرتے ہے۔ پریم چند غریب مزدو اور کسان کے حالات کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا اور کی حقیقی حالات کو سماج کے سامنے لایا۔ پریم چند کے سبھی مضامیں سماجی، معاشی، تہذبی اور معاشرتی اصلاح کے لئے لکھے گئے ہیں۔ پریم چند کے مضامین کو گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ واضع طور معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے تخلیقات پر علی گڑھ تحریک سے کافی متاثر ہے۔

اگر نظریاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو علی گڑھ تحریک اور پریم چند کے نظریات میں تھوڑا فرق دیکھائی دیتا ہے۔ علی گڑھ تحریک جہاں ایک خاص سماج یعنی مسلم سماج میں تعلیمی، سماجی، اور معاشرتی اصلاح کے لئے شروع کیا گیا اور اس تحریک کی ہر اقدامات مسلمانوں کو مرکز میں رکھ کر اٹھائی گئی ہے۔اس تحریک سے منسلک ادباء مسلمانوں اور ان کے سماجی ،تعلیمی اور معاشرتی حالات کو مرکز میں رکھ کر اپنی تخلیقات کو انجام دیئے۔اس لئے ان کے تخلیقات ایک خاص طبقہ کا آئینہ داری کرتا ہے۔جبکہ پریم چند ہندوستان میں رہنے والے سبھی طبقے کے غریب، مزدور، کسان اور بے بس عورتوں کو کے حالات زندگی کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا۔خواہ وہ کسی بھی مذہب اور معاشرہ سے تعلق رکھتا ہو۔ پریم چند سیلولر خیالات

کے انسان تھے۔ ایک طرف علی گڑھ تحریک جہاں مسلمانوں کے ترقی وفروغ کے لئے انگریزوں کی حمایت کی بات کرتا ہے وہی پریم چند انگریزوں کے مخالف نظر آتے ہے۔ وہ جہاں ایک طرف امیر زمینداروں کے ظلم وستم سے عام لوگوں کو آزاد کرانا چاہتے ہے وہی وہ انگریزوں سے ملک کو بھی آزادی دلانا چاہتے ہے۔ سماج میں رہنے والے سبھی انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب، ذات اور جنس سے تعلق رکھتا ہو، پریم چند سبھی کو سماج برابری کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ انسا حقوق کے بہت بڑے پیروکار تھے۔

2.7 خلاصہ

ہندوستان میں قومی اصلاحی تحریک کی تاریخی روایت پرانی ہے۔ سماجی اصلاح کی تحریکوں کا وجود ہر زمانے دیکھا جاسکتا ہے۔ ۱۹ویں صدی میں ہندوستان میں سماجی وقومی اصلاحی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ اس دور کو اصلاحی دور کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریزوں کی تعلیم، تہذیب وثقافت سے ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ متاثر نظر آتا ہے۔ یہ طبقہ سماج اور قوم کو انگریزی قوم کی طرح ترقی یافتہ اور خودمختار دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی طبقہ کی نمائندگی راجا رام موہن رائے، سرسید احمد خاں اور پرین چند کر رہے ہیں۔ یہ طبقہ سماج کے اندر پھیلی برائیوں کو ختم کر سماج کو ترقی پزیر بنانے کے آمادہ ہیں۔ سماج کے اندر پھیلی انہیں برائیوں کو دور کرنے اور سماج وقوم کو عصری تعلیم سے روشناش کرانے کے لئے مختلف سطح پر مختلف مختلف تحریکے چلاتے ہیں، جن میں برہمن سمان، آریا سماج، علی گڑھ تحریک کا نام سرفہرست ہیں۔ ان تحریکوں نے سماج وقوم میں رائج غیر ضروری رسم روج وروایتیں جو غریبوں، مزدوروں اور عورتوں کے حقوق پر قدگن لگاتی تھی کے خلاف آوازیں اٹھائی۔ ان تحریکوں کے اثرات اس وقت کے فنکاروں اور ادیبوں پر بھی پڑا۔ انہیں ادیبوں میں پریم چند کا نام بھی سرفہرست ہیں۔ پریم چند ۱۹ویں صدی میں چلنے والی سماجی وقومی اصلاحی تحریکوں سے کافی متاثر تھے۔ ان زندگی کے ہر پہلو میں ان کے اثرات دیکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند ان اثرات کے وجہ کر ترقی پسند تحریک کا حصہ بنتے ہیں۔ اور ان کے تمام تر تخلیقات میں ان تمام تحریکوں کے چھاپ صاف صاف دیکھائی دیتے ہیں۔

2.8 فرہنگ

مماثلت مانند ہونا

متزلزل کانپنے والا، ڈگمگانے والا

انتشار تتر بتر ہونا

قدامت قدیم ہونا

افکار فکر کا جمع

رفقا دوست، رفیق کا جمع

گامزن چلنے والا

عصری موجودہ

ساخت بناوٹ

جنم پیدہ ہونا

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ پریم چند کے دور کے قومی تحریکوں کے بارے میں لکھے؟

۲۔ برہمن سماج کے قومی اصلاحی خدمات کو لکھے؟

۳۔آریا سماج کے سماجی اصلاح کو تفصیل سے بیان کرے؟

۴۔ علی گڑھ تحریک پر ایک نوٹ لکھے؟

2.10 حوالہ جات وسفارش کردہ کتابیں

۱۔ اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی ۔ڈاکٹر محمد ایمن انصاری

۲۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار۔ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

۳۔ پریم چند ادبیات ۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

۴ ۔ پریم چند: ایک نقیب ۔ڈاکٹر صغیر افراہیم

پریم چند: حیات اور شخصیت

سبق کی ساخت:

3.1 تمہید

3.2 مقاصد

3.3 پریم چند کی حالات زندگی

3.4 پریم چند کی شخصیت

3.5 پریم چند کے ادبی ادوار

3.6 پریم چند اور ترقی پسند تحریک

3.7 خلاصہ

3.8 فرہنگ

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

3.10 سفارش کردہ کتابیں

3.1 تمہید

پریم چند اردو نثر نگاری کی تاریخ میں اتنے اہم مقام کے مالک ہیں کہ ان کا نام علیحدہ کر لینے پر اردو افسانہ نگاری کی روایت سے واقفیت حاصل کرنا پریم چند اردو نثر نگاری کی تاریخ میں اتنے اہم مقام کے مالک ہیں کہ ان کا نام علیحدہ کر لینے پر اردو افسانہ نگاری کی روایت سے واقفیت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف اردو

افسانہ کے بانیوں میں سے ہیں بلکہ انہوں نے اردو افسانے کو اس مقام تک پہنچایا ہے جو ادبی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آج بھی اردو افسانہ ان کی نشاندہی اور روایت پر چل کر نئی راہوں کا متلاشی ہے۔ ان کی ادبی حقیقت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ سے عوام کے مسائل سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔ وہ اردو اور ہندی زبان کے اہم قلمکار ہیں۔

3.2 مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ

پریم چند کے حالات زندگی کے بارے میں جان جائیں گے۔

پریم چند کے شخصیت کو سمجھ جائیں گے۔

پریم چند کے ادبی سفر سے واقف ہو جائیں گے۔

3.3 پریم چند کی حالات زندگی

پریم چند کا اصلی نام 'دھنپت رائے' تھا جسے ان کے گھر والوں نے رکھا تھا۔ ان کے پیارے چچا انہیں پیار سے 'نواب' کہہ کر پکارتے تھے اسی وجہ سے خاندان کے دیگر لوگ بھی انہیں 'نواب' کے نام سے پکارہ کرتے تھے اس لئے ان کا ایک اور نام 'نواب رائے' بھی تھا۔ انہوں نے جب ادبی دنیا ہیں قدم رکھا تو اپنی پہلی تخلیق 'نواب رائے' کے نام سے ہی لکھا تھا۔ بعد میں وہ پریم چند کے نام سے مشہور ہوے۔ پریم چند کی پیدائش ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس کے قریب لمہی نامی گاؤں میں ایک معمولی سے کائستھ گھرانے میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام عجائب لال تھا جو ایک ڈاکخانہ میں ڈاک منشی کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کی والدہ کا نام آنندی دیوی تھا جو نہایت ہی نیک سیرت عورت اور تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی۔ پریم چند کے والد عجائب لال چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لئے ان کا تبادلہ کئی دیہاتوں اور قصبوں

میں ہوتے رہتا تھا جس کے وجہ کر پریم چند کو بچپن میں ہی کئی دیہاتوں اور قصبوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ پریم چند کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ دستور کے مطابق اردو و فارسی کی تعلیم سے آراستہ ہونے کہ لیے ان کے گھر والوں نے ۱۸۸۵ء میں ایک مولوی صاحب کے یہاں بٹھا دیا۔ پریم چند بھی بچپن میں دوسرے بچوں کی طرح شریر تھے۔ سات آٹھ برس فارسی کی تعلیم سے استفادہ کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ابھی وہ اپنی عمر کے آٹھ سال بھی نہیں گزارے تھے کہ ۱۸۸۸ء میں ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہو گیا اس کے بعد ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں جسے پریم چند چاچی کہتے تھے کا برتاؤ پریم چند کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ جس کے وجہ سے وہ زیادہ تر گھر سے غائب رہتے تھے۔ اور دوستوں کے ساتھ حقہ پیتے اور داستانیں پڑھتے۔ جب انہوں نے نویں جماعت میں قدم رکھا تو ۱۵ سال کی عمر میں ۱۸۹۶ء میں ضلع بستی کے ایک زمیندار گھرانے میں ان کی شادی کر دی گئی۔ بدقسمتءسے شادی کے کچھ بعد ہی عرصے بعد ۱۸۹۷ء میں ان کے والد نے بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا۔ والد کے انتقال کے بعد پورے گھر کا بوجھ ان کے کندھے پر آ گیا۔ فکر معاش نے پریشان کیا تو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگے اس طرح سے ان کے گھر بار کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں سکنڈ ڈویژن میں دسویں کا امتحان پاس کیا اور ایک سال کے بعد ہی اٹھارہ روپیہ ماہوار پر ایک مشن اسکول میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد سرکاری نوکری میں آئے اور بہرائچ میں معلم کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ پرتاپ گڑھ ہو گیا اور اسی دوران انہوں نے اپنا پہلا ناول ''اسرار معابد'' لکھا۔ ۱۹۰۳ میں یہ ناول بنارس سے نکلنے والے ایک ہفت روزہ اخبار میں قسط وار شائع ہوا۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ پریم چند ابھی کم سنی میں ہی تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بیشتر کہانیوں میں کتنے ہی اسے کردار بنایے ہیں جن کی مائیں انہیں ان کی کم سنی میں ہی چھوڑ کر اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیں اور بچہ اکیلا زندگی کی تھپیڑے کھاتا رہا۔ اس کی مثال میں ان کی ایک تخلیق ''دودھ کی قیمت'' کو لیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی بچپن آخر بچپن ہی ہوتا ہے اور اس وقت کی دنیا سب سے رنگین ہوا کرتی ہے۔ اس لڑکپن کے دور میں وہ کم نٹ کھٹ نہیں تھے، آم کا موسم آیا تو باغوں میں ڈھیلے بازی کرتے گھوم رہے ہیں، مداری بھالو کا ناچ دکھانیآیا تو اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے، گلی ڈنڈا ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔ کھیل کھیل میں ایک لڑکے کا کان کاٹ دیے اور پوچھے جانے پر جواب دیا کہ اس کی حجامت بنا رہا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ گھر سے پورا روپیہ اڑا کر میلہ دیکھنے چلے گیے، اردو فارسی پڑھتے تھے

اورا یکھ مٹر کے کھیتوں میں وقت گزارتے تھے، پریم چند کی دادی اپنا پورا پیار ان پر نچھاور کرتی تھیں اور کہانیاں سنایا کرتی تھیں جن کا تذکرہ پریم چند نے اپنی کئی کہانیوں میں بڑے پرکشش انداز میں کیا ہے۔

3.4 پریم چند کی شخصیت

پریم چند کی شخصیت کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ نہایت ہی نیک انسان تھے، انکساری مزاج کے مالک، کبر وغرور سے کوسوں دور، سادگی کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی جہت سے وہ ایک عظیم قلمکار اور مصنف معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کھیتی سے بہت رغبت تھا جبکہ گائے پالنے کے بارے میں بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا کرتے تھے، تصنیف کا کام بڑی ذمہ داری اور پابندی سے کیا کرتے تھے، لکھنے سے پہلے نہ کبھی غور وفکر کیا اور نہ کبھی موڈ کا انتظار کیا، وقت ہوا قلم اٹھایا اور لکھنے لگے، پچھلی نشست میں جہاں سلسلہ چھوڑا تھا وہیں سے شروع کیا اور بات آگے بڑھاتے گئے اور اسی یکسوئی سے لکھنے میں مصروف رہتے اور اس طرح سے انہوں نے اپنی لاتعداد یادگار چھوڑی ہیں۔ انہوں نے بیوہ عورت، ناکامیاب شادی، جہیز کی لعنت اور سماجی تفریق جیسے موضوعات پر اپنی تخلیقات پیش کی۔ اس دور میں ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے معاشرے کو احترام، انسانیت، مشرقی مغربی تہذیب کا فرق اور اخلاقی اقدار کی جانب انہوں نے متوجہ کیا۔ چوں کہ پریم چند کا تعلق دیہی زندگی سے تھا یہی وجہ ہے کہ دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ وہ کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے دکھوں سے آگاہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غریب کسان اور کاشت کار کے رہن سہن اور اس کے افلاس و دکھوں کی تصویر کشی کی ہے

پریم چند کو کانپور میں ادیب کی حیثیت ملی تھی جہاں ان کے دوست منشی دیا نارائن نگم اردو میں ''زمانہ'' نام کا ماہنامہ نکالتے تھے۔ ان دنوں پریم چند کو رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہاتھ لگا، ان کہانیوں نے پریم چند کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کا اردو ترجمہ کر کے رسالہ ''زمانہ'' میں شائع کر دیا۔ ان ہی دنوں میں انہوں نے اپنی پہلی کہانی تصنیف کی جس کا عنوان تھا ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اس کہانی کو بھی رسالہ ''زمانہ'' میں شائع کرا دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کا ہے اور یہی زمانہ تقسیم بنگال کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس تقسیم کے خلاف جگہ جگہ احتجاج چل رہے تھے۔ ان ہی دنوں پریم چند

نے حب الوطنی کے موضوع پر پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کرایا جس کا نام تھا ''سوز وطن'' اور اس کا سن اشاعت ۱۹۰۹ء ہے۔ کتاب کے شائع ہونے کے چھ ماہ بعد حکومت کی طرف سے عتاب نازل ہوا، ان کی نوکری تو محفوظ رہی لیکن سوز وطن کے سارے مجموعے کو سرکار نے اپنے قبضے میں لے کر آگ کے حوالے کر دیا اور آئندہ کے لیے سخت پابندی عائد کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ادبی نام نواب رائے سے بدل کر پریم چند رکھا اور اس نام سے ان کی پہلی کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' ہے جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ نوکری کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔ عدم تعاون تحریک کے دوران وہ گورکھپور میں مقیم تھے، وہیں انہوں نے مہاتما گاندھی کی تقریر سنی اور بہت متأثر ہوئے۔ اس تقریر کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ انہوں نے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور بنارس واپس لوٹ آئے اور ادب کی خدمت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔ اس طرح سے ان کا قلم چلتا رہا، مسلسل کہانیاں وجود میں آتی رہیں، ناول چھپتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ڈراموں کے فن کو بھی نہیں بخشا اور اس فن پر بھی اپنی طبع آزمائی کی۔ دولت تو خیر ان کو نصیب نہیں ہوئی مگر شہرت دوام حاصل ہوگئی۔ سرکار ان کو ''رائے بہادر'' کا خطاب عطا کرنا چاہتی تھی لیکن ان غیر ملکی سرکار سے ملنے والے عہدہ اور اعزاز کو ناپسند کیا اور اسی وجہ سے انہوں نے خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پریم چند نے بلا منت غیرے زندگی بسر کرنے کے خیال سے تین صاحبوں (ایک فراق اور دو ان ہی کے قریبی عزیز) کے ساتھ مل کر سرسوتی پریس قائم کیا۔ اس میں انہوں نے اپنی طرف سے ساڑھے چار ہزار روپئے لگائے لیکن جب کافی منافع نہ ہوا تو رفتہ رفتہ پریس کی ساری ذمہ داری ان ہی کے سر آ گئی۔ اب وہ ایسی کشمکش میں مبتلا ہو گیے جس کے لیے ان کی طبیعت موزوں نہ تھی۔ پیہم نقصانات سے انہیں ایک بار پھر سے دوسروں کی ملازمت کا سہارا لینا پڑا۔ ۱۹۲۵ء میں ہندی کے مشہور دار الاشاعت گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ میں غالباً سو روپیہ کے ماہوار پر انہوں نے لٹریری اسسٹنٹ کی آسامی قبول کر لی۔ ۱۹۲۸ء میں بشن نرائن صاحب بھارگو مالک مطبع منشی نول کشور کی قدردانی نے انہیں پھر لکھنؤ کھینچ بلایا۔ منشی صاحب پریم چند جی کے افسانوں کے گرویدہ ہو چکے تھے، انہوں نے دوسو روپیہ ماہوار پر اپنے مشہور ہندی رسالہ ''سادھوری'' کی ایڈیٹری ان کے سپرد کر دی چنانچہ ۱۹۳۱ء تک وہ منشی نول کشور پریس میں رہ کر وہ مطبع کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ منشی بشن صاحب اولوالعزم اور علم دوست انسان تھے، انہوں نے درویشانہ طبیعت پائی تھی تاہم بعض رئیسانہ شوق بھی دامنگیر تھے، مزاج میں اج حد مروت تھی، دل غنی تھا اور دماغ خرچ کی الجھنوں سے

آزاد تھا۔ وہ ہر صیغہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کرنا چاہتے تھے مگر استقلال و جفاکشی سے ہر کسی کی طرف رجوع نہ ہوتے تھے اور مطبع خسارہ سے چل رہا تھا۔ چنانچہ کارخانہ کو مزید بلندیوں تک لے جانے کے خیال سے پریم چند کو تصنیف و تالیف کے صیغہ میں منتقل کر دیا جہاں انہوں نے اپنی ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھاتے ہوئے کئی زیر طبع کتابوں کو نظر ثانی کے علاوہ ابتدائی درجوں کے لیے اردو ہندی ریڈریں بھی مرتب کیں۔ اسی سلسلے میں انہیں مرزا عسکری صاحب اور حضرت آسی لکھنوی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا مگر منشی بشن نرائن صاحب کی تاوقت وفات نے تمام منصوبے ختم کرا دیے اور ریاست کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوگئی جس کے عہد حکومت میں اہل کمال کے قدر دانی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اس طرح سے ۱۹۳۱ء میں منشی پریم چند کا مطبع نول کشور سے بھی قطع تعلق ہو گیا مگر چونکہ لڑکے لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے اس لیے اپریل ۱۹۳۴ء تک آپ کو بھی لکھنؤ رہنا پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر بنارس چلے گیے اور ایک سال یعنی مئی ۱۹۳۵ء تک اپنے مطبع ''سرسوتی'' پریس کا کام اپنے ذمہ کر لیا۔ اس اثنا میں وہ اردو سے بالکل مایوس ہو کر ہندی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ انہوں نے ہر ممکن طرح سے پریس کو فروغ دینا چاہا۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ''ہنس'' نام کا ایک ہندی ماہوار رسالہ جاری کیا مگر چھ ماہ بھی مشکل سے گزرنے نہ پایے تھے کہ جون ۱۹۳۰ء میں آرڈیننس کے ماتحت اس سے ایک ہزار کی ضمانت مانگی گئی جس پر آپ نے پرچہ کو بند کر دیا مگر چھ ماہ بعد جب یہ آرڈیننس منسوخ ہو گیا تو آپ نے جنوری ۱۹۳۱ء میں اسے دوبارہ جاری کیا مگر دو ہی تین نمبر نکلے ہوں گے کہ ''قاتل'' نامی ایک کہانی کی اشاعت کے علت میں پھر ضمانت مانگی گئی۔ مگر سٹر پنا لال صاحب کلکٹر بہادر بنارس کی سفارش پر گورنمنٹ نے اپنے حکم کو واپس لے لیا اور ''ہنس'' پھر بدستور چلتا رہا۔

اگست ۱۹۳۳ء میں انہوں نے ''جاگرن'' نامی ایک ہندی ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داری بھی لے لی۔ پریم چند کا گمان تھا کہ اس ہفتہ وار سے مطبع کو مدد ملے گی لیکن دو ہی سال کے اندر ان کو آٹھ دس ہزار کا نقصان ہوا جس سے مجبور ہو کر انہیں اسے بند کرنا پڑا۔ اس اثنا میں بعض کارکنوں نے بھی انہیں دھوکا دیا۔ غرض پریس پر قرض کا بار زیادہ ہو گیا جس کی ادائیگی کے لیے ان کو بمبئی جا کر فلمی دنیا میں ملازمت اختیار کر لی۔ ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ طے پائی اور باقاعدہ معاہدہ ہو گیا لیکن بمبئی میں ان کی صحت اچھی نہیں رہی اور کام کے سلسلے میں بھی ان کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ تو یہ سمجھ کر گئے تھے کہ اچھے اچھے ڈرامے تیار کر کے ملک میں علمی و ادبی فلم جاری کریں گے لیکن کچھ اور ہی صورت

حال نظر آئی۔ مالکان اپنی مرضی کے مطابق عام پسند تماشے بنواتے اور بڑے سے بڑے مصنف کے تصنیف کردہ پلاٹ میں من مانی کاٹ چھانٹ کر دیتے ہیں اور مصنف کو دم مارنے کا موقع نہیں رہتا تھا۔ یہاں بھی قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور اسی لیے فلمی دنیا سے بھی اپنا رشتہ منقطع کر کے ۱۹۳۵ء میں واپس بنارس لوٹ آیے اور یہاں نئے نئے ادیبوں کا سہارہ بن گیے۔ فلمی دنیا میں لکھی گئی ان کی مشہور کہانی ''مل مزدور'' ہے۔

پریم چند کو عرصہ دراز سے ضعف معدہ کی شکایت تھی۔ سرکاری ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں بھی وہ مہوبا میں بھی بہت بیمار ہو گئے تھے اور اس کے بعد یہ شکایت کم وبیش مسلسل جاری رہی۔ وہ اپنی صحت کا کوئی خاص خیال نہیں کیا کرتے تھے۔ بمبئی کی آب وہوا بالکل بھی ان کو راس نہ آئی، یہاں کی آب وہوا ان کی طبیعت کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ہاضمہ اور بھی کمزور ہو گیا آخر جون میں یہ شکایت حد سے زیادہ تجاوز ہو گئی جس سے باوجود علاج ومعالجہ کے جابر نہ ہو سکے جب وہ لکھنؤ گئے تو مرض بہت ترقی کر چکا تھا اور ان کی طبیعت بھی علاج سے اکھڑ چکی تھی۔ ضعف اتنا بڑھ چکا تھا کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا بالکل محال ہو گیا تھا اور پھر ۵۶ سال کی عمر میں ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

پریم چند کو بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے اور سننے کا بہت شوق تھا اور اسی شوق نے ان کو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۰ء سے ہوا جب انہوں نے ایک ناولٹ ''ایک ماموں کا رومان'' تخلیق کیا۔ رسالہ زمانہ کانپور میں مضمون لکھنا شروع کیا، ابتدائی دور میں انہوں نے افسانے تخلیق کیے پھر ان کے خیال میں آیا کہ ناول کی دنیا میں بھی طبع آزمائی کی جایے اسی خیال سے انہوں نے قلم اٹھایا اور اس صنف کے ساتھ بھی انہوں نے بہت انصاف کیا اور اس میدان میں بھی انہوں نے اپنا نام روشن کیا اور لاتعداد یادگاریں چھوڑی ہیں۔ مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور دل وجان سے ملک کی آزادی کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کو اردو ہندی دونوں زبانوں میں مکمل عبور حاصل تھا اور دونوں زبانوں میں انہوں نے اپنی صلاحیت کا لوہا منواتے ہویے لاتعداد یادگاریں چھوڑی ہیں۔

3.5 پریم چند کے ادبی ادوار

محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اردو کا پہلا اہم اور بڑا افسانہ نگار پریم چند ہیں۔ اردو ادب میں یہ ایک ایسا نام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے قلم سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون ''پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور'' میں پریم چند کی افسانہ نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور: ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۹ء تک۔ یہ دور ابتدائی کوشش کا دور ہے۔

دوسرا دور: ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک۔ اس دور میں انہوں نے تاریخی اور اصلاحی افسانہ لکھے۔

تیسرا دور: ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک۔ یہ دور اصلاحی اور سیاسی افسانے کا دور ہے۔

چوتھا دور: ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ تک۔ اس دور میں انہوں نے سیاسی اور فکری افسانے تخلیق کیے۔

منشی پریم چند کی ابتدائی تحریریں جو ان کے پہلے دور میں شامل ہے جس میں انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' لکھا جو نوابرائے نے نام سے لکھے تھے۔ اس وقت آپ آریہ سماج تحریک سے بہت متاثر تھے لیکن افسانہ نگاری کا شوق اور حوصلہ انہیں اس وقت ہوا جب وہ اردو ہندی ترجموں کے ذریعہ ٹیگور کے ادب پاروں سے روشناس ہوئے ہیں۔ دوسرا دور سوز وطن کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے جس میں پریم چند کے اصلاحی اور تاریخی ناول وجود میں آتے ہیں۔ یہ دور گیارہ سال کے عرصہ میں پھیلا ہوا ہے۔ جنگ عظیم ختم ہو چکی اور ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز ہوتا ہت۔ اس عرصہ میں پریم چند نے پریم پچیسی، پریم بتیسی اور پریم چالیسی کے بعض افسانے تصنیف کئے۔ اسی دوران انہوں نے اصلاحی افسانے بھی کثرت سے تحریر کیے۔ پریم چند نے غیر معمولی اور تیز قوت مشاہدہ کی بنا پر ان میں بھی پوری کامیابی حاصل کی۔ اس دور کے اصلاحی افسانوں میں سوتیلی ماں، نجات مندر، مستعار گھڑی وغیرہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ رنگینی خیال اور مناظر فطرت کی جگہ بے پناہ جوش نے لے لی ہے اور اس میں روشنی کم اور حرارت زیادہ ہے۔ مقصدی رنگ تمام افسانوں میں چھایا ہوا ہے۔

تیسرا دور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اتحادی جرمنی کے مردہ جسم کو نوچ نوچ کر کھا رہے

تھے۔ عالم سرمستی میں انگریزوں نے اپنی فتوحات کے صدقہ کے طور پر ایک ٹکڑا ہندوستان کی طرف پھینکا۔ ہندوستان میں یہ ہلچل کا زمانہ تھا۔ تمام سیاسی تحریکیں اپنے پورے شباب پر تھیں۔ پریم چند ان تمام واقعات سے اتنے متأثر ہوئے کہ سرکاری ملازمت کا پٹہ اپنے گلے سے اتار پھینکا اور آزادی ملک پر لبیک کہا، ان کے قلم نے راہ بدلی اور افسانوں میں سیاسی رنگ کو شامل کیا۔ چنانچہ اسی دور میں انہوں نے بہت سے ایسے افسانے لکھے مثلاً جیل بھاڑے کا ٹٹو، قاتل، ستیہ گرہ وغیرہ جن میں زندگی کے واقعات کو سیاسی اثرات کے ماتحت پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کی ناولیں تو اس دور کی سیاست کا آئینہ ہی بن کر رہی گئی ہے۔ پریم چند نے سرکاری ملازمت کا طوق اپنے گلے سے اتار کر نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے قلم کے لئے بھی آزادی حاصل کر لی تھی۔ ان کے قلم کی رفتار اب تیز تھی کیوں کہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر اب وہ یکسوئی کے ساتھ ادب کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ چنانچہ یہ دور افسانوں کی پیداوار کے اعتبار سے بہت زرخیز ہے۔ ان کے قلم کی نوک ب بار یک ہوگئی تھی اور اب وہ بے جھجک ہو کر سب کچھ لکھنے میں آزاد تھے۔

چوتھا دور نہایت مختصر ہے جو ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء صرف چار سال میں پھیلا ہوا ہے لیکن یہ چار سال ان کے معاشی، معاشرتی اور فنی نظریوں کے ارتقا میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی دور میں سال ۱۹۳۲ء میں انگارے شائع ہوئے جو کئی لحاظ سے ہمارے پچھلے دس بارہ سال کے سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی کے ہیجانات کا نقطۂ عروج ہے۔ نئے اشتراکی میلانات سے پریم چند اس زمانہ میں بہت متأثر ہوئے۔ انہیں ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ بعد کو وہ اس میں شریک ہو گئے تھے ''ترقی پسند تحریک'' کے پہلے اجلاس کی صدارت بھی قبول کر لی۔ اسی دور میں ان کے دو مشہور افسانوی مجموعے ''زادِ راہ'' اور ''واردات'' شائع ہوئے۔ یہ افسانے قطعی طور پر ان تمام پچھلے افسانوں پر بھاری ہیں۔ ان میں فنی تکمیل کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔

پریم چند دراصل شروع میں حقیقت نگار نہ تھے بیشک وہ شروع سے ایک چابکدست مصور تھے، ان کی نظر نے جو دیکھا وہی پیش کیا لیکن ایسا کرتے وقت وہ ہمیشہ اس چنگاری کو تلاش کر لیتے تھے جو انسان کو زندہ رہنے پر مجبور کر لیتی ہے اس حقیقت کی تفصیل ایک مضمون میں اس طرح دی ہے:

> ''واقعیت چاہتی ہے کہ آرٹسٹ دنیا کو اس طرح دکھائے جیسے وہ اسے دیکھتا ہے، اگر اس سے انسانی احساس کو صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچے، اگر اس سے حس

انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے پر ایسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں ہے مگر ادیب سب کچھ سمجھنے پر بھی آئیڈلسٹ بننے کے لیے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اسے بیتاب کریں گی۔ اگر کسی بہتر زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو اصلاح کی کس منزل مقصود تک لے جائیں گے''۔

پریم چند کی نظروں سے آخری دور میں یہ منزل مقصود اکثر اوجھل ہو جاتی ہے۔ اب وہ مثالیت کا چراغ لے کر قاری کو منزل مقصود تک نہیں لے جاتے ہیں بلکہ حقیقت کے دئے کی روشنی میں رہ رو کو خود دیکھنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دوسری چیز جس سے پریم چند اپنی ادبی زندگی کے آغاز کے وقت بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں ملک کی سیاسی فضا تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی اور آزادی کے ترانے پنجم سروں میں گائے جا رہے تھے پریم چند نے ان ہی واقعات سے متا ثر ہو کر ''سوز وطن'' تصنیف کیے۔ اس کتاب کی ضرورت اور اس کی اہمیت اس چھوٹے سے مقدمہ سے ظاہر ہوتی ہے جو مصنف نے اس کے شروع میں لکھا ہے:

''ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں۔ وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں کہ جیسے آئینے میں صورت ہمارے لیٹریچر کا ابتدائی دور تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے میں قصوں اور حکایات زیادہ اصلاح اور تجدید کے

جئے لئے ہوئے ہے۔اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اٹھانے لگے ہیں کیوں کہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لیٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں''۔

گویا کہ پریم چند کی افسانہ نگاری کو سب سے بڑی تحریک ملک کی سیاسی فضا سے ملی۔ان کے خیال میں قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اس لئے ایک نئے ادب کی ضرورت ہے۔ایسی کتابوں کی جو نئی نسل کی جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔''سوز وطن'' اسی مقصد کو زیر نظر رکھتے ہوئے شائع کی گئی۔ بدقسمتی سے جہاں سوز وطن نے جہاں بہت سے دلوں کی آگ بھڑکائی وہاں بہت سے دلوں کا جلایا بھی۔ان کا افسانہ ''کفن'' اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔اس افسانے کو دنیا آج بھی اپنے پلکوں میں بٹھائے رکھا ہے۔اس افسانہ میں انہوں نے بہت ہی خوبصورت انداز سے اس طبقے کی حالت زار کو بیان کیا ہے جس جاگیردار طبقہ کی وجہ سے کمزور طبقہ بے حس ہو جاتا ہے اور انسانیت دم توڑ جاتی ہے۔ یہ صرف گھیسو، مادھو اور اس کی بیوی ہی کی داستان نہیں ہے بلکہ یہ اس معاشرے کی شکست و ریخت کی کہانی ہے اور اس طبقاتی درجہ بندی کی کہانی ہے جس نے ایک انسان کو اعلیٰ اور دوسرے کو کمتر اور نکھوٹا بنا دیا ہے۔زمانے کی دی ہوئی بے حسی نے گھیسو اور مادھو کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ وہ صرف اور صرف اس لیے ایک دردِزہ سے تڑپتی ہوئی عورت کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب وہ مرے گی تو گاؤں والے اس کے کفن دفن کے لیے رقم دیں گے جس سے چار پانچ دن اچھے گزر جائیں گے۔

افسانہ نگار اگلے حصہ میں بدھیا کی موت کی خبر سناتا ہے۔کہانی کے سارے تانے بانے اسی عورت کے گرد بنے گئے ہیں جب کہ اس کا عملی وجود کہیں نظر نہیں آتا، صرف اس کی دل خراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔افسانہ کے ابتدا میں کش مکش اور اس کے ابتدا میں اعصابی تناؤ کا آغاز جن چیخوں سے ہوتا ہے انجام کار اس کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ بدھیا کی

بے کس موت قاری کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

''صبح کو مادھو کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھی، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھی۔ سارا جسم خاک لت پت ہو رہا تھا، اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا''

بدھیا افسانہ کا اہم ترین کردار ہے، اس کی موت کے بعد بھی اس کا تعلق بدستور افسانا سے قائم رہتا ہے اور اس تعلق سے تمام تشکیلی عناصر گرم رہتے ہیں۔ بدھیا کی موت نے دونوں کرداروں کو متحرک کر دیا ہے، اس کی زندگی میں صرف باتیں بنانے والے اس کے مرنے کے بعد اتنے چاق و چوبند ہو جاتے ہیں کہ ایک گھنٹہ کے اندر پانچ روپئے کی رقم چندہ سے جمع کر لیتے ہیں۔

سریت کا عنصر افسانہ میں ابتدا ہی سے تجسس کو بیدار رکھتا ہے لیکن آخری حصہ میں اس کا غلبہ اس حد تک ہوتا ہے کہ قاری افسانہ کے ہر آنے والے لمحہ کو جاننے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ افسانہ کے اس حصہ کا مکمل انحصار باپ بیٹے کے مکالموں پر ہوتا ہے۔ ان مکالموں کے سہارے سے افسانہ تیزی سے تمام مراحل طے کرتا ہوا انجام کو پہنچتا ہے اور کرداروں کی تہہ دار شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ پریم چند نے ان موقع پر ان کرداروں کے ذریعہ سماج کے عقائد، توہمات اور رسم و رواج پر بڑے معنی خیز انداز میں سخت ضرب لگایا ہے اور اس پورے معاشرے پر طنز کیا ہے جو ان کی خستہ حالی کا اصل ذمہ دار ہے۔ گھیسو کے لفظوں میں:

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھرا بھی نہ ملے اسے
مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔ یہی پانچ روپئے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔
کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا''

دونوں باپ بیٹا کفن نہ خرید کر رسم و رواج کو موضوع سخن بناتے ہوئے اس پر لعن طعن کرتے ہیں، کفن کی اہمیت کم کرنے کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پیسے آ جاتے تو دنیاوی قدروں کو پامال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کی سوچتے ہیں۔ دونوں بازار پہنچ کر ایک شراب خانے میں خاموشی سے اندر داخل ہوتے ہیں۔ گھیسو ایک بوتل شراب اور کچھ گزک خریدتا ہے اور دونوں پینے بیٹھ جاتے ہیں۔ شراب ان کو سرور میں لے آتی ہے تو گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ آدھی بوتل ختم ہو جاتی تو کھانے کا سامان منگا لیتے ہیں۔ دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے پوڑیاں

کھار ہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے ہی طے کر لیا تھا۔

پریم چند نے ان دونوں افراد کو افسانہ میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر وقت کے اہم ترین مسئلہ کی جانب قاری کو متوجہ کیا ہے اور ایک نقیب کے فرائض انجام دئے ہیں۔ ان دونوں کی کردار سازی چند سالوں کا نتیجہ نہیں بلکہ صدہا صدیوں کی مرہون منت ہے۔ نسلا بعد نسل ان کا موجودہ وجود عمل میں آیا ہے۔ ان کی تشکیل اس سماج نے کی ہے جو دنیاوی اخلاق وضابطوں سے پوری طرح بندھی ہوئی ہے اور اعلیٰ قدروں کی آڑ میں ہر طرح کا ظلم ان پر روا رکھتی ہے۔

افسانہ کا تناؤ اور کلائمکس اس وقت اپنے انتہائی نقطے کو پہنچتا ہے جب وہ دونوں کفن نہ خرید کر ساری رقم شراب و کباب میں اُڑا دیتے ہیں اور بدمستی کی حالت میں سماجی قانونوں اور مذہبی و اخلاقی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں، اس کے کھوکھلے پن پر طنز کرتے ہیں، اس کی منافقت اور مصلحت پسندی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا اگر شراب ان دونوں کو مغلوب نہ کرتی، وہ بدمست ہو کر ناچتے گاتے، ہوش وحواس کھو کر گر پڑتے اور رہ جاتے ہیں۔ اس طرح افسانہ اپنے انجام کو پہنچ کر قاری کو حیرتوں کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیتا ہے جہاں وہ بے کراں سناٹے اور تنہائی میں خود کو گھرا پاتا ہے اور اس کا ذہن تاریخ کے اس انسانی المیہ میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

آزادی سے قبل ہندوستان کے عہد غلامی کے ادیب اور طلوع ہوتی ہوئی آزادی کے نقیب ہیں۔ اُس دور کے مسائل اور ان کے تقاضے مخصوص تھے۔ آج ان میں نمایاں فرق آچکا ہے، وسائل میں اضافہ، تعلیم میں وسعت، اندازِ فکر میں تبدیلی، سماجی قدروں میں سدھار آزاد ہندوستان کا عطیہ ہے۔ پریم چند کی تحریریں اپنے وقت کے تقاضوں کی آئینہ دار اور ایک فنکار کے دل کی دھڑکن ہیں۔ ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے ضرور ہی ہے کہ پریم چند کے ذہن کے ان دریچوں سے گزریں جن سے ہو کر مختلف افکار ونظریات نے ان کی تخلیقات کو جنم دیا۔ وہ حالات وحادثات جن سے پریم چند دوچار ہوئے جب اس فنکار کی گرفت میں آئے تو ادبی ملبوسات کا ایسا مظہر بنے کہ لاکھوں ذہنوں کے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوئے۔

آزادی سے قبل ہندوستانی معاشرے کی صورتِ حال، طبقاتی تفریق، رسم ورواج کے نام پر ظلم وستم اور اس جیسے بیشتر موضوعات کو اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنی ندرت کے ذریعہ جن نکتوں کو انہوں نے اجاگر کیا کوئی دوسرا فنکار اس

جانب اتنی بھرپور توجہ نہیں دے سکا۔انہوں نے زمین داروں، مذہبی ٹھیکیداروں اور مہاجنوں کے استحصال پر کھل کر لکھا ہے۔ ہریجنوں کی حالتِ زار، خواتین کی سماجی حالت، یتیموں کے احوال اور تعلیم سے بے گانگی جیسے موضوعات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ان کی خواہش تھی کہ عوام ان مسائل کے بھیانک نتائج سے واقف ہو کر اپنا دائرۂ فکر و عمل تبدیل کر لیں۔اس کے لیے انہوں نے اپنے افسانوں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے عملی زندگی میں بھی اس عظیم افسانہ نگاری کی وابستگی رہی ہے۔

پریم چند کی فن کی ایک بڑی قوت ان کی سادہ و سلیس زبان اور شفاف و بے تکلف طرز تحریر ہے۔انہوں نے بول چال کی عام فہم زبان کو تخلیقی زبان کا درجہ عطا کیا اور افسانوی ادب کو ایک ایسا جاندار اور شگفتہ اسلوب دیا جو تصنع، تکلف اور ہر طرح کی بناوٹ سے پاک ہو۔انہوں نے معاشی اور معاشرتی مسائل کو لوگوں کے سامنے اجاگر کیا، ہندوستانی دیہی موضوعات کے ساتھ متوسط طبقہ کی زندگی پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا، ان کی تحریر میں محنت کشوں کا درد اور دبے کچلے طبقے کا کرب جھلکتا ہے۔غریب طبقہ کو مزید غربت میں دھکیلنے والوں کے لیے غصہ ہے، ظلم و زیادتی کے شکار ہونے والوں کے لیے رنج ہے، الغرض ان کی تخلیقات میں وہ سارے جذبات پایے جاتے ہیں جو حقیقت کی عکاسی اور بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ان کی تحیروں میں جذبات نگاری کے ساتھ مقصدیت بھی ملتی ہے۔انہوں نے دیہات کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، وہاں کے حالات کو پرکھا، کرداروں کو بہترین الفاظ کے ساتھ پیش کیا اور مختلف مسائل سے دوچار ہونے کے بعد بھی قلم کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔افسانے کی روح سے لے کر الفاظ کے انتخاب تک انہوں نے اردو ادب کو بہترین ذخیرہ دیا۔ایک دردمند دل رکھنے کی وجہ سے انہوں نے ہر عہد کی تبدیلیوں کو بخوبی محسوس کیا اور ان ہی سارے احساسات اور جذبات کو افسانوں کے ذریعہ صرف ادبی دنیا میں نہیں بلکہ ادب سے تعلق نہ رکھنے والس کے دلوں میں بھی اپنا گھر کیا۔۱۹۳۴ء میں اپنے ایک خط میں پریم چند نے افسانہ کے واقعاتی اور نفسیاتی عنصر کو خاص اہمیت دی ہے۔وہ کہتے ہیں۔

> ''اعلیٰ ترین مصنف وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی جایے۔نیک باپ کا نالائق اولاد کی زبوں حالی میں رنجیدہ ہونا ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔اس جذبات میں باپ کی ذہنی ہیجانی کیفیات اور اس کے

مطابق اس کے ردعمل کا مصوری بھی افسانہ کو مؤثر اور پرکشش بنا سکتی ہے۔ برا شخص بالکل ہی برا نہیں ہوتا۔ اس میں فرشتہ ضرور کہیں چھپا ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی حقیقت ہے اس پوشیدہ یا خوابیدہ فرشتہ کو ابھارنا اور اس کے سامنے لانا ایک کامیاب افسانہ نگار کا شیوہ ہے۔ پے در پے مشکلات آنے پر انسان کتنا دلیر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑے سے بڑے خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے، اس کا خوف جاتا رہتا ہے، اس کے دل کے کسی گوشہ میں پوشیدہ جوہر نمایاں ہو جاتے ہیں اور ہمیں متعجب کر دیتے ہیں یہ ایک انسانی حقیقت ہے"

ان کا پہلا افسانہ ابتدائی تخلیقات جیسے جیسے موضوع سے وابستگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کے ظاہر و باطن میں پوشیدہ راز ان پر کھلتے جاتے ہیں۔ ان کی فکر میں گہرائی اور نظر میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس موضوع میں امکانات کی کوئی امق باقی رہتی ہے۔ افسانہ کی وادی سے نکل کر جب ہم ناول کی وادی میں قدم رکھتے ہیں یہاں بھی پریم چند کا نام گونجتا ہے۔ پریم چند اردو کے عدیم المثال ادیب ہیں جن کے افسانوں اور ناولوں میں جیتے جاگتے کردار اور جانی پہچانی زندگی ملتی ہے۔ وہ زندگی کی خوبصورتی کو بھی دیکھتے ہیں اور اس کی بدصورتی کو بھی لیکن وہ بدصورتی سے نفرت نہیں کرتے ہیں بلکہ اس بدصورتی کو خوبصورتی میں بدلنے کے کوشاں رہتے ہیں۔ اردو میں ناول نگاری کے آغاز کا سہرا مولوی نذیر احمد کے سر جاتا ہے لیکن ان کے ناول فن ناول نگاری کے لحاظ سے مکمل ناول کا نام نہیں دے سکتے۔ یہ درست ہے کہ ان کے ناول بھی روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے پر ہیں لیکن پند و نصائح کی چہار دیواری سے نہیں نکل پا رہے ہیں، ان کے پیش نظر اصلاح معاشرت اور تعلیم نسواں ہے اور ان ہی بنیادوں پر انہوں نے ناول کی عمارتیں کھڑی کی ہیں۔

پریم چند خود اپنے تخلیقات کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ میں اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعہ کے اظہار کے

لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا ہوں۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین گتیار ہونے پر میں کریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ تخلیقی وجود میں نہیں آتا جب تک وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے''۔

پریم چند کے افسانوں کے عہد حاضر میں بھی وہی اہمیت وافادیت ہے جو پہلے تھی بلکہ ان کی قدر و قیمت میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ پریم چند کا تخلیقی عمل، ان کی فکر اور جن ارتقا کے مراحل سے دوچار ہو کر ادبی سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے۔ ان کے افسانوں کو تاریخ وار سامنے رکھ کر اردو افسانہ کی تاریخ ترتیب دی جاسکتی ہے اور ان کے افسانوں کو الگ کرنے پر یہی بات ناممکن بن جاتی ہے۔

پریم چند کو اپنے وطن اور اس کے اندر رہنے بسنے والے عام انسانوں سے نہ صرف پیار ہے بلکہ عشق بھی تھا۔ یہی جذبہ ان کو ادب کی پر پیچ رہ گزر پر لے آیا اور انہوں نے اسے سنجیدگی سے برت کر ملک اور قوم کی خدمت کا وسیلہ بنایا۔ اسی جذبہ نے ان کو اصلاحی وفلاحی نظریات سے ہمکنار کیا۔ یہ نظریات جب ان کے افکار سے لپٹ کر، ان کی قوت مشاہدہ کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتے تو ان کا نوک قلم ایسے فن پاروں کی تشکل کرتا جن میں اس عہد کے ہندوستان کی بڑی واضح اور حقیقی تصاویر ابھر کر سامنے آجاتیں۔ مختلف کرداروں کے روپ میں ہندوستانی عوام اپنی اصل وضع قطع پر نظر آتے ہیں۔ پریم چند بہت سے ادبی تجربات سے دوچار ہوئے۔ ان کے افکار پر خارجی وداخلی محرکات اثر انداز ہوتے رہے۔ نظریات میں تبدیلی آتی رہیں، ملکی وقومی معاملات، ضروریات اور مفادات ان کے پیش نظر رہے، بدلتے ہوئے حالات اور ان کے تقاضے، ان کے ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہے اور ان کا تخلیقی عمل ان تمام محرکات کے زیر اثر ارتقا کے تدریجی مراحل سے گزر کر فن پاروں کو ڈھالتا رہا۔ انہوں نے اپنے فن پاروں کے توسط سے بے شمار ملکی معاملات اور سماجی مسائل کے لیے قومی سطح پر رائے عامہ ہموار کی اور ادب کو ایسے زندہ فن پارے عطا کیے ہیں جو کسی ایک زمانے کے لیے مخصوص نہیں ہیں اور نہ ہی کسی طبقۂ خاص سے ان کو منسلک کیا جاسکتا ہے۔ وہ بچھڑے، دبے کچلے لوگوں کے مسیحا اور ان کی زندگی سے وابستہ مسائل کے ادیب ہیں۔ اپنی کہانی کے تانے بانے اکثر دیہی علاقوں میں تیار کیے اور کرداروں کا

انتخاب ان جانے پہچانے افراد سے کرتے ہیں جن کا کہانی کے ماحول سے گہرا ربط ہو۔

پریم چند اردو نثر نگاری کی تاریخ میں اتنے اہم مقام کے مالک ہیں کہ ان کا نام علیحدہ کر لینے پر اردو افسانہ نگاری کی روایت سے واقفیت حاصل کرنا ناممکن ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف اردو افسانہ کے بانیوں میں سے ہیں بلکہ انہوں نے اردو افسانے کو اس مقام تک پہنچایا ہے جو ادبی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آج بھی اردو افسانہ ان کی نشاندہی اور روایت پر چل کر نئی راہوں کا متلاشی ہے۔ان کی ادبی حقیقت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ سے عوام کے مسائل سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔ بڑ کے ے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ، بوڑھی کا کی، عیدگاہ، حج اکبر، پنچایت، نجات، شطرنج کی بازی اور کفن جیسے افسانے اردو کے افسانوی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ پریم چند کی تمام تخلیقات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ ابتدا ہی سے ادب برائے زندگی کے قائل رہے ہیں۔ان کے پیش نظر ہمیشہ قوم وملک کی اصلاح اور ترقی رہی۔انہوں نے اپنا تخلیقی سفر اس زمانے میں شروع کیا جب ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔زمیندار، تعلقدار، نواب، راجہ، مہاراجہ درجی بدرجہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے عام رعیت اور کسانوں کا مختلف جہتوں سے استحصال کر رہے تھے۔سماج کا ہر شخص اپنے سے کمزور کو دبا رہا تھا۔اس طرح ملک غلام در غلام بنا ہوا تھا۔ باہمی یگانگت کے فقدان نے سماج کے آپسی رشتوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ غیر ملکی صنعت کاروں کی بدولت سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں آچکا تھا۔ یہ غیر ملکی حکمرانوں کی حکمت عملی تھی کہ ملک می بہ یک وقت جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی بنیادوں کو اس طرح مضبوط کیا گیا کہ اس کا اقتصادی، سماجی اور اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہوکر رہ گیا۔ مساوات کا فقدان تھا،، مشترکہ تہذیب دم توڑ رہی تھی۔متوسط طبقہ کا وجود خطرے میں تھا، کمزور اور غریب اس طرح ٹوٹ چکے تھے کہ اس میں فریاد کرنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بے بسی اور یاس کے اس ماحول نے کچھ ایسی غیر انسانی رسوم کو جنم دے دیا کہ سماج کا ایک طبقہ خصوصا اور ہر طبقہ کے کچھ افراد عموماً جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور تھے۔سالہا سال کے اس استحصال کے نتیجے میں پورا معاشرہ سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ان حالات نے مفکرین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، ملک کے مختلف گوشوں میں متعدد تحریکیں جنم لینے لگیں، اصلاح کے لیے کچھ نے مذہب کو اولیت دی، کچھ نے سماجی فلاح و بہبود کو مقدم جانا اور اس جانب متوجہ ہوئے۔ کچھ نے غیر ملکی تسلط کو ان حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ بہر حال نصب العین

ایک تھا، رائیں مختلف تھیں، منزل ایک تھی، راستے جداگانہ تھے۔ پریم چند ان مختلف تحریکات، افکار ونظریات سے متاثر ہوئے۔ آزادی کے حصول کی امنگ ملک وقوم کے لئے ان کے دل میں پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ اپنا زورِ قلم ملک کو آزاد کرانے میں، اپنی تحریر کے ذریعہ سے تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے، جاگیردارانہ نظام اور اس کے اندر پنپنے والی ذہنیت کا پردہ فاش کرنے، استحصال پسندوں کو بے نقاب کرنے، ذات پات کی تفریق کا انسداد کرنے، قدیم وفرسودہ رسوم کو مٹانے اور عورتوں کا ان کا سماجی مرتبہ دلانے پر صرف کیا۔ انہوں نے اپنے قلم سے حب الوطنی کی وہ روح پھونک دی کہ ہر ہندوستانی بیدار ہوگیا۔ حریت پسندی کی ایسی چنگاری سلگائی کہ غلامی کی لعنت بالآخر جل کر خاک ہوئی اور ملک آزاد ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں وہ افادیت کے قائل تھے اور فن پاروں کو بھی افادیت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

پریم چند کو بیسویں صدی کے ابتدائی اور انیسویں صدی کے آخری دور کا انسان سمجھنا چاہیے۔ ان کے شعور کی تشکیل میں ان اصلاحی تحریکوں کا ہاتھ تھا جن کی ابتدا غدر کے کچھ دن پہلے ہو چکی تھی اور جو بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پھل پھول لا رہی تھی۔ وہ ایک دیہی باشندہ تھے اور نچلے متوسط طبقے کا ایک خاندان ان کا گہوارہ تھا۔ تحصیل علم کی وہ آسانیاں جو انسانی شعور کو خاص سانچوں میں ڈھالتی ہیں پریم چند کو میسر نہ تھی۔ انہیں خود کو اپنا راستہ ڈھونڈھنا، مصیبتوں کا مقابلہ کرنا اور ہواؤں کے رخ کو سمجھنا تھا، انہیں کشمکش حیات سے لبریز سمندر میں کودنا اور زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا تھا، خود ان کی خانگی زندگی کی دشواریاں انفرادی اور خاندانی زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر خاص طرح بنا رہی تھی۔ ابتدائی دور کا ہندوستان نہ تو وہ زوال آمادہ اور انحطاط پذیر ہندوستان تھا جو انیسویں صدی کے وسط میں تھا اور نہ وہ ہندوستان جو خود اعتمادی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوا۔ یہ ایسا عہد تھا جب کعبہ اور کلیسا دونوں اپنی اپنی جانب دامن کھینچ رہے تھے اور لکھنے والوں کا رومانی بن جانا بھی ممکن تھا اور حقیقت پسند بھی۔ پریم چند نے اسی الجھی ہوئی دنیا کو اپنی ذہانت، ہمدردی، خلوص اور وسیع النظری سے سمجھنے کی کوشش کی اور ہر اچھے ادیب کی طرح انتشا میں تنظیم بدحالی میں حسن اور الجھنوں میں سلجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اردو ادب میں حقیقت نگاری کی تحریک اپنی ابتدائی شکل میں حالی اور آزاد کے یہاں شروع ہو چکی تھی لیکن جس طرح ہندی ادب پر چھایا واد کی چھاپ لگی ہوئی تھی اسی طرح اردو ادب میں تصور پرستی کا وجود پایا جاتا تھا۔ پریم چند نے سب کچھ آنکھیں کھول کر دیکھیں اور سب کچھ اپنی قوت دماغی سے سمجھا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے یہاں حقیقت اور تخیل کاری کا جو میل جول ہے وہ کوئی ناقابل فہم متضاد صورت

حال پیش کرتا ہے۔ بلکہ اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کی حقیقت پسندی نے ان کی تصور پرستی سے سمجھوتا کر لیا تھا اوران دونوں کے میل سے ان کا فن غذا پارا تھا۔ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا اور زندگی کی حقیقتیں واضح ہوتی جاتی تھی پریم چند اتنا ہی حقیقت کی طرف بڑھتے جاتے تھے اوران کے شعور میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی جاتی تھی۔ ناولوں میں ان کا آخر کا ناول ''گئودان'' اور کہانیوں میں تقریباً آخری کہانی ''کفن'' اس کی مثالیں ہیں۔

3.6 پریم چنداور ترقی پسند تحریک

پریم چند کی ترقی پسندی کا مطالعہ بیسویں صدی کا سیاسی اور سماجی شعور کا مطالعہ ہے۔ سوشلزم کے سائنٹفک اور رومانی تصورات جنگ آزادی کی نوعیت پر اثر انداز ہو رہے تھے اور ہندوستانی سیاست کا رشتہ بین الاقوامی سیاست سے جڑ رہا تھا۔ پریم چند نے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے کر سامراج کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے برطانوی استبداد کو تیز روشنی کے سامنے لا کر کھڑا کیا، انہوں نے گانگریس کے اعتدال پسندوں کے مقابلے میں ''گرم دل'' یعنی انتہا پسندوں کی حمایت کی اور آہستہ آہستہ سوشلزم کے قریب آ گئے۔ جب کہیں ان کے یہاں زمیندار اور کسان کے کا تصادم ہوا ہے تو ان کی ہمدردیاں کسان کے ساتھ ہی ہیں۔ جب ساہوکار اور کسان کی کشمکش رہی ہے تو وہ کسان کے ساتھ رہے ہیں، برہمن نے جب غریب دیہاتی کو لوٹنا چاہا تو انہوں نے دیہاتی کا ساتھ دیا ہے۔ جب سرمایہ دار اور مزدوروں کا مقابلہ ہوا ہے تو وہ مزدوروں کے ساتھ دکھائی دیے ہیں، حاکم اور محکوم کے جھگڑے میں وہ اپنی ساری دماغی اور جذباتی طاقت کے ساتھ محکوم کے حقوق کے علمبردار نظر آتے ہیں، مختصر یہ کہ جہاں کشمکش نے طبقائی اختلاف کی شکل اختیار کر لی ہے وہاں انہوں نے زبردست اور ظالم طبقے کے مقابلے میں محکوم اور کمزور طبقے کی طرف سے آواز بلند کی ہے۔ یقیناً ان کا یہ طبقاتی شعور تاریخ کا مادی شعور رکھنے والے تاریخ داں کا شعور نہیں ہے جو طبقوں کی کشمکش کے اساسی اصول کو سمجھتا ہے بلکہ اس انسان دوست فنکار کا تصور ہے جس کا مشاہدہ تیز اور جس کا شعور انصاف پسند ہے۔ اس طرح پریم چند اپنے دور کے شعور کے ان پہلوؤں کے ترجمان ہیں جو غلامی پر آزادی کو، قدامت پرستی پر اصلاح کو، تنگ نظری پر بلند نگاہی کو، طبقاتی جبر و ظلم پر، انصاف اور مساوات کو سامراج یا آمریت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے مقامات ایسے آئیں گے جہاں پریم چند کے خیالات واضح نہیں ہیں یا جہاں انہوں نے حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کی ہے لیکن ان کا فن مجموعی طور پر پڑھنے والے پر بھی اثر ڈالتا ہے کہ ملک کی عوامی زندگی کو ابھارنے اور بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کے ترجمان تھے۔ اس خاص دور حیات میں زندگی کے صرف انہیں تقاضوں کو پورا کرنا ترقی پسندی کی دلیل بن سکتا ہے۔ آج جب ہندوستان اپنا مستقبل بنانے کے لئے آزاد ہے۔ ترقی پسندی کے مطالبے دوسرے ہیں لیکن جس ہندوستان نے پریم چند کے شعور کی تربیت کی تھی اس کی بنیادیں جد وجہد کی بنیادیں آج ی جد و جہد سے مختلف تھیں۔ پریم چند کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ اشتراکیت یا ماکسزم کا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن ان کے تجربوں نے ان میں وہ سماجی شعور پیدا کیا جہ طبقاتی تجزیہ کا محرک بنتا ہے۔ اسی سلسلہ میں حقیقت نگاری نے ان کی مدد کی۔ وہ ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں میں ہر قسم کے لوگوں سے واقف تھے اگر چہ ان کے گہرہ واقفیت ہندوستان کی کسانوں ہی کی معلوم ہوتی ہے زیادہ تر کسانوں کے سلسلے میں انہوں نے طبقاتی نظام پر نگاہ ڈالی ہے۔ اپنے آخری زمانہ میں پریم چند نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''مہاجنی تہذیب'' یہ مضمون کئی حیثیتوں سے مطالعہ اور غور کرنے کے لائق ہے۔ کیوں کہ ان سے جہاں ان کی ترقی پسندی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ان کی ذہنی تضاد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ سرمایا دارانہ تہذیب کا مقابلہ جاگیردارانہ تہذیب سے کرتے ہوئے پریم چند نے سرمایہ داری کے غیر انسانی رویے اور لوٹ کھسوٹ کی پورے جوش کے ساتھ مذمت کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ جاگیرداری کے مظالم اور عیوب کو نہ دیکھ سکے۔ کیوں کہ جاگیردارانہ تمدن میں انہیں قدیم ہندوستان کے راجپوتی دور کی وہ خصوصیتیں نظر آتی تھی جنہیں وہ عزیز رکھتے تھے اور قومی کردار کی تعمیر کے لئے جنہیں وہ ضروری خیال کرتے تھے، سامنتی دور میں رحم دلی سخاوت صلۂ خدمت بہادری خودداری شرافت نفس وغیرہ کی جو جگہ تھی پریم چند ان میں زندگی کا وہ بانکپن دیکھتے تھے جو مہاجنی دور میں مفقود ہے۔

پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں یہ تمام باتیں تلاش کی جاسکتی ہیں اور ان سے بعض متضاد نتائج بھی نکالے جاسکتے ہیں کیوں کہ سیاسی اضطراب اور سماجی کشمکش کے اس عبوری دور میں پریم چند کی شخصیت بھی اپنی وفاداریوں میں بٹ گئی تھی۔ وہ سرمایہ داری کے مخالف تھے لیکن انقلاب کی آواز پوری طاقت سے اس لیے بلند نہیں کرتے تھے کہ انقلاب میں عدم تشدد کا باقی رہنا یقینی نہیں۔ وہ مزدوروں اور غریبوں کے تیر جمان تھے لیکن ان کے

حقوق حاصل کرنے کے لیے کسی انقلابی جدوجہد کے بجائے سمجھوتے اور صلح پسندی سے کام لینے کے طرفدار تھے۔ان کے دل میں کسانوں اور غریب طبقہ کا درد تھا لیکن جاگیردارانہ نظام کو مٹا کر کسان راج قائم کرنے کا حوصلہ انہوں نے اپنے کرداروں میں نہیں پیدا کیا۔''گوشۂ عافیت'' میں زمیندار کسان کشمکش کی تصویر ہے۔''چوگان ہستی'' میں سرمایہ دار اور مزدوروں کا مسئلہ ہے،''گئودان'' میں کسان مزدور سرمایہ مہاجن زمیندار برہمن حاکم سب ہی آتے ہیں اور بعض جگہ ان کے مفاد کی تصادم کی حیرت انگیز تصویریں ملتی ہیں لیکن اب سب میں اس مستقبل کا واضح نقشہ نہیں ملتا جو کسان اور مزدور اپنی محنت سے بنا سکتے ہیں تاہم کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ انگریزی سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ نظام چاہتے تھے جس میں کسانوں،مزدوروں اور غریبوں پر ظلم ہو۔

انگریزی سامراج کی کارکردگی میں ہندو اور مسلمان متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگ الگ الگ اپنی سیاسی جماعتیں بنا کر عوام کو بھی ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش میں تھے۔اس وقت متحدہ قومیت ہندو مسلم اتحاد کی آواز بلند کرنا ترقی کی طرف زبردست قدم تھا اور پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ہندوستان کی اس روح کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف مذہبوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہونے کے باوجود ایک ہے۔اس میں شک نہیں کہ اس وقت اور آج بھی قومیت کا مبہم نعرہ طبقاتی نظام کی موجودگی میں ہمیں دور تک نہیں لے جاتا لیکن اس وقت یہ نعرہ اس اتحاد کو مضبوط بنانے میں ایک زبردست آلے کی حیثیت رکھتا تھا۔پریم چند مذہب کے مخالف نہیں تھے لیکن فرقہ پرست عناصر کے دشمن ضرور تھے۔وہ ان مذہبی رسوموں اور اداروں کا مذاق اڑاتے تھے۔

جن میں خلوص سچائی اور روحانیت کی جگہ ریاکاری،عوام کی دشمنی اور نمائش کی نمود تھی۔وہ برہمن جو اپنے بھوج کے لیے عوام کا خون چوس سکتا تھا،جو مذہب کے نام پر غریبوں کو لوٹ سکتا تھا پریم چند کے تیروں کا ہمیشہ نشانہ بنا جو مذہبی رسمیں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی تھیں پریم چند ان کی مخالفت کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔انہوں نے اچھوتوں کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے حقوق کی حمایت میں کہانیاں بھی لکھی ہیں اور ان میں اس انسانیت کے جلوے دیکھے اور دکھائے ہیں جو انہیں دوسروں میں نظر آتے ہیں۔

3.7 خلاصہ

پریم چند کا ذہن ارتقا پذیر تھا، ان کا فن حالات کے ساتھ ترقی کر رہا تھا، ان کے خیالات واقعات کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے، وہ ہندوستانی عوام کے روح میں اتر کر ان کے دکھ درد، ان کے کرب واضطراب، ان کی مایوسی اور امید کے خوابوں اور خیالوں کو دیکھ سکتے تھے، وہ انہیں اس جال سے نکال کر ایک بہتر زندگی کا خلعت دینا چاہتے تھے جس میں وہ صدیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ براہ راست عوام کے پاس گئے اور ان کی تکلیفوں اور خوشیوں میں شریک ہوئے، انہون نے عوام کے مقابلے میں دوسرے طبقات کے مظالم کا پردہ چاک کیا۔ وہ طبقات کے ختم ہونے سے بہتری کے جو امکانات تھے ان پر نظر نہ ڈال سکے لیکن عوام کا ساتھ انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ اسی وجہ سے ان کی انسان سے محبت، ان کی عوام دوستی، ان کی بلند نگاہی کے مجموعی اثرات کے سامنے ان کا بعض قدیم تصورات کو عزیز رکھنا ایک معمولی سی چیز بن جاتا ہے۔ پریم چند ہماری ترقی پسندی کی روایت کا ایک بہت ہی اہم زینہ بن جاتے ہیں۔ پریم چند اردو نثر نگاری کے اہم ستون ہے۔

3.8 فرہنگ

منحرف ۔ باغی

فہم ۔ سمجھ

متضاد ۔ خلاف

تشکیل ۔ ترکیب، بناوٹ

استحصال ۔ چھین لینا

اضطراب ۔ بےقراری

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ پریم چند کے حالات زندگی پر ایک نوٹ لکھے؟

۲۔ پریم چند کے ادبی خدمات کو بیان کرے؟

۳۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھے؟

۴۔ پریم چند کے ناول نگاری کے بارے میں لکھے؟

3.10 حوالہ جات وسفارش کردہ کتابیں

'زمانہ' پریم چند نمبر۔ مرتبہ۔دیانرائن نگم ،قومی کونسل برائے فروغ اردو،نئی دہلی

پریم چند کے مختصر افسانے۔ مرتب رادھا کرشن

افسانہ نگار پریم چند،تنقیدی وسماجی محاکمہ۔ مصنف عظیم الشان صدیقی

منشی پریم چند،شخصیت اور کارنامے۔ ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند:ایک نقیب۔ ڈاکٹر صغیر افراہیم

پریم چند سے قبل اردو ناول

سبق کی ساخت:

4.1 تمہید

4.2 مقاصد

4.3 پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری کے نقوش

4.4 پریم چند سے قبل اردو ناول نگار

4.4.1 مولوی نظیر احمد

4.4.2 الطاف حسین حالی

4.4.3 پنڈت رتن ناتھ سرشار

4.4.4 عبدالحلیم شرر

4.4.5 محمد علی طبیب

4.4.6 منشی سجاد حسین

4.4.7 مرزا عباس حسین ہوش

4.4.8 مولانا راشد الخیری

1.4.9 مرزا محمد ہادی رسو

4.5 خلاصہ

4.6 فرہنگ

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

4.8 سفارش کردہ کتابیں

4.1 تمہید

پریم چند یا پریم چند سے قبل کا دور اخباروں اور رسالوں کا دور تھا۔ اس وقت زیادہ تر ادبی تخلیقات رسالہ اور اخباروں کے ذریعہ ہی منظر عام پر آیا کرتی تھی۔ اردو ناول میں پریم چند کے قبل جن فنکاروں کی نمایاں حیثیت حاصل ہیں ان میں نذیر احمد، سرشار، شرر اور رسوا نام اہم ہیں۔ اس دور میں انھیں ہستیوں کا بول بالا رہا اور انھوں نے ہی اردو ناول نگاری کو سمت دیا اور فن کے معیار کو متعین کیا۔ ان کی اہمیت اور خصوصیت اس دور کی اہمیت اور خصوصیت ہے۔ لیکن اس ساتھ ساتھ کچھ دوسرے ادیب بھی اس دور میں تھے جنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور ان کے بھی کچھ تصنیفات اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن اس دور کے ناول نگاری کے اصل ہیرو شرسار، شرر، اور رسوا ہی دکھائی دیتے ہیں۔ باقی ناول نگاران کے نقش قدم پر چلتے یا ان کی پیروی کرتے معلوم پڑتے ہیں۔

4.2 مقاصد

اس سبق کے بعد آپ

اردو ناول نگاری کے آغاز وارتقا سے واقف ہو جائیں گے۔

پریم چند سے قبل اردو ناول نگاروں کے بارے میں جان جائیں گے۔

اردو ناول نگاری کی تنقیدی تاریخ سمجھ جائیں گے۔

4.3 پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری کے نقوش

پریم چند کے قلم اٹھانے سے قبل اردو ادب میں ناول کا سنگ بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ انیسوی صدی میں

ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حلقہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی وہ فکری اور تہذیبی سطح پر کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ مغربی واقداری سیلاب بھی آیا جو سماج اور ادب پر گہرا اثر ڈالا اور لوگوں کے طرز فکر، احساس اور طرز عمل کو تیزی سے تبدیل کرنے لگا۔ اس ماحول نے زندگی اور معاشرے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی دنیا میں بھی اہم تبدیلیاں لائی۔ ان تبدیلیوں نے اس دور کے قلم کاروں کو اس بات کا احساس دلایا کہ بدلتے حالات میں صرف خیالی ادب سے کام نہیں چلنے والا اسے حقیقت پسندانہ ادب میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ ادب کو اپنے عہد کے معاشرے سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہی خیال اس دور کے ادیبوں کو داستانوں کے خیالی قصوں اور کہانیوں سے باہر نکلا اور حقیقی زندگی سے روبرو کرایا۔ انھیں ادب کے افادیت اور مقصدیت کا احساس دلایا۔ پھر ادب کے ذریعہ سماجی اور تہذیبی اصلاح کا کام شروع ہوتا ہے۔ اور یہی سے اردو ادب ہندوستان کی اجتماعی زندگی اور شعوری کی خاموشی سطح پر ناول نگاری کے طرف اپنا قدم بڑھاتا ہے۔

4.4 پریم چند سے قبل اردو ناول نگار

4.4.1 مولوی نظیر احمد۔ مولوی نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں مراۃ العروس لکھ کر ناول کے طرف پہلا قدم بڑھایا۔ اسے اردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس بات کو لے کر اردو ادب میں کافی بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے کہ مراۃ العروس اردو کا پہلا ناول ہے یا نہیں۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ اس ناول میں جتنی بھی خامیاں ہوں یہ ناول کے فنی تقاضوں اور اجزا پر بھلے ہی پرے طور پر خرا نہ اترتا ہو لیکن بلا آخر اسے اردو کے پہلے ناول کے طور پر مقبولیت حاصل ہے۔ اور اس کے بنیاد پر مولوی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں مولوی نذیر احمد نے دو بہنوں اصغری و اکبری کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ جس میں ایک اخلاق منداور نیک سیرت ہے تو دوسری نہایت ہی بدتمیز اور بدزبان ہے۔ دونوں بہنوں کے قصے لکھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے مذہبی اور معاشرتی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ اس قصے کو لکھنے کے پیچھے مصنف کا مقصد سماجی و معاشرتی اصلاح تھا اس لئے یہ میں ناول کے فنی تقاضے مجروح ہو گیا ہے اور اس میں کئی خامیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ان خامیوں کو اس لئے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس قصے کے ذریعہ نذیر احمد نے اردو ادب میں

ناول کا بنیاد ڈالی۔اس سے پہلے اردو ادب میں ناول کا نشان نہیں ملتے ہیں۔اس کے بعد انہوں نے بنات النعس ،توبتہ النصوح ابن الوقت، رویائے صادقہ اور ایامی لکھا۔ان تمام کہانیوں میں مولوی نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان سب میں سماجی و معاشرتی زندگی کی سچی تصویر پیش کی اور اردو ادب کی کہانیوں کو بھوت، جن، پری جیسے مافوق الفطری عناصر سے باہر نکالا اور ایک عام انسان کے حالات زندگی کو بیان کیا۔انھوں نے اپنے اپنے ناولوں میں بڑی جرات اور بے باکی کے ساتھ اس دور کے معاشرتی حالات اور واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔

جذبہ اصلاح مولوی نذیر احمد کے تمام ناولوں میں کارفرما ہے۔ان کا عہد اصلاحی تحریکات کا دور تھا۔ان کی ناول نگاری انھیں اصلاحی تحریکات کی پروردہ ہے۔اس لئے ان کا ہر ناول کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کے تحت لکھا گیا ہے۔ "مراۃ العروس" اور "بنات النعس" لڑکیوں کی تربیت پر زور دینے کے لئے لکھے گئے ہیں۔تو وہی "توبتہ النصوح" کا پیغام والدین خود کو اپنے اولاد کے لیے مثالی بنے اور انھیں دین دار بنائے۔ "ابن الوقت" میں غلا مانہ ذہنیت رکھنے والے ہندوستانیوں کو بتایا گیا ہے کہ انگریزوں کی نقالی کر کے صاحب بہادر بننا چاہو گے تو ذلت اور رسوائیاں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ "فسانہ مبتلا" ایک سے زیادہ شادیوں کی خرابی پر روشنی ڈالتا ہے۔ "رویاے صادقہ" میں مذہبی امور پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ جدید تعلیم سے بہرہ ور نوجوان دین سے برگشتہ نہ ہوں۔ بیوہ عورتوں کے عقد ثانی کے فائدے "ایامی" میں اجاگر کئے گئے ہیں۔

مولانا نذیر احمد پہلے ادیب ہے جنہوں نے پہلی بار امرا و سلاطین کے قطع نظر کر مسلمانوں کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو اپنے تصنیفات کا حصہ بنایا جس کی مثال دوسرے جگہ نہیں ملتا۔سید علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر نذیر احمد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تمام قصوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر کشی کی ہے۔انھوں نے جن، پری، بھوت پرت اور جادو طلسم کے سے غیر انسانی عناصر کو ترک کر کے اپنے گردو پیش کے لوگوں اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے حالات بیان کئے ہیں"۔

نذیر احمد کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں مروجہ غیر انسانی قصوں، کہانیوں کو ترک کر کے انسانی زندگی

کی سچی تصویر پیش کی کیونکہ ان کے ناولوں کا مقصد انسانی زندگی کی اصلاح تھا۔ وہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جس نے وقت اور زمانے کی رفتار کو سمجھ کر نئے حالات کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی۔ وہ نہ صرف سماجی زندگی کی اہمیت کے قائل تھے بلکہ وہ سماج کے فرد کی حیثیت سے سماجی ذمہ داری کو ادب کا مقصد قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کی تخلیق مقصدی نقطہ نظر سے کی ہے بلکہ بعض اوقات ان کا انداز بیان اور ادبی رویہ آزادانہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے ان کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

مولوی نذیر احمد کے ناولوں کے فنی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو ان کے ناولوں میں پلاٹ بلکل سادہ اور سپاٹ دیکھائی دیتا ہے۔ پلاٹ کے مطالبات اور واقعات کے ترتیب کا پورا خیال نذیر احمد نے رکھا ہے۔ ان میں نہ کوئی جدت ہے نہ دل کشی لیکن مکالمہ نگاری میں عبور ضرور دیکھائی دیتا ہے۔ بیان میں روانی، جوش اور شگفتگی موجود ہے لیکن اسلوب نا ہموار معلوم ہوتا ہے۔ ا۔ ناولوں کے کردار ہمارے ہی سماج کے جیتے جاگتے عام انسان ہے جسے وہ بہت ہی دلچسپ انداز میں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ناولوں کے کردار فطری نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ یا تو صرف نیکی کا مجسمہ معلوم پڑتے ہیں یا بدی کا مجموعہ کا نظر آتے ہیں۔ جبکہ انسانی زندگی میں ایسا ممکن نہیں کہ ایک عام انسان صرف نیک ہو یا صرف بد، ایک انسان کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا اشتراق دیکھائی دیتا ہے۔ اس لئے پروفیسر آل احمد سرور کا ارشاد فرماتے ہے کہ "ان کے کردار یا تو فرشتے ہوتے ہیں یا پھر شیطان، انسان نہیں ہوتے"۔ پھر بھی چند خرابیوں کے باوجود مولوی نذیر احمد کی کردار نگاری قابل ذکر ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سماجی بصیرت ہے۔ نذیر احمد کا قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کے ناولوں کے ذریعہ اس دور کے ہندوستانی معاشرت کے بعض اہم پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی۔ نذیر احمد نے انسانی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اسے بڑی حسن وخوبی سے پیش کر کے اردو میں صنف ناول کی بنیاد ڈالی۔

نذیر احمد نے اپنے معاشرے کے تمام پہلوؤں کا عمیق نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے ناولوں میں ناول نگاری کے ذاتی مشاہدے کی مثالیں کثرت سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے مسائل کا تجزیہ کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ اپنے تمام تر تصنیفات میں ہماری سماجی و معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر پیش کی ہے اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے حالات بیان کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے قصوں کے پلاٹ اور کردار اسی دائرے

میں محدود رکھے جس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔جس کی بنیاد پر ان کے ناول زندہ جاوید نظر آتے ہیں۔

4.4.2 الطاف حسین حالؔی

نذیر احمد کے پانچ سال بعد حالؔی کی مجالس النساء منظر عام پر آئی۔اس ناول کا بنیادی موضوع لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔اس ناول کے بارے میں صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں۔

اس کتاب کو حالی نے دو حصوں اور نو مجلسوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سمجھائی اور یہ بتایا کہ ان کی کس طرح تعلیم و تربیت کی جانی چاہیئے۔اور دوسرے میں اس پر روشنی ڈالی ہے کہ ماں کس طرح لڑکے کی عمدہ تربیت اور ابتدائی تعلیم کر سکتی ہے۔

حالؔی کے دل میں عورتوں کے لئے بڑا احترام تھا وہ چاہتے تھے کہ عورتیں تعلیم میں کسی بھی طرح مردوں سے پیچھے نہ رہیں۔وہ عورتوں کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ علم کے آگے مال و دولت کی کچھ حقیقت نہیں۔حالی کی یہ ناول اس عہد میں عورتوں کی زبوں حالی کا آئینہ دار ہے تو دوسری طرف عورتوں سے حالؔی کی ہمدردی کا مظہر بھی ہے۔صالحہ عابد حسین کے الفاظ میں "ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت کی سب سے پہلی آواز جس شخص نے بلند کی اور اس کی سماجی مظلومی کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور اس کی حمایت کا علم اٹھایا وہ حالؔی ہی ہے"۔ (یادگار حالی۔ص،۱۹۲)

4.4.3 پنڈت رتن ناتھ سرشار

مولوی نذیر احمد کے بعد اردو ادب میں اس روایت کو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے آگے بڑھایا۔رتن ناتھ سرشار ایک کشمیری پنڈت تھے۔ یہ اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔انھوں نے انگریزی ناولوں کا نخوبی بھی مطالعہ کیا تھا اور اس کی چھاپ ان کے اردو تخلیق پر دیکھائی دیتی ہے۔وہ اپنے ناولوں کی تخلیق شعوری طور پر کی ہے۔ان کے تمام ناول زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہے۔ڈاکٹر قمر رئس لکھتے ہیں:

"نذیر احمد اردو ناولوں کو جو نہ دے سکے وہ سرشار نے دیا۔ سرشار کا زمانہ اگر چہ
نذیر احمد سے زیادہ دور نہ تھا لیکن دونوں کے مزاج میں جو بنیادی فرق تھا۔
زندگی، ماحول اور حالات میں جو تفاوت تھا اس نے دونوں کے فن کے
درمیان ایک خط فاصل کھینچ دیا ہے"۔

انہوں نے جو ناولیں لکھی ان میں سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، ہشو، طوفان بے تمیزی، چنچل نار اور فسانہ آزاد اہم ہے۔ سرشار کو سب سے زیادہ مقبولیت ان کی ناول فسانہ آزاد کو ملی جو ۱۸۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔ حلانکہ فسانہ آزاد کے بارے میں کئی تنقید نگاروں کا ماننا ہے کہ یہ ناول نہیں ہے کیونکہ یہ ناول کے اجزا پر کھرہ نہیں اترتا۔ اس میں داستانوں کا اثر دیکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان ناول پر داستان امیر حمزہ کا سایہ نظر آتا ہے۔ اس کی پلاٹ کمزور اور کہانی میں طوالت نظر آتی ہے۔ لیکن اردو ناول میں مولانا نذیر احمد کے ناولوں کے بعد دیکھا جائے تو "فسانہ آزاد" میں ناول کے جھلک دیکھائی دیتی ہے۔ اس میں کردار نگاری کا جو نمونہ ملتا ہے اس کا مثال دوسرے ناولوں میں کم ہی دیکھائی دیتے ہیں۔ اس میں انہوں نے لکھنؤں کے مٹتے ہوئے تہذتب وتمدن اور اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کی سچی اور بھرپور عکاشی کی ہے۔ ان کے ناولوں کا دائرہ وسیع تر دیکھائی دیتا ہے۔ انہیں باتوں کو دیکھتے ہوئے پروفیسر وقار عظیم نے فرماتے ہے کہ:

"سرشار اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی
گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور اردو ناول کو عظمت کا پیش خیمہ کہنا
چاہیے"۔

اس خیال کی تصدیق ڈاکٹر سہیل بخاری اپنی تصنیف اردو ناول نگاری میں کی ہے۔

"اس اعتبار سے سرشار اردو کے پہلے باقاعدہ ناول نگار کہے جاسکتے ہیں"۔

سرشار چونکہ حقیقت نگار تھے اس لئے انہوں نے جو کچھ بھی اپنے اردگرد روزانہ کی زندگی میں دیکھا اسے اپنے تصنیفات میں پیش کر دیا۔ ان کے ناولوں میں لکھنؤں کے زوال پذیر تہذیب ومعاشرہ کی تصویر کشی ملتی ہے۔ چونکہ سرشار ایک محدود یا خاص معاشرہ کی عکاشی اپنے ناول میں کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کہانیوں میں زیادہ تر یکسانیت نظر آتی

ہے۔ پلاٹ سازی میں بھی وہ زیادہ محنت نہیں کرتے بلکہ لکھتے وقت فکر کرتے ہیں اور جس طرح کا پلاٹ بنتا جاتا ہے بناتے جاتے اس لئے ان کا پلاٹ کمزور اور بے ترتیب نظر آتا ہے۔ ربط و تسلسل کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے تمام تصنیفات میں طوالت اور بے توجہی دیکھائی دیتی ہے۔ سرشار کے ناولوں میں تمثیلی سیرت نہیں ملتی اور نہ ان کا معیار عشق ہی بلند ہے۔ ان کی محبت زیادہ تر ہوسنا کی ہے۔ ایسا اس لیے ملتا ہے کیونکہ سرشار ایک زوال پذیر سوسائٹی کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ اور زوال پزیر سوسائٹی کا معیار بلند نہیں ہوتا۔

اردو ناول کی تاریخ اور تنقید میں علی عباس حسینی نے لکھا ہے:

> "سرشار کی تینوں مشہور ناولوں یعنی فسانہ آزاد، سیر کہسار اور جام سرشار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اخبار کے کالموں کے لیے بغیر نظر ثانی کئے لکھی گئی ہیں اور ان کا معاوضہ انھیں کالموں کے شمارے سے ملا ہے۔ کتابی صورت میں یہ مکمل کر کے نہیں شائع کی گئی ہیں"

فسانہ آزاد میں حد سے زیادہ اطناب ہے۔ آزاد ایک رند منش، سیلانی آدمی، ایک بن بیاہی مگر تعلیم یافتہ بیگم حسن آرا پر ایک جھلک دیکھ کے عاشق ہوتے ہیں اور اس کے کہنے پر جنگ روم دروس میں شریک ہوتے ہیں۔ جب وہاں سے خرد واپس آتے ہیں تو حسن آرا ایفائے عہد کرتی ہے اور شادی ہوتی ہے۔ "سیر کہسار" کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ "جام سرشار" بہت حد تک اس عیب سے پاک ہے۔

سرشار کی کتابیں اخلاقی معیار سے زیادہ بلند نہیں۔ بقول پنڈت بشن نرائن دَر:

> "فسانہ آزاد میں اکثر مقامات غیر مذہب و عامیانہ ہی نہیں بلکہ فحش و مبتدل بھی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض حصوں میں تو بدی صاف طور پر سراہی گئی ہے۔ اور نیکی کو حماقت و ابلہی کے مترادف ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ دَر نے مجبور ہو کر خود یہ بات لکی ہے کہ سرشار کی اکثر تصانیف اتنی عریاں ہیں کہ وہ لڑکیوں کو نہیں پڑھائی جاسکتی ہیں"۔

مگر موجودہ دور میں جب زندگی میں مغربیت کا بول بالا ہے۔ اور جب ترقی پسند تحریک کے ذریعہ ادب برائے

زندگی کی بات ہو بے لگی ہے اور زندگی کے حقائق کو ادب میں پیش کرنا ادب کا مقصد بن گیا ہو تو ایسے حالات میں سرشار کی ناول فسانہ آزاد، سیر کہسار اور جام سرشار کو اخلاقی چشمے سے دیکھ کر خارج کرنا سرشار کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس لئے وقت کے ساتھ سرشار کے ناولوں کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

سرشار کی مخصوص خوبی ظرافت ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے ہنسنے ہنسانے کے لئے اور درد دل کو کم کرنے کے لئے لکھتے تھے۔ اس لیے ان کے ناولوں میں شاخی اور مذاق کا عنصر نظر آتا ہے۔ اس لئے ان کے ناولوں میں ضخامت کے باوجود دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ ان کے کردار دلچسپ اور زندہ دل ہوتے ہیں جو مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھتے ہے اور ان کے زبان پر سرشار کو دسترس بھی حاصل ہے۔ اس لئے ان کا مکالمہ نگاری باکمال نظر آتا ہے۔ ان کا زبان سادہ اور پر لطف ہوتی ہے۔ انشا پردازی اور اسلوب بیان میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کے ناولوں میں صداقت کی بو آتی ہے۔ وہ خود اپنے طرز کے موجد نظر آتے ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> "سرشار کے افسانے نذیر احمد کے قصوں سے زیادہ دقیع نہیں۔ لیکن سرشار کے قصوں میں زندگی کی پنہائی کرداروں اور اشخاص کی رنگا رنگی۔ جذبات کا تنوع اور ان سب سے بڑھ کر ظرافت اور رنگینی کی جو کیفیت ہے اس نے انھیں اردو ناول کی تاریخ میں ممتاز اور منفرد حیثیت بخش دی ہے"۔

ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کی مقبولیت کو دیکھ کر اردو کے اہل قلم کا ایک طبقہ ناول نگاری کے طرف متوجہ ہوا۔ جن میں مولانا عبدالحلیم شرر، محمد علی طبیب، سجاد حسین، مرزا عباس حسین ہوش، مرزا ہادی رسوا وغیرہ خاص اور قابل ذکر نام ہیں۔ ان سبھی نثر نگاروں نے نہ صرف ناول لکھے بلکہ اس میدان میں شہرت بھی حاصل کی۔

سجاد حسین انجم۔ سجاد حسین انجم کا نام ناول کی تاریخ میں ابھرتی مٹتی لکیروں کی طرح کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ان کی ناول "نشتر" اردو کا پہلا ناول ہے جس میں طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں سجاد حسین انجم نے طوائفوں کی زندگی کے تلخ حقائق کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ عورت کی زندگی کے ہر اس پہلو کو پیش کیا ہے جس کے وجہ سے وہ مجبور ہو کر طوائف کے پیشے کو اختیار کرتی ہے۔ جبکہ اس کے اندر کی عورت اس پیشے سے علاحدگی کی راہ تلاش کرتی ہے۔

سجاد حسین انجم کی یہ ناول ایک اصلاحی ناول ہے۔ان کا ماننا ہے کہ کوئی بھی عورت سماجی اور معاشی حالات کے دباؤ میں آ کر مجبوراً طوائف کا پیشہ اختیار کرتی ہے۔اگر معاشرہ ایسے ماحول کو ختم کر دے تو کوئی بھی عورت اس گھناونے پیشے کو اختیار نہیں کرے گی۔

4.4.4 عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر عربی و فارسی کے عالم تھے۔تاریخ میں بھی ان کا خاص ذوق وشوق تھا اور خاص کر تاریخ اسلام میں ان کو خاص دلچسپی تھی۔شرر انگلستان اور یورپ کے کئی ممالک کی سیاحت کی تھی۔سفر کے دوران انہوں نے آثار قدیمہ کو بطور خاص دیکھا جس میں اسلام کے عروج وزوال کی تاریخ پوسیدہ تھی۔اسی درمیان ان کی نظر سے "سر والٹر اسکاٹ" کے تاریخی ناول گزرے جن میں اسلام کا مذاق اڑایا گیا تھا اور عیسائیت کا فروغ کی کوشش کی گئی تھی۔ چونچہ شرر کی مذہبی جوش اور مورخانہ ذوق نے اس کا جواب دینے پر مجبور کیا جس کے وجہ سے ان کے زرخیز قلم سے کئی تاریخی ناول منظر عام پر آئے۔شرر اپنے تاریخی ناولوں کے لیے کافی مشہور ہے۔ان کی ناول "ملک العزیز ورجنا" اور "شوقین ملکہ" صلیبی جنگوں کے معرکی یاد تازہ کی۔" حسن انجلینا" میں روسیوں پر ترکوں کی فتح کا ذکر کیا تو وہی "منصور موہنا" میں سندھ کے انصاری خاندان کے واقعات کو قلم بند کیا۔"زوال بغداد" میں مسلمانوں کی آپسی لڑائی کا ذکر کئے تو ماہ ملک میں غوریوں کے عروج بیان کئے۔اس طرح فردوس بریں، عزیز مصر، فلورا فلورنڈا، فتح اندلس، فلپانہ، بابا خرمی جیسے یاریخی ناولیں لکھی جن میں دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کی حالات بیان کئے۔شرر نے بہت سارے ناولیں لکھی جو کافی مشہور ہوئے اور شوق سے پڑھے بھی گئے۔شرر کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> "شرر اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ناول کے فن کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی اور اپنے ناول کی تکمیل میں بعض اجزائے فن کا لحاظ رکھا"۔

شرر کی ناول نگاری مجموی اعتبار سے ایک جداگانہ نوعیت کی حامل ہے۔انھوں نے زیادہ تر تاریخی اور

معاشرتی ناول لکھے۔ان کو تاریخ اسلام سے غیر معمولی شغفت تھا۔لیکن ان کی کی تاریخ دانی بعض مذہبی محرکات کی مرہوم منت تھی۔انھوں نے تاریخی واقعات میں اپنی مرضی کے اعتبار سے کبھی ضرورت اور کبھی بلاضرورت الٹ پھیر کر ڈالتے تھے۔شرر کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ناول کی ہئیت کو ترقی دی اس اعتبار سے فردوس بریں ان کا بہترین ناول کہا جاتا ہے۔

شرر کے ناولوں پرغور کیا جائے تو ایسا لگتا ہے شرر بغیر رو کے لگا تار لکھے جارہے ہیں اور لکھنے میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں انہیں فنی تقاضوں کا خیال ہی نہیں رہتا ہے۔اور اس قدر لکھتے ہے کہ ناولوں کا انبار کھڑا کر دیتے ہیں۔اس لئے فراق گورکھپوری نے ان کے تخلیقوں کو" مٹی کا پہاڑ" کہا۔شرر کے ناولوں کا مطالعہ کرنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی ناولیں کے نام اور کردار تاریخی ضرور ہیں مگر ان واقعات حقائق سے دور مصنف کا من گھڑنت اور نا قابل یقین معلوم پڑتا ہے۔شرر کے ناولوں میں تاریخ کا زندہ کردار بالکل مردہ اور بے جان سا دیکھائی دیتے ہیں۔مثلاً عزیز مصر میں مصر کا کردار احمد بن طولون وائی کو ہی دیکھا جائے تو وہ ایک تاریخی حیثیت والا ایک ایسا شخص تھا جس نے دربار خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے لشکر کو شکست فاش دی لیکن شرر نے اتنی بڑی شخصیت کو اپنے تخلیق میں اس قدر معمولی بنا دیتے ہے کہاس کی شخصیت مردہ جان پڑنے لگتی ہے۔ان کے کردار داستان کے کردار کے طرح دیکھائی دیتے ہے۔پلاٹ بوجھل ہے۔

شرر نے تاریخی ناول کے ساتھ ساتھ معاشرتی ناول بھی لکھے۔لیکن دونوں طرح کے ناولوں میں یکساں خامیاں دیکھا دیتی ہے۔ان ناولوں کے کہانیوں کا بھی حقیقت سے کوئی واسطہ دیکھا نہیں دیتا۔ شرر کے متعد معاشرتی ناولوں میں دلکش، دلچسپ، خوفناک محبت، دربار حرام پور، آغا صادق، بدرالنسا کی مصیبت وغیرہ ہیں۔شرر کے تمام تاریخی ومعاشرتی ناولوں میں صرف ایک ناول جیسے کامیاب ناول کہا جاتا ہے اور وہ آج بھی مشہور ومعروف ہے، وہ ہے "فردوس بریں" جیسے آج بھی لوگ جوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہے اور اسے یونیورسیٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں شرر کی دوخوبیاں پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے ایک مرقع کشی اور دوسرا مکالمہ نگاری۔ان دونوں کا عمدہ نمونہ اس ناول میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

4.4.5 محمد علی طبیب

مولانا عبدالحلیم شرر کے دور میں ایک ناول نگار محمد علی طبیب تھے۔شرر کی طرح حکم محمد علی طبیب بھی اس زمانے کے مشہور ناول نگار تھے۔انہوں نے بھی کئی ناولیں لکھیں جو معاشرتی اور تاریخی ہیں۔انہوں نے بھی اپنے ماولوں میں فرقہ وارانہ ذہنیت کا غیر محتاط طور پر اظہار کیا ہے۔محمد علی طبیب نے اپنے تحریر کے ذریعہ بغیر مسلم اقوام کے احساسات کو قدم قدم پر پامال اور مجروح کیا۔ان کی ناول جعفر عباسہ اور خضر خاں دیول دیوی تاریخی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔لیکن ان کے ناولوں کی بھی وہی کمزوریاں ہیں جو شرر کی ناولوں کی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جو تنقید شرر کے ناولوں پر کی گئی وہی تنقید محمد علی طبیب کے لئے بھی کی گئی۔جعفر عباس پروزیر حسن دہلوی اپنے مضمون پانچ ناول نگار میں لکھتے ہے کہ اس تصنیف میں صرف پلاٹ تو محبت کی سہانی کہانی کی حیثیت سے ذرا بھلی معلوم ہوتی ہے ورنہ دوسری خصوصیتیں مثلاً کیرکٹر یا قوت اظہار دونوں اس قابل نہیں کہ زندہ چیز کہی جائیں۔پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اصلی معنوں میں اسے ناول کہا جا سکتا ہے۔میں غلطی نہیں کرتا تو ایک سمجھ دار شخص اسے ایک جذباتی چیز کہہ سکے گا۔یہی سب خامیاں ان کے دوسرے ناول میں بھی دیکھائی دیتے ہیں۔ان کے تخلیقی مہارتوں کو دیکھا جائے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ علی طبیب میں شرر سے زیادہ ناول لکھنے کی صلاحیت تھی لیکن وہ خود کو رینالڈس کی طرح کے مصنفوں کے ناولوں تک محدود کرلیا۔اگر علی طبیب خود کو ایک دائرے میں محدود نہیں کرتے تو وہ بہت سے ناولوں کا مصنف ہوتے۔

علی طبیب کی دلی خواہش تھی کہ وہ بھی شرر کے طرح مشہور ہو جائے۔اس لئے اپنے تخلیق میں علی طبیب نے شرر کی نقل کرنی شروع کر دی۔انھوں نے شرر کے ناول نگاری کے طرز پر ناول لکھنے شروع کر دئے۔شرر جب تاریخی ناول لکھے تو انھوں نے بھی تاریخی ناول لکھی اور شرر جب معاشرتی ناول کے طرف روجوں ہوئے تو محمد علی طبیب معاشرتی ناول کے اپنا روخ کرلیا۔گویا کہ وہ پوری زندگی شرر کا نقل اس خواہش میں کرتے رہے کہ مجھے بھی شرر کی طرح شہرت اور مقبولیت حاصل ہو جائے۔اسی خواہش میں انہوں نے اپنے تخلیقی کارناموں میں وہی غلطیاں کی جو شرر نے کئے تھے۔لیکن شرر کی نقل کرنے کے باوجود وہ شرر کی طرح معیاری ناول نہیں لکھ پائے۔جب بھی اردو ناول کی تاریخ کا ذکر آئے گا

ان کے ناولوں کا ذکر ضرور کی جائے گی خاص کر ان کی ناول "عبرت" کا جس میں انھوں نے میکسمین کے کردار کو زندہ جاوید بنا کر پیش کیا ہے۔ کردار نگاری میں ان کو مہارت تھی لیکن ان کی اکثر و بیشتر کہانیاں حقیقت سے دور نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کی یہ اردو ناول نگاری میں وہ مقام نہ بنا سکے جو شرر نے بنایا۔

منشی سجاد حسین۔ عبدل الحلم شرر اور محمد علی طبیب کے ہمعصروں میں سجاد حسین ایک الگ مزاج کے لکھنے والے تھے۔ سجاد حسین کو مشہور رسالہ اودھ پنچ کے روح رواں تھے اور ایک سوشل رہنما اور مزاحیہ نگار کے حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ انہوں نے جب ناول نگاری کے طرف توجہ کئے تو ایک مخصوص انداز اختیار کئے اور اسی مزاج میں ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں حاجی بغلول،، کایا پلٹ، پیاری دنیا، میٹھی چھری، حیات شیخ چلی اور احمق الدین قابل ذکر اور مشہور ناولیں ہیں۔ ان کے سبھی ناولوں میں جدت طرازی اور ظریفانہ انداز کا بول بالا ہے۔ ان کے عبارت میں بلاغت، نفاست، ساختگی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی بولی ٹھولی اور ضلع جگت کی دلدادہ ہیں۔ سجاد حسین کے ان تصنیفات اکثر ناقدین ناول کے رمزے میں نہیں رکھتے۔ محمد احسن فاروقی اپنی کتاب اردو ناول کی تنقیدی تاریخ میں اس پر سوال اٹھاتے ہیں اور کہتے ہے کہ حاجی بغلول اپنی عجیب شکل اور احمق الدین اپنی عجیب قطع کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمیشہ ہنساتے رہیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان خاکوں کے مجموعوں کو ناول کہا جا سکتا ہے یا ناول سے ان کا کوئی رشتہ ملایا جا سکتا ہے۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھیں خاکے یا مختصر افسانے کہے جا سکتے ہیں مگر ناول نہیں۔

4.4.6 مرزا عباس حسین ہوشؔ

اس ددور میں اردو ناول نگاری میں ایک اور نام مرزا عباس حسین ہوشؔ کی آتی ہے۔ مرزا عباس حسینی کا دوسرے ادیبوں کی نقل اور پیروی میں کوئی ثانی نہیں۔ انھوں نے تو نذیر احمد سے لے کر سرشار اور شرر سبھی پیروی اپنے طریقے سے کی ہے۔ اور اپنے فن کو بہتر بنانے میں لگے رہے۔ انھوں نے دو ناولیں لکھی ایک افسانہ نادر جہاں اور دوسری ربط ضبط۔ افسانہ نادر جہاں میں نذیر احمد کی تقلید ملتی ہے اور اس پر تمثیلیت طاری ہے۔۔ وہی ربط ضبط میں سرشار اور شرر دونوں کی تقلید نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ دیکھائی دیتی ہے۔ اس ناول میں فطری زور کی

کمی ملتی ہے ورنہ یہ ایک بہترین ناول ثابت ہوتی۔ ہوش اپنے ناولوں میں کرداروں کو موثر انداز میں پیش کرتے ہے جسے دیکھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں کردار نگاری میں عبور حاصل تھا۔ محمد احسن فاروقی اپنی کتاب اردو ناول کی تنقیدی تاریخ میں فرماتے ہیں کہ "مرزا عباس حسینی میں کی فطرت میں عام ذہانت تو بہت تھی۔ مگر خاص رجحان کی بہت کمی تھی اس لئے وہ اچھے نقال تو تھے مگر اپنی انفرادیت کا کوئی اثر نہ جما سکے۔ پھر بھی ان کی ربط ضبط قابل قدر ناول ہے اور اردو ناول کی تاریخ میں اس کا نام آتا رہے گا۔ ہوش اس ناول میں اس پورے دور کے تمام اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی رجحانات یک جا ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی علمی اہمیت مسلم ہے"۔

قاری سرفراز حسین عزمی۔ قاری سرفراز حسین عزمی نے سات ناول لکھی ہے جن کا عنوان شاہد رعنا، سعید، بہار عیش، سعادت، خمار عیش، سراب عیش اور سزائے عیش ہیں۔ ان تمام ناولوں کا موضوع طوائف کی زندگی ہے۔ ان میں شاہد رعنا کو بعض نقادوں نے مرزا ہادی رسوا کے امراؤ جان ادا کا نقش اول مانتے ہے۔ علی عباس حسینی اپنی کتاب ناول کی تاریخ وتنقید میں ان کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سعید ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی ایک شاہد بازاری کی زلف گرہ گیر میں گرفتاری کی کہانی ہے۔ سعادت ایک تعلیم یافتہ باسلیقہ طوائف کی پر بہار زندگی میں خزاں کا نقشہ ہے۔ شاہد رعنا ایک مہ پارہ کے خودنوشت حالات زندگی ہیں۔ بہار عیش ایک پیشہ ور کی موسیقی نوازی کا بیان ہے۔ خمار عیش ایک مست شباب وعیش کے نشہ ہرن ہونے کی سرگزشت ہے۔ سراب عیش ایک قحبۂ پیر کی عیاریوں کی داستان ہے اور سزائے عیش عشق و ہوس میں امتیاز اور ان کا درمان۔

قاری سرفراز حسین عزمی اپنے ناولوں میں دہلی کے معاشرے میں طوائف پرستی کے عام رواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند طوائف کی زندگی کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ طوائف کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کرتے ہوے ان کی نفسیاتی کیفیات اور ذہنی کشمکش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ناولوں کی بنیادی مقصد معاشرے سے اس لعنت کو ختم کرنا ہے۔ اس کے لئے صرف طوائف ہی کی اصلاح ضروری نہیں بلکہ طوائف پرستوں کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ قاری سرفراز نے اپنے ناولوں میں طوائف کے مسئلے کو ایک سماجی مسئلہ بنا کر پیش کیا ہے اور اس مسئلے کے حل کی راہ بھی دکھائی ہے۔ انھوں نے طوائفوں کی زندگی کی عکاسی اس انداز میں کی

ہے کہ ان سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نفرت اور بیزاری کا جذبہ طوائف پرستوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

4.4.7 مولانا راشدالخیری

راشدالخیری دلی کے رہنے والے تھے اور یہ مولانا نذیر احمد کے رشتہ دار تھے۔ اس لئے ان کی شخصیت پر نذیر احمد کے فکر ونظر کا اثر دیکھائی دیتا ہے۔ مولانا راشدالخیری نے کئی ناولیں لکھی اور ان ناولوں پر نذیر احمد کے نظریاتی سوچ کا چھاپ صاف صاف دیکھائی دیتی ہے۔ ان کے ناولوں میں سیدہ کا لال، جوہر قدامت، نوبت پنج روزہ، سیلاب اشک، حیات صالحہ، آمنہ کا لال، بنت الوقت، منازل السائرہ، صبح زندگی، جوہر عصمت، شام زندگی، سراب مغرب، ماہ عجم، انگوٹھی کا راز، ستونتی، اندس کی شہزادی، فسانہ سعید، خدائی راج، یاسمین شام، نانی عشو بیلہ میں میلہ وغیرہ ہے۔ مولانا کثیر التصانیف تھے۔ ان کے ناول طبقہ نسواں اور گھریلوں زندگی کی اصلاح پر مبنی ہیں۔ ان کو دہلی کی بیگماتی زبان پر عبور حاصل تھا اور ان کے ناولوں کی بیشتر کردار عورتیں ہے۔ مولانا نے عورتوں کے اصلاح کے لئے جتنے مضامین، افسانے اور ناول لکھے شاید ہی کوئی دوسرا مصنف اتنا لکھا ہوگا۔ راشدالخیری مسلم الثبوت انشاء پرداز تھے۔ ان کی عبارت میں تشبیہ واستعارہ کے ساتھ ساتھ رنگینی پائی جاتی ہے۔ پلاٹ پیچیدہ مگر غیر فطری ہوتا ہے۔ منظر نگاری کا اچھا نمونہ دیکھائی دیتا ہے۔ مکالمہ نگاری طویل لیکن غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔ علی عباس حسینی اپنی کتاب اردو ناول کی تاریخ اور تنقید میں فرماتے ہے۔

مولانا ایک اچھے ادیب اور انشا پرداز ہیں۔ ان کی عبارت نہایت درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اسی لئے مصور غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کی تحریر میں مولانا نذیر احمد کی طرز کی سادگی بھی ہے اور محمد حسین آزاد کے ڈھنگ کا زور بھی۔ وہ واقعات اور ان کی تفصیلات بیان کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے بیان میں دلکشی اور لطافت ہوتی ہے اور تھکا دینے والے جزئیات بھی ان کی سحر طرازیوں سے اتنے پر لطف ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انھیں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتا ہی جاتا ہے۔

4.4.8 مرزا محمد ہادی رسوا

پریم چند سے قبل اودو ناول کی تاریخ میں جو سب سے اہم ناول نگار کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے وہ نام مرزا رسوا کا ہے۔ شروعاتی دور میں وہ مرزاؔ کے نام سے لکھے امراؤ جان ادا کی اشاعت کے بعد رسواؔ تخلص سے مشہور ہوئے۔ رسوا عربی فارسی کے عالم تھے۔ انگریزی اور ریاضیات میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ موسیقی سے بھی انھیں خاصا دلچسپی تھی اور وہ ایک بہترین معلم بھی تھے۔ رسوا کو پڑھنے لکھنے کا قافی شوق تھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی۔ اور یہی تصنیف کا شوق انھیں ادب کے دنیا میں تعارف کرایا اور مشہور بنایا۔ رسوا کے تصانیف میں زیادہ تر ناول ہیں۔ شریف ذادہ، ذات شریف، اختری بیگم، بہرام کی رہائی، طلسمات، خوبی بھید، خوبی عاشق، امراؤ جان ادا اور افشائے راز اہم ہیں۔ ان کے تخلیقات بیشتر لکھنؤ اور اس کے آس پاس کے ماحول کا عکاشی کرتا ہے۔ لکھنؤ میں انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا سمجھا اسے اپنے تحریر کا موضوع بنا لیا۔ ان کی ناولوں میں حقیقت نگاری کی چھاپ صاف صاف دیکھائی دیتی ہے۔ ذات شریف میں ایک نواب کا قصہ ہے جسے مختلف طریقوں سے لوٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تو وہی شرتف ذادہ میں ایک مثالی کردار پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول کرداری ہے جس میں مرزا عابد حسین کے پیچھے خود مرزا رسوا کی شخصیت چھپی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔ امراؤ جان ادا مرزا رسوا کی بہت ہی مشہور و معروف ناول ہیں جس میں ایک طوائف کی آپ بیتی کو بیان کیا گیا ہے جو اس نے خود مرزا رسوا کے اصرار پر ان سے بیان کی ہے۔ امراو جان ادا نہ صرف مرزا ہادی رسوا کا شاہکار تصنیف ہے بلکہ ایک مایہ ناز ناول بھی ہے۔ جو تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی بہت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اسی ناول کے وجہ سے مرزا ہادی رسوا کا نام اردو ادب میں روشن ہے۔ اس ناول کو اکثر ناقدین نے اجزا و فن کے مناسبت سے اسے اردو کا پہلا ناول کرار دیتے ہیں اور فنی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ناول کے اجزا پر خرا اترتا ہے۔ اس کے تمام کردار بالکل فطری نظر آتے ہیں اور زبان بھی بے حد دلچسپ ہے۔

مرزا رسوا کے ناولوں کا موضوع لکھنؤ اور لکھنؤ کے تہذیب و معاشرہ ہے۔ رسوا زیادہ غور و فکر کے عادی نہیں تھے لیکن انھوں نے اس نکتے کو پکڑ لیا تھا کہ طوائف کا ہی کوٹھا ایک ایسا جگہ ہے جو لکھنؤ کے سماجی و معاشرتی ماحول کا بھر پور

عکاسی کرتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ اسٹیج ہے جہاں لکھنؤ کا ہر فرد پہنچتا ہے اور اپنا اپنا رول ادا کرتا ہے۔ رسوا اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ لکھنؤ کے امیروں، جاگیرداروں اور نوابوں کے بیٹے آداب اور تہذیب سیکھنے کے لئے طوائف کے کوٹھوں پر جاتے تھے۔ بلکہ امراو جان ادا کے مطالعہ کرے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں جوان ہی نہیں بلکہ بوڑھے بھی طوائفوں کے کوٹھوں پر جا کر دل جوئی کیا کرتے ہیں۔ اسی طوائف کے کھوٹے پر ڈاکو سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے اور نواب سلطان سے بھی۔ اس لیے رسوا کے تخلیقوں میں طوائف مرکزی کردار کے طور دیکھائی دیتی ہیں۔

علی عباس حسینی اپنی کیاب اردو ناول کی تاریخ اور تنقید میں لکھتے ہیں:

اردو میں ناول بہتوں نے لکھے، اچھے اچھوں نے لکھے، پر ان کا رنگ سب سے الگ، ان کا انداز سب سے نرالا ہے۔ نہ ان کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں، نہ ان کی زبان میں غرابت زائیاں، جگر کاویاں، کوہ تراشیاں، نہ ان کے الفاظ ترنم ریز، نہ ان کی ترکیبیں ارتعاش انگیز، نہ ان کے میدان رزم میں برق پاشیاں، نہ ان کی داستان بزم میں ابتسام آرائیاں، پلاٹ وہی صبح وشام کے پیش آنے والے صاف اور سیاہ واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہیں۔ زبان وہی روز مرہ کی ستھری اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصے کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو، نہ ٹوکیو بس لکھنؤ اور فیض آباد، دہلی اور آلہ آباد، افسانہ کے اشخاص نہ لندھور نہ سند باد، نہ تاج الملوک نہ ملکہ زرنگار، بس یہی حکیم صاحب اور شاہ صاحب، راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب اور مرزا صاحب۔ عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا نیک قدم۔ کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے، اس کی نسل آگے نہیں چلتی۔ اپنے طرز کا موجد بھی وہی ہوتا ہے۔ اور خاتم بھی وہی۔ مرزا رسوا کا بھی کوئی مقلد آج نہ پیدا ہوا۔

اکثر پیش رو، بیشتر معاصرین تکلفات میں الجھ کر رہ گئے۔ رسوا تصنع سے پاک اور آورد سے بے نیاز ابھی ہنسا رہے تھے، ابھی رلانے لگے۔ درد و گداز، سوز و ساز، شوخی و متانت سبھی اپنے اپنے موقع سے موجود۔ لیکن آمد بیساختگی ہر حال میں رفیق۔ شستگی و روانی ہر گوشۂ بساط میں قلم کی شریک! جو منظر جہاں کا دکھایا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرصع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا ہے۔ ہر نقل پر اصل کا گمان، ہر تخیل میں حقیقت کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکہ، الفاظ میں معانی کا جلوہ!

علی عباس حسینی آگے لکھتے ہیں کہ شریف زادے کو چھوڑ، جسے ناول کہنا بھی درست نہیں، باقی اور ناولوں امراؤ جان ادا، ذات شریف و افشائے راز کا پلاٹ تمام تر معاشری و خانگی ہی ہے اور ناول میں بجز حسن و عشق کے مضامین

اور ہجر و وصل کی داستانیں ہے۔ مناظر فطرت و قدرت مرزا صاحب کے یہاں نہ اس بہتات کے ساتھ ہیں جیسے کہ شرر و محمد علی کے یہاں ملتا ہے۔ جی پڑھتے پڑھتے اکتا جائے اور نہ اس تقریظ سے جیسے کہ مولوی نذیر احمد کے یہاں کہ عورتوں کی لڑائیوں یا نصیحت ناموں کی جگہ اگر نظر سبزہ و دریا و چشمہ یا موسم کا ذکر ڈھونڈے تو پاؤں میں آبلے پڑ جائیں۔ مرزا صاحب کے یہاں لطف یہ ہے کہ بہت کچھ موجود ہے مگر چند جملوں میں اور سب وقت اور موقع کے لحاظ سے مناسب۔ ہر لفظ ایک تراشا ہوا نگینہ ہے کہ جس پہلوں سے دیکھئے اس کا حسن آنکھوں میں کھپا جاتا ہے۔

4.5 خلاصہ

جب ہم ان تمام ناول نگاروں پر اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان سب میں کچھ ایسی مشترکہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ان کو ان کے زمانے سے وابستہ کرتی ہیں اور اس زمانے میں فن ناول نگاری کی مجموعی ترقی کا اندازہ لگانے میں مدد دیتی ہیں۔ سرشار، شرر، طبیب، ہوش، سجاد حسین اور رسوا یہ سب اس زمانے کے لوگ ہیں جس کے سب سے اہم نمائندے مولانا حالی تھے۔ یہ لوگ سرسید اور ان کے تحریک کے پیرو تھے لیکن ان کی تقلید نہیں کرتے ہیں۔ نذیر احمد اپنے ناولوں جہاں اخلاقی پہلو کو لاتے ہیں اور سماج میں اصلاح کر لوگوں کے زندگی کو سدھارنا چاہتے ہے۔ وہی سرشار کی دلچسپی شہر لکھنؤ رہا جو اس وقت ادب و تہذیب کا ایک اہم مرکز تھا۔ سرشار نے لکھنؤ کے سماجی و معاشرتی حالات اور وہاں لوگوں کے روزمرہ کی زندگی کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ شرر اپنے تحریر کا موضوع اسلام کی تاریخی عظمت کو بناتے ہیں۔ طبیب بھی شرر کے نقش قدم چل اپنے تحریری کام کو انجام دیتے ہے۔ ہوش نذیر احمد سے لے کر شرر تک کی پیروی کرتے ہے۔ رسوا کا موضوع سرشار کے موضوع سے متاثر دیکھائی دیتا ہے لیکن رسوا سماجی و معاشرتی حالات کو زیادہ وسیع طور پر سمجھتے ہے اور ان کی تحریر میں فلسفیانہ انداز دیکھائی دیتا ہے۔ وہ لکھنؤ کے سماجی و معاشرتی زندگی اور لکھنؤ تہذیب کا فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہے اور شعوری طور پر اپنے ہم عصر ادیبوں سے زیادہ پختہ نظر آتے ہے۔ اور ان کا علم ان سب کے علم سے زیادہ ہے۔ وہ ناول نگار کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ سرشار زندگی پر ہنسنے ہی کے اہل ہیں۔ شرر زندگی کو سمجھ سکتے ہی نہیں مگر رسوا زندگی کو مکمل طور پر دیکھتے ہیں اور پورا پورا سمجھتے ہیں اور اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک

بہت بڑی کمی یہ دیکھائی دیتی ہے کہ یہ سبھی اپنے پرانے روایات میں اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کو زندگی کی حیثیت سے نہیں دیکھ پاتے ہیں اوراس میں آزادانہ اور غیر جانب دار اصول اخذ نہیں کر پاتے۔ بحرحال پریم چند سے قبل اردو میں ناول نگاری کی روایت کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اور ناول اپنے ترقی کے راستے پر گامزن تھی۔

4.6 فرہنگ

مظلوم ۔ ظلم کیا گیا، ستایا ہوا

طوالت۔ لمبائی، طول

اعتراف۔ اقرار کرنا، مان لینا

ضخامت۔ ضخیم ہونا

تقلید۔ پیروی

ظریفانہ۔ ظریف کی طرح، ظرافت کا

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری کے بارے میں لکھے؟

۲۔ پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری کے رجحانات کو بیان کرے؟

۳۔ اردو ناول کے آغاز وارتقا پر ایک نوٹ لکھے؟

پریم چند کی ناول نگاری

سبق کی ساخت:

5.1 تمہید

5.2 مقاصد

5.3 پریم چند کی حالات زندگی

5.4 پریم چند کی ناول نگاری کا آغاز

5.5 پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات

5.6 پریم چند کے ناولوں کا جائزہ

5.7 خلاصہ

5.8 فرہنگ

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

5.10 سفارش کردہ کتابیں

5.1 تمہید

اردو میں ناول کا سنگ بنیاد مولوی نذیر احمد نے ڈالی تھی۔لیکن اس فن کو بلندی بخشنے کا کام منشی پریم نے کیا۔ جب پرین چند نے قلم اٹھایا تو اردو میں ناول کی حالے کچھ خاص نہیں تھی۔مگر پریم چند کی فنی صلاحیت نے ناول کے شان کو عروج پر پہنچا دیا۔ پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے عام انسان خاص کر غریب مزدور، کسان کو اپنے ناول کا ہیرو بنایا۔اردو ناول نگاری کی تاریخ پریم چند کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ پریم چند اردو کے مشہور و معروف ناول نگار ہیں۔

5.2 مقاصد

اس سبق کے بعد آپ

پریم چند کے حالات زندگی سے واقف ہو جائیں گے

پریم چند کے ناول نگاری سے واقفیت حاصل ہو جائیں گی

پریم چند کے ناولوں کے بارے میں جان جائیں گی

پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لے پائیں گے۔

5.3 پریم چند کی حالات زندگی

منشی پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا جو اُن کے والد صاحب نے رکھا لیکن اُن کے چچا نے اپنے بھتیجے کا نام پریم چند رکھا اور آگے چل کر وہ منشی پریم چند کے نام سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم لائل پور کے مولوی سے حاصل کی، جہاں منشی پریم چند اردو اور فارسی زبان کے رموز سیکھے اور ادب سے شناسائی حاصل کی اور 1895ء میں گورکھپور سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور بعد میں معلم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ۸۱ روپے ماہوار تنخواہ لیا کرتے تھے۔ بعد ازاں 1899ء میں بنارس میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری مل گئی اور 1900ء میں بیرائچ کے گورنمنٹ اسکول میں بہ طور ٹیچر مقرر ہوئے۔ تقرر ہوا اور الہ آباد میں جا کر آپ نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا۔ جونیئر اسکول ٹیچر کا امتحان 1908ء پاس کیا اور اسی سال آلہ باد یونیورسٹی سے اُردو ہندی کا خصوصی امتحان پاس کیا 1909ء میں ترقی پا کر سب انسپیکٹر آف اسکولز ہو گئے۔ فروری 1919ء 1920ء میں عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں ملازمت سے علیحدہ ہوئے اور لکھنو میں پہلی مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنیفن کی صدارت کی۔ منشی پریم چند اپنے ناول ''نواب رائے'' کے نام سے لکھتے تھے آپ کا پہلا ناول ''اسرارِ مابعد'' رسالہ آوازِ خلق میں ?18 اکتوبر 1903ء کو شائع

ہوا جس نے قبول سند عام حاصل کی جب دوسرا ناول ''کیش نا'' کے نام لکھا جواب موجود نہیں۔

بچپن کی انہیں شرارتوں اور معمولی گھرانوں کے لڑکوں سے دوستی کی وجہ سے ان کی زندگی کے وہ دن سہانے گزرے اور نقش کرتے چلے گئے۔ پریم چند کم عمر سے ہی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اور گاؤں کی زندگی، رہن سہن اور حالات کا انہوں نے بہت اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا۔ دیہی سماج کی مفلوک الحالی اور پستی و بلندی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ گاؤں والوں پر ساہوکار، سیٹھ، بنئے، پٹواری اور بڑے زمین داروں کے مظالم ہوتے ہوئے دیکھے کسانوں کی سادگی اور جہالت کو دیکھا، پرکھا اور اس قسم کی بہت سی باتیں انہیں بار بار اکساتی رہیں۔ کچھ اس طرح کی باتیں ان کے دل میں گھر کر گئیں، اور ان سب چیزوں کی وجہ سے ان کا دل بے حد متاثر رہتا۔

پریم چند نے جب اپنا ادبی سفر شروع کیا تو اُس دور کا ہندوستان اصلاحی اور انقلابی سرگرمیوں میں سرگرداں ہونے کے باوجود متعدد طرح کے تضادات کا شکار تھا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان فیصلہ کرنا اُن کے لیے بہت کٹھن تھا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے اس معاشی بدحالی سے باہر نکالنے کے لیے پریم چند نے ادب کا سہارا لیا۔ اس لیے اُن کے ناولوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ظلم کرنے والوں کے بجائے مظلوموں کا ساتھ دیا، استحصال کرنے والوں کے بجائے استحصال کیے جانے والوں اور حاکم کے بجائے محکوم کے ساتھ اور خاص کر زمیندار اور کسان کی لڑائی میں پریم چند کسانوں کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں جس کا بخوبی اندازہ اُن کے ناولوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

پریم چند کو اردو ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے بیوہ عورت، ناکامیاب شادی، جہیز کی لعنت اور سماجی تفریق جیسے موضوعات پر افسانے اور ناول لکھے۔ اس دور میں ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے معاشرے کو احترام، انسانیت، مشرقی و مغربی تہذیب کے فرق اور اخلاقی اقدار کی جانب انہوں نے متوجہ کیا۔ پریم چند، مہاتما گاندھی کی تحریک سے متاثر ہوئے اور دل و جان سے ملک کی آزادی کے لیے لڑنا چاہتے تھے لیکن اپنی مجبوریوں کی بنا پر کسی تحریک میں عملی حصہ نہ لے سکے۔ افسانہ نگاری کا دوسرا دور بھی تحریکوں کا دور تھا۔ تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ستیہ گرہ، سول نافرمانی وغیرہ اور دیگر سماجی و سیاسی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بھی اس وقت سیاست کا رنگ پایا گیا۔ چونکہ پریم چند کا تعلق دیہات سے تھا اور اسی لیے دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ کسانوں، غریبوں اور مزدوروں کے دکھوں سے آگاہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ

انہوں نے غریب کسان اور کاشت کار کے رہن سہن، اس کے افلاس اور دکھوں کی تصویر کشی کی ہے۔ پریم چند کے ناولوں کی زبان سادہ ہے۔ انہوں نے ملکی، علاقائی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ ہندوستان کے دیہی موضوعات کے ساتھ متوسط شہری زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔ ان کی تحریر میں محنت کشوں کا درد ہے، دبے کچلے طبقے کا کرب ہے، غریب کو مزید غربت میں دھکیلنے والوں کے لیے غصہ ہے، ظلم و زیادتی کے شکار ہونے والوں کے لیے رنج ہے۔ الغرض وہ سبھی جذبات ان کے افسانوں میں پائے جاتے ہیں جو حقیقت کی عکاسی اور بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔

5.4 پریم چند کے ناول نگاری کا آغاز

پریم چند کی ناول نگاری میں وہ سبھی عناصر موجود ہیں۔ ان کے یہاں جذبات نگاری کے ساتھ مقصدیت بھی ملتی ہے۔ انہوں نے دیہات کی زندگی کو خوب اچھی طرح دیکھا، وہاں کے حالات کو پرکھا، کرداروں کو بہترین الفظ کے ساتھ پیش کیا اور مختلف مسائل سے دوچار ہونے کے بعد بھی قلم کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ ناول کی روح سے لے کر الفاظ کے انتخاب تک انہوں نے اردو ادب کو بہترین ذخیرہ دیا۔ ایک دردمند دل رکھنے کی وجہ سے انہوں نے ہر عہد کی تبدیلیوں کو بخوبی محسوس کیا۔ اس کی روح کو اپنے اندر سمویا اور قارئین سے انہی کے لہجے میں افسانوں کے ذریعہ گفتگو کر کے صرف ادبی دنیا میں نہیں بلکہ ادب سے تعلق نہ رکھنے والوں کے دلوں میں بھی اپنا گھر کیا۔

اگر پریم چند کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انقلابی اور باغیانہ نظامِ فکر ان کو ورثے میں ملا تھا۔ پریم چند نے جس ماحول میں زندگی گزاری اس میں قدامت پرستی، ذات پات کی تفریق انسانوں کو خاص طور پر غریب لوگوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھیں اور دوسری طرف عصر حاضر کی غلامانہ ذہنیت کا شکنجہ تھا۔ پریم چند کی تمام تر زندگی جدوجہد میں گزری۔ اول اپنے اہل وعیال واقرباء کی کفالت اور دوسری غمِ روزگار کی بھاگ دوڑ۔ بچپن میں والدہ کے مرنے کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی اور اس سوتیلی ماں نے پریم چند پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔

پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز 1901ء سے ہوتا ہے جب انھوں نے ''زمانہ'' رسالے میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ پریم چند کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ لہٰذا انھوں نے دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔

آپ کی ابتدائی کہانیوں میں حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں رہا ہے اور پریم چند اس نکتہ سے واقف تھے کہ حقیقت نگاری کا محدود تصور فن کو تباہ کر دیتا ہے۔

جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت موضوعات عروج پر تھے، آپ نے بین الاقوامی، ملکی، علاقائی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ آپ نے ہندوستان کے دیہی موضوعات سے ساتھ ساتھ متوسط شہری کی زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔ رومانوی ادیب زندگی کی عکاسی ایک مصور کی حیثیت سے کرتا ہے جبکہ حقیقت پسند، زندگی کو فوٹو گرافر کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ پریم چند کے ہاں ہمیں دونوں رویے ملتے ہیں۔ ایک طرف سماج کی سچی اور کھری تصویریں جبکہ دوسری طرف تخیل کی رنگ آمیزی ملتی ہے۔ پریم چند کے ہاں رومانیت کا تصور ایک سماجی پہلو لیے ہوئے ہے اور وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انحراف نہیں کرتے۔

پریم چند بنیادی طور پر طبقاتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ فرد کی آزادی کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ ان کی رومانیت پر وطن پرستی کا رنگ غالب ہے جس کا اظہار ان کی ابتدائی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پریم چند محبت کا تصور رومانوی اثرات کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق کا اظہار کرنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تصور محبت سماجی روایت سے منسلک ہے۔ جس میں محبت کے کئی رنگ موجود ہیں۔ جس میں حب الوطنی، کچلے ہوئے طبقات سے ہمدردی، مادی حقائق کی اہمیت کو تسلیم کرنا وغیرہ۔

پریم چند کے کردار اکثر معاشرے کے ستائے ہوئے عام لوگ ہیں۔ انھوں نے ان ستائے ہوئے اور کچلے ہوئے مظلوم لوگوں خصوصاً دیہاتوں میں جاگیرداروں اور مہاجنوں کے ظلم کے مارے ہوئے لوگوں کو زبان دی۔ ان کے اندر آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا اور ایک نئی دنیا تعمیر کی اور طبقات سے آزاد معاشرے کا وجود ان کا بنیادی نظریہ تھا۔ وہ مثالیت اور حقیقت کے امتزاج سے اپنی افسانوی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔

آپ نے اپنے ناولوں میں سادہ زبان استعمال کی۔ آپ نے سنسکرت کے الفاظ کا کم استعمال کیا۔ آپ نے اکثر کرداروں کے مکالمے ان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق لکھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے لیے مکالمے ان کے لہجے اور تلفظ میں تخلیق کیے۔ جو آپ کے زبردست مشاہدے کا غماز ہے۔ آپ نے ہندوستان کے لوگوں کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا۔ اُس وقت جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت

موضوعات عروج پر تھے، آپ نے بین الاقوامی، ملکی، علاقائی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ آپ نے ہندوستان کے دیہی موضوعات سے ساتھ ساتھ متوسط شہری کی زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔

کفن حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فنی جمالیات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ افسانہ ان کے اس نقطہ نظر کا ترجمان ہے جو انھوں نے اپنے ایک خط میں بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں ''محض واقعات کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جب تک اس قسم کی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم نہیں اٹھتا انھوں نے کفن میں جس جرأت کے ساتھ انسانی فطرت کو بے نقاب کیا ہے وہ ان کے فن کا کمال بھی ہے اور نقط نظر کا اظہار بھی۔ آپ نے ''کفن'' کے بنیادی کرداروں ''گھیسو'' اور ''مادھو'' کے باطن میں گھس کر فطرت کو بے نقاب کیا۔ پوری کہانی کی جان حالات کی ستم ظریفی ہے۔ جس نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا طبقاتی نظام میں محکوم اور مجبور لوگوں کا استحصال ان کے اندر انسانی احساسات کو ختم کر دیتا ہے اور ان کو حیوانی سطح پر رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ''کفن'' کی یہ طنزیہ صورت حال اس دردناک منظر سے شروع ہوتی ہے کہ جھونپڑے کے اندر جواں سال بہو درد زہ سے تڑپ رہی ہوتی ہے اور باہر گھیسو اور مادھو بجھے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے خاموشی سے اس کے مرنے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ پریم چند کا کمال یہ ہے کہ وہ کم لفظوں میں بڑی حقیقت کو کہانی کا روپ دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر کفن کی کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلے حصے میں کرداروں کا تعارف، دوسرا حصہ بہو کی موت اور اثرات، تیسرا حصہ غربت و افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے حسی کا اظہار۔

پریم چند نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایہ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انھوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ وہ پہلے ادیب تھے جن کی نظر حیات انسانیت کے انبوہ میں ان مجبور اور بے بس انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی۔

5.5 پریم چند کے ناول نگاری کی خصوصیات

منشی پریم چند نے اپنے ناولوں میں دیہات کی زندگی اور وہاں کے بسنے والوں کو جس خلوص، دیانت داری اور تعمیری جذبے کے ساتھ پیش کیا اس سے افسانے کے فن کو فقط جلا ہی نہ ملی بلکہ آنے والی نسلوں کی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔ منشی پریم چند کے حوالے سے یہی کہا جائے گا کہ منشی پریم چند جیسا افسانہ نگار، ناول نگار اور حقیقت شناس شاید ہی کوئی دوسرا پیدا ہو۔ اور ن کا قلم آخری ناول ''منگل سوتر'' کو لکھتے ہوئے بیچ میں چھوڑ کر ہی 7 اکتوبر 1936 کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ دیہاتیوں کے مسائل سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے کسانوں اور مزدوروں کے دکھوں کو اپنے نوکِ قلم سے معاشرے میں اجاگر کرتے ہیں۔ پریم چند نے غریب کسان اور کاشتکار کے رہن سہن، اس کے افلاس اور دکھوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ جو دیہاتی کسان کی سادہ لوحی کے ساتھ ساتھ زمیندار مہاجن اور ساہوکار کی فریب کاری کا پردہ چاک کرتا ہے اور اس کے ظلم و تشدد اور مکر و فریب کے خلاف انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ''پریم چند کے سب سے اہم پلاٹ وہ ہیں جن میں ہندوستان کے کسانوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ پریم چند نے کسانوں کو ان کی گہری نیند سے بیدار کیا اور یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اگر دیہات کے باشندے بیدار ہو جاتے ہیں تو ہندوستان کی بیداری یقینی ہے۔''

ناول زندگی کے بیان کا فن ہے، جس میں تنہا انسان کے بجائے اس کے لواحقات کو ان کے حقائق کے ساتھ موضوع بنایا جاتا ہے۔ اردو ادب کے یہ سب سے وسیع کینوس والا فن ہے جس کے توسط سے انسانی زندگی زمان و مکان کے ساتھ تخلیقی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ناول کا فن یوں تو مغرب سے آیا ہے لیکن اس کی خشت اول داستانیں ہماری تہذیب کا حصہ رہی ہیں، جن کی روشنی میں ناول کا وجود عمل میں آیا اور ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ آج اس مقام پر کھڑا ہے، جب اردو میں طرح طرح کے ناول لکھے جا چکے ہیں، مختلف موضوعات پر الگ الگ فنی تکنیک میں اب اردو میں ناول موجود ہیں۔ ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کی تمثیلی کہانیوں سے ہوئی جسے مرزا رسوا نے بہت جلد فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پختہ بنا دیا مگر ان کے بعد جب پریم چند نے اس میدان میں قدم رکھا تو ابتدا میں وہ ڈپٹی نذیر احمد

کے راستے پر ہی چلے مگر دھیرے دھیرے ان کے فن میں پختگی آتی گئی اور وہ اسرار معابد سے گؤ دان تک پہنچ گئے جو ان کی فنکاری کی معراج ہے۔

پریم چند نے ناول کے دھارا کو ایک نیا موڑ دیا۔ ابھی تک جتنے ناول لکھے گیے تھے ان کے موضوعات مختلف تھے۔ کہیں اصلاح کا پہلو نمایاں تھا تو کہیں صرف آئینہ دکھایا گیا تھا مگر پریم چندر کے ناول کا مواد اور ان کی تھیم بالکل الگ تھی یہیں سے ہم اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس دور میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے پوروج کیا کر رہے ہیں۔ ان کے ناول کشنا، 1908، جلوہ ایثار 1912، بازار حسن 1916، نرملا، 1921، چوگان ہستی 1925، بیوہ 1927 میں شائع ہوا جس کے بعد غبن 1932، میدان عمل 1932 اور گؤ دان 1936 میں منظر عام پر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند جس طرح آگے بڑھتے ہیں ان کے ناول میں نشتریت بڑھتی جاتی ہے اور گؤ دان تک پہنچتے پہنچتے اس کا انداز نہایت تیکھا ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ جس سماج کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا انسانی سماج مادیت کی زد میں آچکا ہے جس نے نہ صرف انسانیت کو زندہ درگور کر دیا ہے بلکہ اس رمق کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے جس سے انسانی قدریں وابستہ تھیں۔ یہاں پریم چند کے ناول کا فن اپنے پورے شباب پر دکھائی دیتا ہے جس میں انسانی قدروں کے زوال اور مستقبل کے خطرات صاف نظر آتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے سبھی ناولوں میں نہایت عام فہم اور سادہ زبان استعمال کی ہیغیر مانوس الفاظ سے احتراز کیا ہے۔ مکالموں کی زبان کرداروں کے مطابق ہے، یہاں تک کہ کرداروں کی زبان سے ان کے پیشوں اور ذات و برادری تک کی شناخت ہونے لگتی ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ مکالموں کا عین کردار کے مطابق ہونا ہے، اس میں انہوں نے فنی مہارت کا کا مظاہرہ کرتے ہوئے کرداروں کے لہجے اور تلفظ تک کو گرفت میں لے لیا ہے۔ جوان کے زبردست مشاہدے کا غماز ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا۔ اُس وقت جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت موضوعات عروج پر تھے، پریم چند نے ملکی، علاقائی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ اپریم چند کی شناخت دیہی معاشرت کا بیان ہے، انہوں نے سماج کے زمیندارانہ نظام، سیاسی جبر، سماجی اونچ نیچ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا کوئی بھی ایسا ناول نہیں ہے جس میں اس وقت کا سماج سانسیں لیتا ہوا نہ محسوس ہوتا ہو۔ پریم چند کے کردار اکثر معاشرے کے ستائے ہوئے عام لوگ ہیں۔ انھوں نے ان ستائے ہوئے اور کچلے ہوئے مظلوم لوگوں

خصوصاً دیہاتوں میں جاگیرداروں اور مہاجنوں کے ظلم کے مارے ہوئے لوگوں کو زبان دی۔ان کے اندر آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا اور ایک نئی دنیا تعمیر کی اور طبقات سے آزاد معاشرے کا وجود ان کا بنیادی نظریہ تھا۔وہ مثالیت اور حقیقت کے امتزاج سے اپنے ناولوں کی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔

پریم چند کی ناول نگاری کا مطالعہ آج کی تکنیک کے تناظر میں کرنے کے بجائے اگر ان کا مطالعہ موضوعی اور سماجی تناظر میں کیا جائے تو زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں کیونکہ اس وقت فن کی سطح پر نہ تو بہت زیادہ معلومات تھی اور نہ اس کو زیادہ ترجیح دی جاتی تھی، بلکہ اس کی جگہ اصل مسئلہ موضوع کا تھا کہ انہوں نے کس طرح کے موضوعات پر قلم اٹھایا اور اس کے ساتھ کتنا انصاف کیا۔پریم چند کے ناولوں کو ان کے موضوعات کے تناظر میں ہی دیکھا جانا چاہئے۔وہ ایسے پہلے فنکار ہیں جنہوں نے متعدد موضوعات پر ناول لکھے اور ہر موضوع پر اس وقت کے اعتبار سے شاہکار تخلیق پیش کی خواہ وہ بیواوں کا مسئلہ ہو، یا مذہب کی اندھی تقلید ہو، سماج میں پھیلی چھوا چھوت کی بیماری ہو یا قرض اور سود کا استحصالی نظام ہو، یا پھر مندروں میں مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ۔پریم چند نے سفاکی کے ساتھ ان حقائق کو تخلیقی طور پر بیان کیا ہے تاکہ سماج اپنی برائیوں کو دیکھے اور ان سے خود کو پاک کر کے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل ہو جس میں انسانیت کو اہمیت حاصل ہو۔

پریم چند کا ہر ناول الگ موضوع پر ہے جس میں ان کے عمیق مشاہدے کی چھاپ دکھائی دیتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے صرف دیہی زندگی کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے، انہوں نے جہاں ایک طرف انگریز حکمرانوں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے وہیں وہ ملکی سیاست سے بھی بے خبر نہیں تھے۔اپنے ناولوں میں انہوں نے اس وقت کی سیاست کو بھی بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔سیاست میں مذہب کو بڑا دخل رہا ہے، پریم چند کے زمانے میں بھی ایسا تھا جس کی بہترین مثال ان کے ناولوں خصوصا میدان عمل میں موجود ہے۔اس وقت کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو جس کو انہوں نے تخلیقی سطح پر نہ برتا ہو اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ہر ناول کا الگ مطالعہ کیا جائے اور ان کی تخلیقات کی روشنی میں اس وقت کے سماج کو سمجھنے کی کوشش کی گئی

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، پریم چند سے پہلے زیادہ تر ناولوں میں یا تو اصلاحی پہلو غالب تھا، یا پھر تاریخی واقعات کو فکشن کی زبان میں بیان کرنے کا رجحان عام تھا۔لیکن پریم چند نے اردو ناول کو بالکل نئے رنگ و آہنگ سے مزین کیا۔

پریم چند اس معنی میں اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے سماجی مسائل کو فکشن میں مرکزی حیثیت سے پیش کیا۔ پریم چند نے انیسویں صدی کے اواخر میں آنکھ کھولی۔ اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی اور ہمارا ملک سماجی اور سیاسی سطح پر نہایت تکلیف دہ حالات سے گذر رہا تھا۔ ایک طرف برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیاں تھیں تو دوسری طرف خود ہمارے سماج میں پھیلے ہوئے بہت سے ایسے مسائل تھے جن سے سماج میں بے اطمینانی کی شدید کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں جاگیردارانہ نظام کی وہ ظالمانہ صورت تھی جس کا شکار غریب اور مزدور کا بہت بڑا طبقہ تھا۔ اسی زمانے میں روسی انقلاب نے سرمایہ دار اور مزدور طبقے کے بیچ جو شگاف تھا اس کو اور بھی واضح کر دیا تھا۔ دنیا بھر کے مزدور اور کسان سرمایہ داروں کے خلاف محاذ آرا ہونے لگے تھے۔

اس صورت حال نے پریم چند کو شدت سے متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی سماج کی انھیں برائیوں کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا۔ چونکہ پریم چند کا عام رجحان اصلاحی تھا ,اس لئے وہ اپنے ناول اور افسانے دونوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے ساتھ اس کے حل کی طرف بھی واضح اشارہ کرتے جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو فکشن کے فن کے اعتبار سے اس کو ایک خامی بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بہر حال پریم چند کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

پریم چند نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی سماج کی ایسی بہت سی برائیوں کو بھی موضوع بنایا ہے جس کا ہمارا سماج صدیوں سے شکار تھا۔ جیسے نہایت کم عمر کی شادی، عورتوں پر مردوں کی زیادتیاں، طاقت ور کا کمزور کو دبا کر اس کی عزت نفس پر حملہ کرنا۔ یہ ایسی پرانیاں تھیں جو ایک زمانے سے ہمارے سماج کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ پریم چند نے ان مسایل کو موضوع بنا کر بہت سے کامیاب ناول تحریر کیے۔ گودان جو پریم چند کا سب سے مشہور ناول ہے، اس میں بھی ہمارے سماج کے ایسے ہی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بازار حسن، بیوہ اور دوسرے ناول بھی پریم چند کی ناول نگاری کے انھیں پہلوؤں کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں انسان ایک ہی قسم کے واقعات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے؟ اس کے تعجب، حیرت، رنج، خوشی، غصہ، نفرت، حسد، بغض، رشک، رقابت اور اس قسم کے فطری جذبات کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیزیں سب انسانوں کے لیے یکساں ہیں اور اس لیے افسانوی بلندی حاصل کرنے کے لیے افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ پر ہیں۔ اس چیز سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ وہ ان کے طرز بیان کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ مثلاً وہ جملوں میں جہاں تشبیہات کا

استعمال کرتے ہیں تو انہیں نفسیاتی محسوسات کو کام میں لاتے ہیں۔ایک جگہ لکھا ہے:

''ایک یتیم بچہ ماں کا تذکرہ سن کر رونے لگتا ہے۔اسی طرح اور چھا کی کی یاد
سے چمپت رائے کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔"

اس حیثیت سے پریم چند کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اردو ناولوں میں حقیقت شعاری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہر جگہ عالمگیر حقائق، عام فطرت انسانی کی نفسیات اور بلندی خیال کو مدنظر رکھا ہے۔

اسی طرح مجموعی حوالے سے پریم چند کے ہاں جذبات نگاری بھی، تنقیدِ حیات ہے اور ترغیب و اصلاح بھی۔ اور یہی وہ معاشرتی اور سیاسی شعور تھا جس نے پریم چند کو حقیقت پسند ناول نگار بنایا اور پھر ان کے افسانے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی تقاضوں کی ترجمانی کرنے لگے۔ان کے ناولوں میں ملک وقوم کے لیے ایثار و محبت کے جذبے بیدار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند نے ایک ماہر نفسیات کی طرح محکوم قومیتوں کو عزم و ہمت کے گر سکھائے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ انسان دوستی اور وطن دوستی کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ یوں پریم چند کے ہاں سچی وطن دوستی، سماجی اصلاح کا جذبہ، دیہاتی زندگی کے مرقعے، طبقاتی کشمکش اور کردار نگاری کے خوبصوت نمونے ملتے ہیں۔انہوں نے تخلیقی جبلت کو محض افسانہ نگاری کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس میں مقصدیت کی روح کو سمو کر ایک مصلح قوم کا کردار بھی ادا کیا ہے۔

اس حقیقت سے واقعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معیار و مقدار کے اعتبار سے پریم چند نے اردو ادب میں افسانے کی روایت کو مستحکم کیا اور انہوں نے ہی اردو افسانے کو ارتقائی منازل تک پہنچایا۔ مختصر اردو افسانے کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

بقول مولوی عبدالحق

"ہندوستانی ادب میں پریم چند کے بڑے احسانات ہیں انہوں نے ادب کو
زندگی کا ترجمان بنایا۔ زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات
کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا۔انہوں نے بے زبانوں کو زبان
دی۔ان کی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔ پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک

کھونتی ہے۔حقیقت کو لٹکانے کے لیے۔سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے
تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ ان کا مشن ہو گیا تھا۔"

5.6 پریم چند کے ناولوں کا جائزہ

پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں سے تھے پریم چند کا پہلا ناول ''اسرار معابد'' ہے جو رسالہ'' آواز خلق''میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء کے درمیان شائع ہوا۔اس ناول کا موضوع سماجی اصلاحات سے متعلق بعض مسائل کو پیش کیا گیا تھا۔جس میں پریم چند نے مذہب کی کورانہ تقلید سے پیدا ہونے والے سماجی برائیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ناول میں عورتوں کے بعض مسائل،اُن کی بیوگی،چھوت چھات،قرض اور سود وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ پریم چند نے مندروں میں دھرم کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے چہرے سے نقاب سرکائی ہے۔اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند عورتوں کے مندروں میں جانے کے خلاف تھے کیونکہ وہاں کے ماحول میں تقدس اور روحانیت کے بجائے عیش کوشی کی جاتی ہے۔

پریم چند کا دوسرا ناول ''ہم خرما وہم ثواب'' جو ۱۹۰۷ء میں ہندوستان پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا۔یہ ناول بھی اگرچہ ''اسرار معابد'' کی طرح عورتوں کے مذہبی مقامات پر جانے اور وہاں گمراہ ہونے کے امکانات کو پیش کرتا ہے۔پریم چند کو ہندو معاشرت میں بیوگی سے پیدا ہونے والے مسائل کا شدت سے احساس تھا۔اس لیے انھوں نے جب دوسری شادی کی تو وہ بیوہ سے کی۔اس ناول میں پریما اور امرت رائے کے ذریعہ پریم چند نے بیوہ سے شادی کرنے کے اقدام کو ضروری قرار دیا ہے۔

پریم چند کا تیسرا ناول ''روٹھی رانی'' ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔جس میں جاگیردارانہ نظام کے استحصالی رویے کو موضوع بنایا گیا ہے۔راجپوتوں کے جاگیرادارانہ نظام میں لڑکیوں کی حیثیت ایک گائے کی مانند تھی جو مالک کی مرضی کے مطابق اپنا سب کچھ قربان کر دیتی تھی۔راجپوت راجا ایک ہی وقت میں کئی شادیاں کرتے تھے جس سے بیویوں کے درمیان رشک وحسد کی آگ جلتی رہتی تھی۔پریم چند نے اس کش مکش کو اس ناول میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔دوسری

طرف راجپوت راجاؤں اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں طعش پسندی کے پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ راجپوتوں کے انتقامی رویے کو بھی اس ناول میں پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اس ناول کے ذریعے راجپوتوں کی بہادری، ان کی آن بان، اپنی بات پر جان دینا اور قوم کے لیے ایثار و قربانی وغیرہ کے پہلوؤں کو پیش کر کے ہندوستانی عوام کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر راجپوتوں کی طرح اُن کے اندر جذبہ خودداری بیدار ہو جائے تو ملک سے غیر ملکی حکمرانوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

ناول ''جلوہ ایثار'' ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا۔ یہ ناول کئی پہلوؤں سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستانی عوام لارڈ کرزن کی پالیسیوں سے بیزار ہو چکے تھے۔ تقسیم بنگال کا مسلہ عوامی تحریک کی حیثیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ کانگرس عدم تعاون کی راہ پر گامزن تھی۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک بحران کی صورت تھی جو پہلی جنگ عظیم کی شکل میں رونما ہوا۔ اس دور میں پریم چند پر آریہ سماجی اثرات حاوی نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہی زندگی، متوسط طبقے کے حالات، جہالت، فرسودہ رسم و رواج کی مخالفت جیسے مسائل ناول ''جلوۂ ایثار'' میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔

پریم چند کا پانچواں ناول ''بازار حسن'' ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا جس کا موضوع طوائفوں کی زندگی کو پیش کرنا ہے۔ یہ پریم چند کا پہلا ضخیم ناول ہے جو ہندی میں ''سیوا سدن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں پریم چند سے پہلے قاری سرفراز حسین کا ناول ''شاہد رعنا'' اور مرزا رسوا کا ''امراؤ جان ادا'' نے اگرچہ طوائف کی زندگی پر روشنی ڈال چکے تھے اس وجہ سے پریم چند سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس ناول میں حقیقت نگاری کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کیا ہوگا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ''امراؤ جان ادا'' اور ''بازار حسن'' کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

> ''پریم چند کے یہاں وقت کے گذرنے سے ہمیں یہ توقع تھی کہ حقیقت نگاری زیادہ کامیاب اور زندگی کی تصویر زیادہ سچی ہوگی لیکن پریم چند کے ذہن پر اُن کے اخلاق کا جذبہ اس قدر مسلط تھا اور اصلاح کی قوت اتنی حاوی تھی کہ آخر میں وہ اپنے کردار کو زندگی سے دور کر دیتے ہیں۔'' [۱]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے طوائف کی زندگی کے مسلے کو سرسری سے دیکھا اور سمجھا تھا اس لیے ''بازار

حسن'' کا مقصد طوائف کی زندگی سے زیادہ فحاشی کے سماج پر ہونے والے اثرات سے بچاو؟ تھا۔

پریم چند کا ناول ''گوشۂ عافیت'' ۱۹۲۰ء میں مکمل کیا۔ جو گاؤں کی سماجی زندگی میں افراد کے درمیان ٹکراؤ سے پیدا شدہ کش مکش کی ترجمانی کرتا ہے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:۔

> ''گوشہ عافیت کا منوہر اور اس کا بیٹا بلراج کسانوں کے اس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جو چپ چاپ ظلم سہنے کے بجائے مظالم کا مقابلہ کرتے ہوئے مرجانے کو ترجیح دیتے ہیں۔''[۲]

یہ ناول مہاتما گاندھی کی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ پریم شنکر گاندھیائی مزاج و کردار رکھتا ہے وہ زمیندار اور زمیندارانہ نظام کا مخالف ہے۔ وہ انگریزی نظام حکومت کو بھی خطاوار سمجھتا ہے اور انگریزی نظام حکومت کے استحصالی رویے پر بہتر انداز میں تنقید کرتا ہے۔ حاجی پور اور لکھن پور کو پریم چند نے مثالی گاؤں کی طرح دیکھا تھا اُن کا یہ تصور بھی مہاتما گاندھی کا مرہون منت ہے۔ انھوں نے گاؤں کو بہتر بنانے پر بھی گاندھیائی نقطہ نظر پر زور دیا ہے۔ گاؤں میں لائبریری کھولی جاتی ہے، اخبار آتے ہیں جس سے لوگوں کو مختلف مسائل کا علم ہوتا ہے۔ ڈپٹی جوالا سنگھ سرکاری ملازم ہیں لیکن مہاتما گاندھی کی تحریک سے متاثر ہو کر تحریک عدم تعاون میں شامل ہوتے ہیں اور اپنے گلے سے غلامی کا طوق اُتار پھینکتے ہیں۔ سید ایجاد حسین نام نہاد اتحاد کے حامی ہیں جو خود غرضی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور جھوٹے چندے وصول کر کے ہضم کر جاتے ہیں لیکن جب اُن پر گاندھیائی اثرات پڑتے ہیں تو اُن کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں مہاتما گاندھی کے بنیادی تعلیم کے مسئلہ کو بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

گوشۂ عافیت کے بعد پریم چند نے ۱۹۲۳ء میں ''نرملا'' لکھی گئودان کے بعد پریم چند کا بہترین ناول تصور کیا گیا ہے جو ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا۔ جس میں عورتوں کی زندگی سے متعلق بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن کی بیوگی، بے جوڑ شادی اور جہیز سے پیدا ہونے والے مسائل جس کے نتیجے میں ایک پاکیزہ عورت بھی طوائف بن جاتی ہے۔ سن رسیدہ منشی طوطا رام ایک کم سن لڑکی نرملا کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر اُسے اپنی بیوی بنالیتا ہے جو عمر میں اُس کے بچوں کے برابر ہے۔ جہیز کی لعنت کے شکار والدین جب اپنی لڑکیوں کو عمر رسیدہ شخص سے شادی کر دیتے ہیں تو مستقبل کی پریشانیوں کا نقشہ اس ناول میں دیکھایا گیا ہے۔

ناول ''چوگان ہستی'' پریم چند کا نہایت ہی کامیاب ناول ہے جسے دارالاشاعت اردو نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔اردو کا کوئی دوسرا ناول اس کا جواب پیش نہیں کرسکتا۔ پریم چند نے خود بھی اسے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔اس ناول کے ساتھ پریم چند کی تخلیقی اور فنکارانہ قوتیں نقطہ عروج کی طرف بڑھتی نظر آتی ہیں۔اس ناول میں صنعتی تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پریم چند گاندھی کی طرح صنعتی تہذیب کے فروغ سے بے حد متفکر اور خوف زدہ تھے۔اُن کا خیال تھا کہ صنعتی ترقی سے ہندوستان کی مالی اور اقتصادی حالت میں سدھار لانا ناممکن ہے کیونکہ ہندوستان کی عوام جو زیادہ تر گاؤں میں رہتے ہیں،شہر اور دیہات کی کش مکش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پریم چند بھی شہری زندگی کو پسند نہیں کرتے تھے اُن کی خواہش تھی کہ اگر اُن کی مالی حالت بہتر ہو جاتی تو وہ گاؤں میں جا کر رہتے اس ناول کا مثالی کردار سورداس ہے جو گاندھیائی عدم تشدد کی علامت ہے۔

ناول ''پردہ مجاز'' ۱۹۳۴ء میں لاجپت رائے لاہور سے شائع ہوا جبکہ ہندی میں ''کایا کلپ'' کے نام سے شائع ہوا۔جس کا موضوع اُس دور کی سیاسی اور سماجی مسائل کو پیش کرنا ہے۔ ہندو مسلم کشیدگی،کسانوں اور زمینداروں کی باہمی کش مکش اور جاگیردارانہ نظام کی ہوس کاری کو اپنے خیالات کا موضوع بنایا ہے۔اُن کے خیالات کا معیار گاندھیائی ہے۔وہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ فساد کے سخت مخالف نظر آتے ہیں لیکن روحانی طور پر مسلے کا حل تلاش کرتے ہیں۔ چکر دھر اس کا مثالی کردار ہے جو ظلم کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے وہ مزدوروں کی ہمدردی کے لیے ہر وقت کوشاں نظر آتا ہے۔

ناول ''غبن'' (۱۹۳۰ء) جس میں اصلاحی نقطہ نظر سے معاشرتی اور سماجی زندگی کے بعض مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ناول میں سرسوتی پریس بنارس کے زیر اہتمام شائع ہوا۔اس ناول میں ہندوستانی معاشرے میں متوسط طبقے کے اقتصادی حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ناول میں سماج کو دکھانے کے لیے ایسے رویے اختیار کیے گئے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔اس ناول میں جالپا کا کردار ایک ادرش عورت کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے جو خوددار ہے اور اپنے شوہر کو بچانے کے لیے ہر طرح کے مصائیب کا سامنا کرتی ہے اس کے ساتھ رومانا تھ کا کردار حقیقی اور ارضی ہونے کے ساتھ ساتھ جاندار بھی ہے۔ پریم چند کا یہ ناول حقیقت نگاری اور فنی تکمیل کا ایک نیا معیار سامنے لاتا ہے۔

''میدان عمل''،جس کا شمار پریم چند کے مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے یہ ناول میں مکتبہ جامع دہلی کے زیر اہتمام

شائع کیا گیا۔اس ناول میں متوسط طبقے کے نوجوانوں، کاشتکاروں، مزدوروں اور دوسرے تمام افراد کی قومی جدو جہد کو پورے فنکارانہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں تحریک آزادی سے متعلق عوامی عمل اور ردعمل کی وہ سچی تصویر نظر آتی ہے جو صرف ایک بلند ترین ادیب ہی پیش کرسکتا ہے۔تکنیکی اعتبار سے بھی میدان عمل پریم چند کے گذشتہ ناولوں میں سے بہتر ہے اس ناول میں پریم چند ایک نئی منزل کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔ یہ منزل مثالیت پسندی سے حقیقت پسندی کی طرف ہے جو ''گئودان'' میں نکھر کر سامنے آتی ہے۔

پریم چند کا شاہکار ناول ''گئودان'' ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیانی عرصے میں لکھا گیا۔اور ۱۹۳۶ء میں سرسوتی پریس نے اسے شائع کیا۔ جو پریم چند کو ابدیت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ناول ''گئودان'' پریم چند کی دیہاتی زندگی کے تمام عمر کے مطالعے کا نچوڑ ہے جو کسانوں کی بے بسی اور کسمپرسی کی کہانی ہے۔ ہوری پریم چند کی تمناؤں کی محرومیوں کی علامت ہے جو صرف گائے کی تمنا لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔اردو اور ہندی کے بیشتر ناقدین نے گئودان کو نہ صرف پریم چند کا بلکہ اردو اور ہندی کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔

پریم چند کا آخری نامکمل ناول ''منگل سوتر'' ہے جو گاندھیائی خیالات سے بالکل الگ ہے اس ناول میں پریم چند نے ایک ادیب کو ہیرو بنایا ہے اور وہ ادیب پریم چند خود ہیں۔اس ناول کے چند صفحات جو ہندی میں شائع ہوئے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ ناول مکمل صورت میں شائع ہوجاتا تو غالباً پریم چند کو نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بے حد شہرت و مقبولیت حاصل ہوتی۔

5.7 خلاصہ

مجموعی اعتبار سے پریم چند کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں گاندھیائی نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ہر وقت کوشاں رہے۔اردو ناول کی دنیا میں پریم چند ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے اردو ادب کی خدمت میں پینتیس سال تک گراں قدر خدمات انجام

دیں اس طرح اردو ناول نگاری میں پریم چند کا مقام اہمیت کا حامل ہے۔نواب رائے سے پریم چند تک کا سفر اور پھر پریم چند کی کامیابی اُن کی محنت ولگن کا ثمر ہے جو انھیں صدیوں تک امر رکھے گا۔ پریم چند کی انفرادیت وعظمت وہ وقار رکھتی ہے جس کا جواب اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

5.8 فرہنگ

آدرش۔ اصول

اہتمام۔ بندوبست

مجموعی۔ تمام

ثمر۔ پھل

صنعت۔ پیشہ، ہنر

اقتصادی۔ مالی، معاشی

متفکر۔ فکرمند

مسلط۔ مقرر کیا گیا

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ پریم چند کی ناول نگاری کا جائزہ لیجئے؟

۲۔ پریم چند کے انداز بیان اور کردار نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کریئے؟

۳۔ پریم کے ناول نرملا کا تنقیدی جائزہ پیش کریئے؟

۴۔ پریم چند کے دور کے ناول نگاری کا جائزہ لیجئے؟

5.10 سفارش کردہ/حوالہ ذاتی کتابیں

پریم چند کی ناول نگاری۔ڈاکٹر یوسف سرمست

پریم چند: حیات اور فن۔ اصغر علی انجینر

پریم چند۔ جے کے مانک ٹالا

پریم چند کا فن۔فروفیسر شکیل الرحمان

پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ڈاکٹر شمیم نکہت

پریم چند کے ناول گئودان اور بازارِحسن کا تنقیدی مطالعہ

سبق کی ساخت:

6.1 تمہید

6.2 مقاصد

6.3 پریم چند کے ناول گئودان کا خلاصہ

6.4 پریم چند کے ناول گئودان کا تنقیدی جائزہ

6.6 پریم چند کے ناول بازارحسن کا خلاصہ

6.7 پریم چند کے ناول بازارحسن کا تنقیدی جائزہ

6.8 خلاصہ

6.9 فرہنگ

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.11 سفارش کردہ کتابیں

6.1 تمہید

اس سبق میں ہم پریم چند کے دو ناول گئودان اور بازارحسن کے گئودان پریم چند کا شاہکار ناول ہے اور اردو ناول کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پریم چند کا آخری ناول ہے جو 1936 میں شائع ہوا۔ اس میں ہندستان کے کسانوں کی تکلیف دہ زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ پریم چند نے دہقانوں پر ہونے والے ظلم کی نقشہ کشی کی ہے۔ یہ ناول ایک غریب کسان کی اس خواہش کے اردگرد گھومتا ہے کہ اس دروازے پر گائے بندھی ہو۔ یہ خواہش ذرا سی دیر

کے لئے پوری ہوتی ہے پھر ساری زندگی اسے مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بازار حسن پریم چند کا پہلا ضخیم ناول ہے جو 1916ء میں مکمل ہوا ۔اس وقت اس کی اشاعت کے لئے اردو میں کو ئی اچھا پبلیشر نہیں مل سکا، اس لئے 'سیوا سدن' کے نام سے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا اور کولکاتہ سے 1919ء میں ہوئی۔

6.2 مقاصد

اس سبق کے بعد آپ

ناول گئو دان کے خلاصہ کو سمجھ جائیں گے۔

ناول گئو دان کا تنقیدی مطالعہ پیش کر پائیں گے۔

ناول بازار حسن کا خلاصہ بیان کر پائیں گے۔

ناول بازار حسن کا تنقیدی جائزہ بیان کر پائیں گے۔

6.3 پریم چند کے ناول گئو دان کا خلاصہ

اس ناول کی کہانی مختصراً یہ ہے کہ بیلا ری گاؤں میں ایک کسان ہوری رہتا ہے ا۔اس گاؤں کے اشخاص کا تعلق مختلف حیثیت سے ہوری سے رہتا ہے اور اس کی زندگی کے واقعات ہی اس ناول کی کہانی ہیں ۔اس کی عورت کا نام دھنیا ہے جو تیز زبان مگر نہایت وفادار اور سلیقہ مند عورت ہے۔ ہوری کا لڑکا گوبر ہے جو لکھنو جا کر وہاں کی زندگی میں رنگ جاتا ہے۔ بگڑ جاتا ہے۔ تاڑی پیتا ہے مگر جب اسٹرائک میں جاتا ہے تو اس کو ہوش آتا ہے۔ گوبر ایک لڑکی دھنیا سے عشق کرتا ہیاور غیر قانونی طور پر اپنے یہاں رکھ لیتا ہے۔ جس پر برادری ہوری سے تاوان طلب کرتا ہے ۔ ہوری کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ اپنے دروازے پر گائے بندھی ہوئی دیکھے۔ وہ بھولا اہیر سے اس کو شادی کا لالچ دل کر ایک گائے لے لیتا ہے مگر اس کا بھائی ہیرا گائے کو حسد کے باعث زہر دیدیتا ہے۔ جو کچھ وہ کماتا ہے اپنی تین چار بیگھے کی کھیتی

میں لگا دیتا ہے اور محنت سے جو بھی پیدا کرتا ہے اس کو ساہوکار، زمیندار، اور مذہبی ٹھیکیدار مختلف بہانوں سے لے لیتے ہیں۔ آخر میں جب اس کی زمین رہن ہو جاتی ہے تو وہ دوسروں کی مزدوری کرنے لگتا ہے۔ ہوری کی دو بیٹیاں ہیں ایک روپا اور دوسرا سونا، سونا کی شادی تو ڈھنگ سے ہوتی ہے مگر روپا کو مفلسی کے باعث دوسو روپیہ کی لالچ میں وہ ایک چالیس برس کی ادھیڑ برس کے آدمی سے بیاہ دیتا ہے۔ اس کا لڑکا گوبر اس کی مدد نہیں کرتا اِس مفلسی میں وہ ایک دن مزدوری کرنے جاتا ہے۔ اس کو گرم ہوا یعنی لو لگ جاتی ہے اور اور وہ مر جاتا ہے۔

گئودان کا موضوع نہایت اعلی ہے۔ پریم چند اس کے ذریعہ اس زندگی سے نا آسودگی کا اظہار کرتے ہیں جو ہوری کے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ پریم چند کا تخیل انسانی ہمدردی کے محور پر گھومتا ہے جو ایک مخصوص انداز، تہذیب اور زبان میں ظاہر ہوتی ہے۔ ناول میں نا آسودہ ماحول اور مظطرب دلوں کی تصویر کشی ہے۔ گئودان در حقیقت پریم چند کے شعور کے ارتقاء اور ادراک حقیقت کے واضح نشانات کا غماز ہے ۔۔ موضوع کی وسعت، دلکشی، قوت اور جزئیات نگاری میں یہ ناول ممتاز ہے۔ فکر و فن کے جلوے پورے ناول میں اسطرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے آسمان پر ستارے۔ اس سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند کی ہندو تہذیب سے واقفیت اور اس کو فن کے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت درجہ کمال تک پہونچ چکی تھی۔

پریم چند کا اسلوب مخصوص امتیازات کا حامل ہے۔ اس میں چند امور قابل غور ہیں۔ دور جدید میں پریم چند نے اپنے افسانے اور ناول میں ایک سیدھا اور دلکش اسلوب استعمال کر کے نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا ہے اور افسانوی ادب میں ایک صالح قدر کا اضافہ کیا ہے۔ اردو کے وہ ناقد جو پریم کی ناول نگاری کے زیادہ قائل نہیں وہ بھی ان کی زبان کی خوبیوں کے معترف ہیں۔ ان کا طرز بیان ان کی شخصیت کی طرح سادگی کا ترجمان ہے۔ کہا جات اہے کہ اسلوب خود انسان کی ذات ہے۔ پریم چند پر یہ کیفیت زیادہ واضح ہے۔ سادگی، صفائی، بے ساختگی، اور شگفتگی ان کی تحریر کی روشن صفات ہیں۔ ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں دریا کی سی روانی ہے۔ اس میں ذہن کو غذا اور جذبات کو گرمی عطا ہوتی ہے۔ فراق گورکھپوری نے ان کے بارے میں بالکل صحیح رائے دی ہے کہ "ان کی نثر رواں، دقیق اور مستحکم ہے، ان کا طرز تحریر ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔

ان کے اسلوب کا ایک پہلو یہ ہے کہ جہاں انہونے معاشرتی زندگی کا بیان کیا وہاں ان اک اسلوب زیادہ نکھر

کر آیا ہے۔ چنانچہ سردار جعفری لکھتے ہیں ''ان کی حقیقت نگاری جتنی گہری ہوتی گئی اور وہ عوام سے جتنے قریب آتے گئے اتنی ہی ان کی زبان بدلتی گئی۔ اور اسلوب کے نظرئے سے ایک اہم بات یہ کہ آخری دور میں جب ان کا اسلوب منفرد اور مستقل حیثیت اختیار کیا جا چکا تھا۔ اس میں ہندی الفاظ کی بھر مار نظر آتی ہے اسکی وجہ ان کا اپنی تہذیب، تمدن، مذہب ،تاریخ، اور معاشرت کے طرف رجحان اور میلان ہے۔ انہوں نے اردو کو اس کے فارسی رنگ سے ہٹا کر اپنے غیر مسلم معاشرہ میں لانے کی کوشش کی ۔ پوری کتاب میں مرزا خورشید کے علاوہ کوئی مسلم کردار نہیں حالانکہ ہمارے دیہاتوں میں مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ رہتے اور بستے ہیں لیکن پریم چند کی کوشش یہ تھی کہ اردو کو ہندی سے قریب کر دیں چنانچہ پریم چند نے نہ صرف ہندی و سنسکرت الفاظ سے اردو کے دامن کو پر کر دیا بلکہ عربی اور فارسی کے الفاظ کے اندر ایک تحریک چلائی۔ اور ایک وجہ یہ بھی کہ ہندی کے ان الفاظ پر ہندوستانی تہذیب کی چھاپ ہے اس لئے پریم چند نے درحقیقت ہندی زبان کی توانائی اور ہندی تہذیب کی عظمت سے اردو اسلوب میں ایک جاندار عنصر داخل کر دیا۔

اور ایک اہم بات یہ کہ ان کی مکالمانہ بڑی فن کارانہ ہے۔ انھیں اس امر کا خاص سلیقہ ہے۔ انہوں نے ہر طرز کے مکالمے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ ان کے مکالمات میں تنوع ہے اور ان میں حقیقت کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہر کردار کے مخصوص انداز گفتگو، لب ولہجہ کا فرق اور انفرادیت کو انہوں نے پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''مکالموں کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف نفسیات اور حالات سے مطابقت رکھتے ہوں، بلکہ آسان، عام اور فہم اور سلجھے ہوں''۔

پریم چند کی زبان میں ایک خاص طرز کی عوامیت ہے ان کی تشبیہوں میں حقیقت کا جلوہ ہے ان کے الفاظ میں عوام کی زبان پائی جاتی ہے ان کی ترکیبوں میں ہندی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے، جہاں وہ غیر معمولی عبارت لکھتے ہیں، وہاں وہ فاسی انداز کی تشبیہ اور زبان استعمال کرتے ہیں مثلاً:۔ "مہتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، آتی ہو بار بار آتی ہو۔ خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح، تصور کے ایک عکس کی طرح اور پھر غائب ہو جاتی ہو دوڑتا ہوں کہ تمہیں ہاتھوں سے جکڑ لوں مگر ہاتھ کھلے رہ جاتے ہیں اور تم ہوا ہو جاتی ہو" ص ۵۱۲ یہاں اسلوب میں جو کیفیت ہے وہ عام ادبی کیفیت سے بلند ہے۔ وہ اکثر حسن تشبیہ کے ذریعہ عبارت کو پر بہار بناتے ہیں مثلاً

"دوسروں کی تکلیف دور کرنے میں اس نے جو خوشی محسوس کی وہ کبھی عیش و

آرامم کی زندگی میں نہ ملی تھی۔ وہ ہوس ان پھولوں کی طرح کمزور ہوگئی تھی جن
میں پھل لگ رہے ہوں" ص ۵۷۷

یہاں جو تشبیہ ہے وہ نہایت حقیقی اور دلکش ہے مگر تخیل س سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔ مہتا کے جذبات مالتی کے بارے میں ملاحضہ ہوں:۔ "اندر کی خوہشیں باہر آ کر گویا ہیچ ہوگئی تھیں اس کا روں رواں پھول اٹھا۔ جس سرور کو اس نے نایاب سمجھ رکھا تھا وہ اتنا قابل حصول اور اتنا قریب ہے اور دل کا وہ سرور چہرے پر آ کر اسے ایسی رونق دینے لگا کہ مہتا کو اس میں دیوتا پن کی سی جھلک دکھائی پڑی۔ یہ عورت ہے یا خیر اور پاکیزگی اور ایثار کی مجسم مورت (ص ۵۵۶)

پریم چند کی جبان میں نشیب و فراز ہے کہیں موضوع کے لحاظ سے بہت بلند خیالات کی ترجمانی ہے، کہیں بالکل عوامی احساسات کی جلوہ گری ہے کہیں واقعات کا بیان ہے تو کہیں ماضی کی یاد میں حقیقت کے جلوے کرداروں کی زبان سے بیان ہوئے ہیں مثلاً:۔

"ہوری کی آنکھیں نم ہوگئیں، دھنیا کی یہ نسوانی محبت اس تاریکی میں بھی گوی اچراغ کی طرح اس فکرمند صورت کو منور کر رہی تھی، دونوں کے دل میں گویا گذرا ہوا شباب جاگ اٹھا تھا۔ ہوری کو اس ڈھلی ہوئی عورت میں وہی نرم و نازک دل والی لڑکی نظر آئی جو پچیس (۲۵) سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی، اس گلے لگنے میں کتنا اتھاہ پریم تھا"

عورت کے حسن تخیل کے بارے میں ایک اقتباس ملاحضہ ہو۔

"جب وہ رامو کو سینے سے لگا کر اس کے منہ میں دودھ ڈالتی تو گویا اس کا دل بچے کی تازگی سے بھر جاتا تب وہ پیارے پیارے گیت گاتی اور میٹھے سپنے دیکھتی اور نئی نئی دنیا بساتی جس کا راجا رامو ہوتا'' (ص ۵۶۹)

یہاں پریم چند نے عورت کی نفسیات اور نئی ہستی سے اس کی امیدوں اور آرزؤں کی عمدہ تصویر پیش کی ہے زبان بھی دلکش استعمال کی گئی ہے ان کا تجربہ اور مشاہدہ اس طرح ان کی زبان کو حسن کی جادو سے بھر دیتا ہے، کہ آدمی اس سے تاثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا خصوصا یہ باتیں جس پس منظر میں کہی گئی ہیں ان میں اس سے زیادہ دلکش اور انسانی

جذبات وکیفیات نفس کی ترجمانی ممکن نہ تھی۔ گوبندی کی شاعری کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں:۔

''اس کی نظم صرف دل کی لہر اور تخیل کی اڑان نہ تھی بلکہ اس کے ایک ایک لفظ میں اس کی زندگی کا درد اور اس کے آنسوؤں کی ٹھنڈی جلن بھری ہوئی تھی۔ کسی ایسی جگہ جا بسنے کی خواہش تھی وہ ظاہر داریوں اور رغبتوں سے دور رہ کر اپنی پرسکون کٹی میں قدرتی مسرت کا لطف اٹھائے "

چونکہ گوبندی کے شوہر کھنا کی زندگی عیش پرستی، ظاہر داری، دنیا داری اور عیش وعشرت کی تھی جس کو وہ ناپسند کرتی تھی، وہ جلتی تھی۔ وہ اپنے نظموں اظہار غم سے اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی۔ یہاں حسن بیان بھی قابل لحاظ ہے۔ مہتا، سٹر کھنا سے ان کے مل کے جل جانے کے بعد کہتے ہیں:۔

" کھنا جی ذرا صبر سے کام لیجئے، آپ سمجھدار ہو کر دل اتنا چھوٹا کرتے ہیں، دولت سے آدمی کو جو وقار ملتا ہے وہ اس کا وقار نہیں بلکہ اس کی دولت کا وقار ہے، آپ مفلس رہ کر بھی دوستوں کی عقیدت کے مستحق رہ سکتے ہیں اور دشمنوں کے بھی۔ بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن نہ رہے گا"(ص ۴۷۹)

اس طرز کے اعلیٰ خیالات مہتا، مالتی اور گوبندی کے مکالموں میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ان میں پریم چند کے فکری ارتقا کی عظمت محسوس ہوتی ہے اور انھیں عبارتوں میں ان کی زبان بھی حکیمانہ قالب اختیار کر لیتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ پریم چند کی زبان پر ہندیت اور دیہاتیت کی چھاپ لگی ہے۔ اس کو ہم ہندوستانیت اور وعامیت سے تعبیر کر سکتے ہیں مگر ناول کے بیہت سے حصے ایسے ہیں جو نہایت عمدہ ادبی اردو میں پیش کئے ہیں، جن میں حسن تخیل، تشبیہ واستعارہ اور حقائق کے جلوے اس طرح بکھرے ہیں جیسے ستارے تاروں بھری رات میں آسمان پر بکھرے ہوں۔

مندرجہ بالا عبارتوں میں مصنف نے زبان و بیان کے لحاظ سے دلکش انداز پیش کیا ہے۔ انکی زبان حالات، واقعات، موضوع اشخاص اور مواقع کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کہیں بالکل دیہاتی ہوجاتی ہے، کہیں بالکلشہری، کہیں بہت شیریں اور فصیح، کہیں بالکل فلسفیانہ اور کبھی تشبیہ واستعارہ سے پرتو کبھی نفسیاتی گتھوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

پریم چند اس میدان میں بھی سب سے نرالے ہیں کہ انہوں نے اولا اسلوب کو فارسی کے بجائے ہندوستانی ماحول میں ڈھالا، دوسرے یہ کہ انہوں نے تشبیہ واستعارہ کو معاشرتی رنگ سے ہم آہنگ بنادیا۔ انہوں نے ایسے

استعارے پیش کئے جن سے ہم خوب واقف ہیں اور جن کو سن کر عوام بھی لطف لے سکیں ۔انہوں نے عوامی محاورے ،روزمرہ ،الفاظ اور تلمیح پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تشبیہ و استعارے کا ایسا ذخیرہ اردو میں داخل کر کے اردو کے دامن ادب میں اضافہ کیا۔ چند مثالیں ملاحضہ ہوں:

ا:۔مس مالتی ''مہتا کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی جیسے کوئی نو مرید اپنے نئے عقائد کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے''

۲:۔کمبخت کہیں گڑے مردے نہ اکھاڑنے لگے ورنہ سیاسی خوش نصیبی سپنے کی طرح غائب ہو جائے گی

۳:۔ بھنگ کا نشہ رفتہ رفتہ نیند کی طرح آتا ہے اور دماغ پر چھا جاتا ہے ۔شراب کا نشہ ان (اونکار ناتھ) پر شیر کی طرح جھپٹا اور دبوچ بیٹھا۔

پریم چند نے شخصیتوں کے دلچسپ مرقعے کھینچے ہیں ،انھوں نے کرداروں کی شکلیں اس انداز سے پیش کئے ہیں جن سے ان کے اعمال بھی مصور ہو جاتے ہیں،مثال کے طور پر:۔

''سٹھانی کو جاتے دیر نہ ہوئی تھی کہ منگرو ساہ آپہونچے ۔سیاہ رنگ ،توند کمر کے نیچے لٹکتی ہوئی، دو بڑے بڑے دانت سامنے جیسے کاٹ کھانے کو نکلے ہوئے ،سر پوٹو پی ، گلے میں چادر،عمر میں پچاس (۵۰) سے زیادہ نہیں مگر لاٹھی کے سہارے چلتے تھے ۔گھٹیا کا عارضہ تھا،کھانسی بھی آتی تھی ۔لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہوئے اور اور ہوری کو ڈانٹ بتائی'' پہلے ہمارے روپے دے دو ہوری تب اوکھ کاٹو ،ہم نے روپے ادھار دئے تھے دان نہیں دیا تھا۔تین تین سال ہو گئے نہ سود نہ بیاج مگر یہ نہ سمجھنا کہ تم میرے روپے ہجم کر جاؤ گے ،میں تمہارے مردے سے بھی وصول کر لونگا'' (ص ۳۰۱)

یہ شکل اور یہ انداز کسی خون چوس دیہاتی ساہوکار،سودخوار کی شخصیت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے ۔ پریم چند نے جتنے عمدہ شز شخصیتوں کے خدوخال پیش کئے اس کی مثال کم ملتی ہے اب ایک دوسرا واقعہ ملاحضہ ہو:۔

'' دلاری ہاتھ پیر میں موٹے موٹے چابدی کے کڑے پہنے ،کانوں میں سونے کے جھمکے ڈالے ،آنکھوں میں کاجل لگائے ،بوڑھے شباب کو رنگے اور سنوارے ہوئے آکر بولی ' پہلے میرے روپئے دو تب اوکھ کاٹو میں جتنا کم کھاتی ہوں تم اتنے ہی سیر ہوتے ہو''

یہاں پریم چند نے شخصیتوں کے خاکے ان کے کردار کی مناسبت سے کھینچے ہیں ۔انہوں نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ان کی تصویریں حقیقت سے مطابقت رکھتی ہوں ۔انہوں نے قلم کے ذریعہ سے کرداروں کی معنوی اور ظاہری قسم

کی تصویریں پیش کی ہیں۔

پریم چند نے اردو ادب کو پہلی بار معاشرتی زندگی کی ان اکیفیات سے آگاہ کیا ہے۔جن کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہے۔انہوں نے ہوری اور دھنیا کی رنجشوں اور محبتوں کے ذریعہ بڑے دلکش جذبات کی ترجمانی کی ہے۔کبھی مایوسی کے جذبات ہیں کبھی خوشی کے،کبھی بڑھاپے میں جوانی کی حسین یاد ہے تو کبھی مالی پریشانی کا دکھڑا ہے۔غرض ہر دیہاتی کردار زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جن سے ہم پوری طرح آشنا نہ تھے۔شہری زندگی کی معاشرت کا بیان اردو میں بہت ہے مگر دیہاتی زندگی کی جزئیات نگاری اور جذبات نگاری پہلی بار گئودان کے ذریعہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہیں موت کی تصویر ہے تو کہیں کھیت کی،کہیں جذبات ہیں تو کہیں نفرت غرض پورا ناول انسانی جذبات کا ایک سمندر ہے جس کے کناروں کا پتہ نہیں۔

گئودان میں منظر نگاری میں بڑی دلکش ہے۔یہ منظر نگاری کہیں انسانی معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویروں سے متعلق ہے اور کہیں مناظر فطرت سے متعلق ہے۔ان کی منظر نگاری کے بارے میں ڈاکٹر رام رتن لکھتے ہیں کہ ان کی منظر نگاری زبان کے جگمگاتے ہیرے ہیں۔وہ قدرت کے حسن فراواں اور دلکشی میں انسانوں کے دکھوں کا مداوا ڈھونڈتے ہیں۔انھیں قدرت کے بے پاں حسن اور دلکش مناظر میں انسان کے دکھ کی یاد ستاتی ہے۔وہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت سے لطف لینے سے غریب عوام و کسان محروم ہیں۔یہاں ان کی منظر نگاری کے کچھ نمونے پیش ہیں:۔

''کاتک کی روپہلی چاندنی ساری فضا پر کسی میٹھے راگ کی طرح چھائی ہوئی تھی۔سلیا گھر سے نکلی وہ سونا کے پاس جا کر اسے یہ مژدہ سنائے گی اب اس سے نہیں رہا جاتا۔ابھی تو شام ہوئی ہے۔ڈونگی اس پار تھی اور ملاح کا کہیں پتہ نہیں۔چاند گھل کر جیسے ندی میں بہا جا رہا تھا وہ ایک لمحہ کھڑی سوچتی رہی پھر ندی میں گھس پڑی۔ندی میں کچھ ایسا زیادہ پانی تو کیا ہوگا۔اس خوشی کے سمندر کے آگے ندی کیا چیز ہے۔''

پریم چند منظر کشی کے بادشاہ نظر آتے ہیں۔ایک دیہاتی لڑکی جو مہتا کو شکار میں ملی تھی اور ان کے لئے کھانا پکایا تھا۔اس کی تصویر ملاحضہ ہو:

''لڑکی ہاتھوں میں آٹا بھرے ہوئے،سر کے بال بکھرے،آنکھیں دھوئیں سے سرخ اور اشک آلود،کل بند پسینہ سے تر جس سے اس کا ابھرا ہوا سینہ صاف جھلک رہا تھا آ کر کھڑی ہوگئی'' (ص ۱۳۷)

''وہ دوڑتی، ہانپتی، چلی آ رہی تھی وہی کالی کلوٹی لڑکی، ہاتھ میں ایک جھاڑ لئے ہوئے۔ پاس آ کر مہتا کو کہیں جانے کے لئے کہیں تیار دیکھ کر بولی۔ میں وہ جڑی کھوج لائی ابھی گھس کر لگاتی ہوں مگر تم کہاں جا رہے ہو۔ ماس تو پک گیا ہوگا۔ میں باٹیاں سینکنے دیتی ہوں وہ ایک کھا لینا، بائی دودھ پی لیں گی، ٹھنڈے میں چلے جانا''۔

ان سطور میں مصنف نے گھریلو لڑکیوں اور ان کے خلوص کا بڑا عمدہ نقشہ پیش کیا ہے۔ اس میں اس وقت کی حالت دکھائی ہے جب شمالی ہند میں عورتیں روٹی پکاتی ہیں، سیروں روٹیاں اور گرمی کے موسم کی وجہ سے وہ پسینہ شرابور ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اقتباس میں اس لڑکی کی مہمان نوازی کی جذبات کو مصور کیا گیا ہے۔ اس طرز کی عبارتوں سے گئودان مملو ہیں، جہاں اصلی زندگی کے حقیقی نقشے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

اب ایک دوسرا منظر ملاحضہ ہو:

''پھاگن اپنی جھولی میں نئی زندگی کی پونجی لے کر آیا ہو نچا تھا آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی مہک بکھیر رہے تھے اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی اپنے رگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی'' (ص ۳۳۳)

یہاں مصنف نے آم کی کے بور کی مہک اور کوئل کی کو کا ذکر کر کے دیہاتی زندگی کے ایک نہایت دلکش پہلو کو پیش کیا ہے۔

پریم چند نے حسب موقع جاڑے، گرمی، برسات اور دوسرے فطری و موسمی حالات کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ اکثر ان مناظر کی حقیقی کیفیت ان کی عبارت کو جاندار بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر:

''سورج سر پر آ گیا تھا۔ اس کی تپش سے متاثر ہو کر پیروں نے اپنا پھیلاؤ سمیٹ لیا تھا۔ آسمان غبار آلود ہو رہا تھا اور سامنے کی زمین کانپتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی''

''ندی کے کنارے چاندی کا فرش بچھا ہوا تھا اور ندی جواہرات سے جڑے ہوئے گہنے پہنے میٹھے سروں میں گا گا کر چاند اور تاروں اور غنودگی کی حالت میں سر جھکائے پیڑوں کو اپنا رقص دکھا رہی تھی''

مصنف نے دونوں جگہ ایسی تصویر پیش کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قلم الفاظ کا حسن بکھیرتا ہے، جذبات کے دریا بہاتا ہے اور حقائق کے جلوے دکھاتا ہے۔

گئودان کے تمام کرداروں میں سب سے مکمل کردار ہوری کا ہے۔ ہوری ایک مصلحت پسند اور ہوشیار کسان

ہے۔وہ رائے اگر پال سنگھ کے پاس جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے،خوشامد کرتا ہے اور اپنا وقت جائع کرتا ہے۔اس کا مقصد اس سے محض یہ ہوتا ہے کہ زمیندار اس کے ساتھ رعایت کرے اور لگان وغیرہ میں سختی نہیں کرے۔

ہوری کے کردار میں انسانی نفسیات کی بڑی عمدہ تصویر ملتی ہیں۔اس نے چودھری کے ہاتھ بیس (۲۰) روپئے سیکڑے میں بانس بیچے اور چودھری سے کہا کہ تم میرے بھائی سے کہنا پندرہ (۱۵) روپئے سیکڑہ میں بانس بکے ہیں،اس طرح وہ چاہتا تھا کہ کچھ پیسہ بھائی سے زیادہ مل جائے۔

اس کو اپنی خاندنی عزت کا پاس ہے۔جب اس کا بھائی ہیرا گائے کو زہر دیتا ہے تو اس امر پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اس ی طرف سے قرض لے کر تھانیدار کو دے دے اور اپنے بھائی کو رسوئی سے بچالے۔وہ ہر موقعے پر خاندانی وقار کی حفاظت کے لئے تیار رہتا ہے۔ویسے وہ وسیع النظر کسان ہے ورنہ اتنا روایت پرست کسان کبھی گوارا نہیں کہ اپنے گھر میں سلیا جیسی عورت کو پناہ دے جو سوسائٹی میں بدنام تھی اور جو چمار کی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔یہ بڑی ہمت اور عالی ظرفی کی بات ہے کہ وہ عشق کو برا نہیں تصور کرتا اور جھنیا کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور اپنی بہو بنالیتا ہے۔

پریم چند سے یہاں یہ غطی ہوئی ہے کہ انھوں نے ہوری کی ذات ظاہر نہیں کی دوسرے یہ کہ انھوں نے اس مشہور و معروف رواج کا ذکر بھی نہیں کیا ورنہ اس قسم کے ناجائز تعلقات سے سماج میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے کردار میں مجبوری،ناداری اور ناتمام آرزوئیں قاری کے دل کو متاثر کرتی ہیں وہ ایک گائے کی آرزو رکھتا ہے۔مگر یہ اس کا یہ ارمان کبھی پورا نہیں ہوتا،کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب اس کو گائے مل جائے گی مگر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا ہے۔

دھنیا کا نقطہ شروع میں ہی واضح ہو جاتا ہے جب ہوری زمیندار کے یہاں جا کر اپنی سعادت مندی ظاہر کرتا ہے اور خوشامد کرتا ہے مگر دھنیا اس کے اس عمل کو بے حد ناپسند کرتی ہے۔وہ صاف کہتی ہے کہ لگان ادا کرنے ،نذرانہ دینے اور بے گار کرنے کے بعد خوشامد کرنے اور حاضری دینے کی قطعا ضرورت نہیں۔

اس کی دوسری خوی یہ کہ وہ ظلم کو سخت ناپسند کرتی ہے۔وہ طالموں سے نفرت کرتی ہے،ان کو برا بھلا کہتی ہے اور اپنی غربت و افلاس کا ذمہ دار انھیں سرمایہ دار کو قرار دیتی ہے وجو زمیندار،مہاجن اور مذہبی پیشواؤں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس کی خون پسینہ کی کمائی غصب کر لے جاتے ہیں۔

جب جھنگڑی سنگھ اپنے مطالبہ کے بدلے میں ایکھ کا کھیت کٹا لیتے ہیں تو وہ کہتی ہے سینچا گوڑا ہم نے، محنت ہم نے کی اور مزے اڑایا جھنگڑی سنگھ نے۔

دھنیا ایک غیرت مند عورت ہے وہ رقیب برداشت نہیں کرسکتی جب کبھی ہوری سٹھانی دلاری کے یہاں جاتا ہے دھنیا اس کی نگرانی کرتی ہے اس کا اس سے ہنسی مذاق برداشت نہیں برسکتی ہے۔ مگر ایک طرف وہ ایک وفا شعار ہندوستانی عورت بھی ہے جو شوہر کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار ہے وہ اس کی مرضی کے لئے مشکلات کی برداشت کرتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحضہ ہو

''مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا امید کے مٹے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کر پنا بناتی اور کبھی ہوری کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی، کیا کرے پیسے نہیں ہیں، ورنہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر بلاتی۔ دھنیا مشین کی طرح اٹھی آج جو ستلی بیچی تھی اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی مہراج! گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا، نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں یہی ان کا گئو دان ہے اور غش کھا کر گر پڑی'' (ص ۵۹۶)

گوبر ایک لاابالی نوجوان ہے وہ بھی اپنے باپ کی روش سے غیر مطمئن ہے۔ وہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کا باپ زمیندار کی خوشامد کرے اور اسی لئے جب ہوری رائے صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو کر اور یہ خیال لے کر لوٹتا ہے کہ بڑے لوگ ہم سے زیادہ دکھی ہیں اور جب اپنے اس خیال کا اظہار وہ گوبر پر کرتا ہے تو گوبر کہتا ہے ''جسے دکھ ہوتا ہے وہ درجنوں موٹر نہیں رکھتا، محلوں میں نہیں رہتا، حلوا پوری نہیں کھاتا اور نہ ہی ناچ رنگ میں پھنسا رہتا ہے۔ آرام سے راج کا سکھ بھوگ رہے ہیں، اس پر دکھی بنتے ہیں'' (ص ۲۷) اور شہر سے واپس آنے کے بعد تو گوبر کا یہ خیال انتہائی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ شہر کے تجربہ میں وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ بڑے لوگوں میں بناوٹ ہی بناوٹ ہوتی ہے۔ شہر پہونچ کر اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے، وہ کسان سے مزدور بن جاتا ہے، آمدنی بڑھ جاتی ہے اور جب وہ شہر سے گاؤں واپس آتا ہے تو اس کے سوچنے کا ڈھنگ ہی دوسرا ہوتا ہے، اسے زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم وستم کے ساتھ ساتھ ساہوکاروں کے ظلم کا بھی احساس ہوتا ہے، وہ سیلاب کی طرح بڑھنے والے سود کے خلاف بھی آواز اٹھاتا ہے۔ وہ گاؤں کے ساہوکار پنڈت داتا دین سے کہتا ہے ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے بیل کے لئے تیس روپئے دئے

تھے،اس کے سو ہوئے اور اب سو کے دوسو ہو گئے۔اس طرح تم لوگوں نے کسانوں کو لوٹ لوٹ کر مجور بنا ڈالا اور آپ ان کی جمین کے مالک بن بیٹھے'' (ص۳۵۹)

لیکن ہوری جو پرانی قدروں کا حامل ہے، ہر طرح ڈرا ہو ہے، اپنے خیال میں سچائی کا پہلو لے کر کہتا ہے'' دھرم نہ چھوڑنا چاہئے بیٹا، اپنی اپنی کرنی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ہم نے جس بیاج پر روپئے لئے تھے وہ تو دینے ہی پریں گے۔پھر باہمن ٹھہرے، ان کا پیسہ کہیں نہیں بچے گا'' (ص۳۶۱)

گوبر ہوری کی طرح ڈرا اور سہا ہوا نہیں ہے۔اس کی رگوں میں جوشیلا خون ہے، اسی لئے وہ کھنہ مل کی ہڑتال میں بھی بڑے عزم اور حوصلہ سے حصہ لیتا ہے اور فساد میں زخموں سے چور ہو کر مہینوں بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہتا، وہ ایک نقلابی نوجوان ہے اور اس کے کردار میں پریم چند نے محنت کش طبقہ کے انقلابی شعور کی نمائندگی کی ہے۔ایک جگہ وہ کہتا ہے:

'' یہی جی چاہتا ہے کہ لاٹھی اٹھاؤں اور پٹیشوری، داتا دین اور جھنگری سب سالوں کو مار کر گرادوں۔اور ان کے پیٹ سے روپئے نکال لوں'' (ص۳۴۴) گوبر کا یہ انقلابی شعور بدلتے دور کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔اس کے علاوہ بھی مسٹر مہتا و مس مالتی وغیرہ کی جاندار کردار ہیں۔

اس ناول سے اردوں داں طبقوں میں اجنبیت اور نامانوسیت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں جس سے اردوداں طبقہ بالکل ناواقف ہیں اور یہ اس کے لئے اس کے لئے ثقیل ہے۔اجنبیت کی دوسری وجہ اکثر نامانوس انداز تعبیر ہے، کسی بات کو کہنے کے لئے 'دھرم' کا استعمال اکثر کیا گیا ہے جس سے ہم واقف نہیں۔

گوبر اپنے آپ سے کہتا ہے:

'' بھگوان اب تمہارا ہی بھروسہ ہے میں نہ جانتا تھا کہ اس سنکٹ میں جان پڑے گی۔جھنیا اپنے من میں کتنا مکار، ڈرپوک، کمینہ سمجھ رہی ہوگی مگر اسے مار کیسے سکتے ہیں اگر جھنیا پر ہاتھ اٹھائی تو مہا بھارت ہو جائے گی۔ماں باپ جب تک لڑکوں کی اچھا کریں تب تک ماں باپ ہیں۔جب ان میں ممتا ہی نہیں تو کیسے ماں باپ؟'' (ص۲۲۷)

گوبر کی دئی کی ماں سے کہتا ہے:

''تم بڑی ہو ماتا جی! پوجنے جوگ ہو۔ پتر ماتا کی رن سے سو جنم بھی لیکر ارن نہیں ہوسکتا۔ کروڑ جنم لے کر بھی نہیں۔ بوڑھی اس بے حساب بھگتی پر مگن ہوگئی''

اس ناول کا ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستان میں ذات پات کی بنیادوں جو سماج میں مسائل وجود میں آتے ہیں ان کا ذکر نہیں۔ یہ حقیقت ہے انھیں خطوط پر الکشن لڑے جاتے ہیں اور انھیں کے تحت تمام مسائل طے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم اور ان کے اثرات سے ناول میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے بلکہ اس کے اثرات کے مطالعہ کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ زمیندار اس زمانے میں گاؤں میں جس طرح دورے کرتے تھے، ضلع دار آتے تھے اور زمین داروں کی آمد پر جس طرح نذرانے، تحائف اور رشوتیں وصول کی جاتی تھیں جس طرح غریب کسانوں کی پیٹائی ہوتی تھی اور ان کو مرغا بنایا جاتا تھا ان تمام امور سے کتاب کے ارواق کھالی ہیں۔

اور ایک اہم بات یہ بھی کہ جن لوگوں کو دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل سے سابقہ پڑا ہے وہ کوب جانتے ہیں کہ دیہاتی سماج باہمی مناقشت اور نزاعوں سے پر رہتا ہے۔ پٹی داری، رقابت، حسد، درختوں کے جھگڑے، جائیداد کی نزاعت اور نالیوں کے بارے میں لڑائی، باہمی پارٹ ی بندیاں اور اس قسم کے عناصر دیہاتی زندگی میں اہم رول ادا کرتے ہیں مگر گئودان میں ان کا کوئی ذکر نہیں، میلی اور بازاروں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ دیہاتی سماج کے ان مناظر کی تصویر کشی آسانی سے ہوسکتی تھی اگر ناول میں شہری زندگی کے عناصر کو جگہ نہیں دی جاتی۔

6.4 ناول بازارِ حُسن کا خلاصہ

بازارِ حسن پریم چند کا پہلا ضخیم ناول ہے جو 1916ء میں مکمل ہوا ۔اس وقت اس کی اشاعت کے لئے اردو میں کوئی اچھا پبلیشر نہیں مل سکا، اس لئے 'سیوا سدن' کے نام سے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا اور کولکاتہ سے 1919ء میں ہوئی۔ ہندی میں جو اس ناول کو مقبولیت حاصل ہوئی اور ہندی ادب کے ناقدوں نے اسے جس طرح سراہا اردو میں اسے وہ درجہ نہیں مل سکا۔ اس کے سبب ظاہر ہے یہ پہلا ناول ہے جس نے ہندی ناول نگاری میں فنی تکمیل کا ایک اعلی

معیار پیش کیا۔ پھر مصنف نے اس میں جن مسائل کو موضوع بنایا ہے اور جس زاویۂ نظر سے پیش کیا ہے وہ ہندی ادب میں بالکل نیا اور چونکا دینے والا تھا لیکن اردو میں صورت حال اس سے مختلف تھی۔

یہاں ناولوں کی روایات پچاس سال کی مدت میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ناول سے سماجی اصلاح کے امکانات واضح ہو چکے تھے۔ رسواؔ اور شررؔ کی کوششوں سے اس کے فن میں ایک تروتازگی پیدا ہو چکی تھی۔ یہی نہیں اردو کے یہ ناول اپنے عہد کی زندگی اور معاشرت کی بسیط فضا کو اپنے دامن میں سمیٹ چکے تھے۔ طوائف کا کردار اور موضوع اردو ناول کے لئے نیا نہیں تھا۔ نذیر احمد کے 'فسانۂ مبتلا' کی ہریالی، سرشار کے 'سیر کہسار' کی قمرن، 'جام سرشار' کی ظہورن اور رسوا کی خانم خورشید، بسم اللہ جان اور امراؤ جان ایسے جیتے جاگتے کردار ہیں جن سے اردو داں حلقہ اچھی طرح مانوس تھا۔

اور دوسری بات اس زمانے میں سامراج حکومت کے خلاف کئی تحریکیں وجود میں آئی تھیں جن سے متوسط طبقہ کے عوام میں جارحانہ گرم جوشی پیدا ہو چکی تھیں۔ اور سارے ملک میں اصلاحی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ متوسط طبقہ کے دانشور اور تعلیم یافتہ افراد ملک کے سماجی مسائل پر اب کچھ قسعت نظر کے ساتھ سوچنے لگے تھے۔ شہروں میں قومی تعمیر کے ساتھ اصلاحی ادارے اور افراد اور تنظیم تندہی سے کام کرنے لگے تھے۔ مغربی تعلیم اور تہذیب کے زیر اثر نوجونوں میں یہ بصیرت عام ہونے لگی تھی کہ اپنے روایات رسم ورواج اداروں ضابطوں کو افادیت اور علقیت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور جو چیز قومی تعمیر کی راہ میں رکاوٹ ہو اسے ہٹا دیا جائے۔

6.5 ناول بازار حسن کا تنقیدی جائزہ

بازار حسن کا موضوع شہری زندگی کی معاشرتی پراگندگیاں اور شہر میں رہنے والے متوسط طبقہ کے مسائل ہیں۔ اور اس ناول میں پریم چند نے معاشرتی خرابیوں کو ان کے وسیع سماجی، اخلاقی اور اقتصادی پس منظر میں دیکھا ہے، ان کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی غور کیا ہے اور پھر اپنے مشاہدے اور مطالعے کی روشنی میں ان کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار سمن ہے۔ اس کی زندگی کے پیچ وخم سے ہی ناول کے بنیادی مسائل سامنے آتے ہیں اور

پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی عام لڑکی ہے۔ تھانیدار کرشن چندر کو اپنی اس بیٹی کے جہیز کے لئے چار پانچ ہزار روپئے درکار ہے۔ وہ ایک اصول پرست آدمی ہیں۔ تھانیدار ہو کر بھی کبھی رشوت نہیں لی۔ لیکن اس رقم کے بغیر کسی اچھے گھرانے میں سمن کی شادی ممکن نہیں۔ مجبور ہو کر اپنے ضمیر کا خون کر کے وہ رشوت لیتے ہیں۔ پاپ کرتے ہیں، اور بقول ڈاکٹر ستیندر ''بس یہی پاپ ناول کا بیج ہے۔ اس پاپ نے زہر کا وہ درخت کھڑا کیا جس کا امرت سا پھل ہوا 'سیوا سدن''۔ کرشن چندر کو پانچ سال کی قید ہوگئی۔ رشوت کا روپیہ مقدمہ میں خرچ ہو گیا سمن کی شادی جس گھرانے میں طے ہوئی تھی، جہیز اور روپیہ سے مایوس ہو کر اس نے شادی سے انکار کر دیا اور اس طرح سمن کا ہاتھ ایک ایسے سن رسیدہ مفلس کے ہاتھ دے دیا گیا جس کی ماہانہ آمدنی صرف پندرہ روپئے ہے۔ ایک پاپ نے دوسرے کو جنم دیا اور دوسرے نے تیسرے کو۔ سمن نے اپنے گھر میں جس آسائش و آسودگی کی زندگی گزاری تھی۔ اس کے مزاج میں نخوت، آزادی اور خود پسندی کی جو کیفیت پیدا ہو چکی تھی اس کی وجہ سے وہ اپنے گھر میں اس کی تنگدستی اور اور تنگ دلی سے پریشان ہو کر وحشت محسوس کرنے لگی۔ وہ اپنے محلے میں رہنے والی طوائف بھولی بائی کی خوش حال اور آزاد زندگی پر رشک کرتی ہے، اور جب اس نے دیکھا کہ اس کے گھر میں شہر کے معززین بھی آتے ہیں تو اس کے دل میں طوائف کے لئے جو حقارت اور نفرت تھی وہ رفتہ رفتہ مٹنے لگی، کبھی کبھی وہ اس کے گھر وقت گزاری کے لئے چلی جاتی لیکن اس کے شوہر گجادھر کو یہ کسی طرح گوارا نہیں ہوا۔ اس نے سمن کو گھر میں قید کرنا چاہا۔ اس کے چلن پر شک کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز جب وہ اپنی سہیلی سبھدرا کے مکان سے رات گئے واپس آئی تو اس کے شوہر نے غصہ کے عالم میں ہمیشہ کے لئے اسے گھر سے نکال دیا۔ سمن نے سبھدرا کے گھر میں پناہ لی لیکن سبھدرا کے شوہر نے رسوائی کے خوف سے اسے اپنے گھر میں رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ ہر طرف سے مایوس اور بے سہارا ہو کر بالآخر سمن نے بھولی بائی کے گھر پناہ لی اور کچھ ہی دنوں میں اس بازار کی زینت بن گئی۔ یہ ہے جہیز کی رسم اور بے میل شادی کا نتیجہ۔ سمن ہی نہیں بھولی بائی بھی اسی کا شکار ہے۔ وہ بھی اپنے بوڑھے شوہر کی غلامی سے بھاگ کر سدی بازار میں آخری پناہ لی تھی۔

یہاں تک کہ پریم چند نے ایک حقیقت پسند کی طرح واقعات اور اشخاص کو ایک مربوط اور موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ ہر واقعہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہے۔ اس کے بعد ناول کا پلاٹ کچھ پھیلتا ہے کچھ نئے کردار نمایاں ہو کر میدان عمل میں آتے ہیں۔ بالخصوص پدم سنگھ، بٹھل داس، سدن اور شانتا۔

پدم سنگھ کو جب معلوم ہوتا ہے جسے رسوائی کے خوف سے اسے اپنے گھر سے نکالا تھا بیوا ہوگئی اور اس مجرمانہ فعل پر پچھتاتے ہے اور اسے اس مہیب اور گھناؤنی زندگی سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا نوجوان بھتیجا سدن جو بغرض تعلیم گاؤں سے شہر آیا سمن کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوکر اس سے اظہار عشق کرتا ہے۔لیکن وہ اس تعفن ریز ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔اس وقت پدم سنگھ اور بٹھل داس کی ہمدردی اور سہارا اسے ایک نیا حوصلہ اور نئی زندگی دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لئے بازار حسن کو خیر آباد کہہ کر دھوا آشرم میں چلی جاتی ہے۔

اب ناول میں میونسپلٹی کی سیاست اور طوائفوں کو شہر سے ہٹانے کی تحریک کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔پدم سنگھ اور بٹھل داس بورڈ میں ایک تجویز پیش کرتے ہیں جس کا مقصد ہے''ارباب نشاط کو شہر کے ممتاز مقامات اور شاہراہوں سے ہٹانا اور دوسرا رقص وسرود کی مذموم رسم کو مٹانا''اس تجویز کی منظوری کے لئے بورڈ کے ممبروں میں شدید کشمکش ہوتی ہے۔اور پریم چند یہاں متوسط طبقہ کی خودغرضانہ گندی سیاست پر بھرپور وار کرتے ہیں۔

سمن کی تیرہ وتر زندگی میں اس کا شوہر گجادھر جو اپنے گناہوں کا پرائشچت کرنے لئے سادھو ہو چکا ہے اب ایک روشنی بن کر آتا ہے۔یہ روشنی اسے سیوادھرم کا راستہ دکھا کر ساری عمر کی حرماں نصیبی سے نجات دیتی ہے۔گجادھر نے'' سیوا سدن'' نام سے بیسواؤں کی لڑکیوں کو پالنے کے لئے جو آشرم تعمیر کیا ہے۔سمن اس کا نگراں اور معلّمہ ہو جاتی ہے۔

یہ اس ناول کا سیدھا سا پلاٹ ہے لیکن درمیان میں مصنف نے اپنے اصلاحی مقاصد کے پیش نظر اسے کچھ پیچیدہ اور مرکب بنا دیا ہے۔دراصل یہ پلاٹ سمن گجادھر اور دوسری طرف شانتا اور سدن کی کہانیوں سے بنایا گیا ہے۔ دونوں کے افعال اور ارادے ایک دوسرے پر اثر انداز اور باہمی طور پر متصادم ہوتے ہیں۔درمیان میں مصنف نے چوک سے بازار حسن کو ہٹانے اور بورڈ میں اس تجویز کو منظور کرانے کی جو سرگزشت پیش کی ہے اصل قصہ سے اس کا ربط بے جان اور سطحی ہے گہری نظر سے دیکھنے پر وہ ایک علیحدہ قصہ معلوم ہوتا ہے۔اور دوسری بات یہ ناول کے درمیانی قصہ کے بیشتر کردار اخیر تک اصل کہانی کے اشخاص سے بالکل بے تعلق رہتے ہیں۔منشی ابولوفا،تیگ علی،ڈاکٹر شیاما چرن،سید شفقت علی،حکیم شہرت علی اور سیٹھ چمن لال وغیرہ۔یہ تمام کردار سمن اور شانتا کی زندگی پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ سب کسی نہ کسی پہلو سے بازار حسن کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اسی مقصد سے متعارف کرایا ہے۔ان کے معتقدات اور اور نقطۂ نظر اس دور کے متوسط طبقہ کا اصلاحی نقطہ نظر ہے۔وہ سماج کی ان

بدنصیب عورتوں کونفرت کے بجائے ہمدردی اورانسانیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ یہ لعنت عورت کی شخصی کمزوریوں سے کہیں زیادہ حالات اور ماحول کا پروردہ ہے۔وہ اسے سماج کے اپنے ناخنوں کا زخم سمجھتے ہیں۔لیکن اس صدیوں پرانے زخم کو جو ناسور بن چکا ہے وہ صرف مرحم لگ اکر اچھا کرنا چاہتے ہیں گہرائی اور بصیرت کے ساتھ اس کے ان بنیادی اسباب کی تلاش نہیں کرتے جن کی جریں رسم ورواج ہی میں نہیں ملک کے معاشی اور معاشرتی نظام میں پیوست ہے۔

پریم چندان کی اصلاح کر کے سماج میں انھیں ایک ناعزت افراد کا مقام دینا چاہتے ہیں لیکن انھیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی۔سمن یہ پیشہ ترک کردینے کے بعد بھی آخر وقت تک بھی سماج کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی۔ دوسرے طرف وہ انھیں شہر کے ممتاز مقامات سے اس لئے ہٹانا چاہتے ہیں کہ اس سے ان کے طبقہ کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق پر برُا اثر نہ پڑے۔ان کے سوئے ہوئے 'جذبات بیدرانہ ہوں'۔ظاہر ہے اس طرز فکر پر مروجہ اخلاق اورعصری اصلاح پسندی کی مہر ثبت ہے۔مسنف اپنی کوششوں کے باوجود اس اہم مسئلہ کے اسباب وعواقب کا احاطہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اوراس کا سبب اس کا آدرش وادااور سدھاری وادطرز فکر ہے۔

کیونکہ جب وہ بھولی بائی کی زندگی،اس کی سج دھج اورظاہری شان کورشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے،شہر کے لکھپتی رؤسا سے لے کرقوم کے رہنما اور تلک داری پنڈت اور پجاری تک اس کے جبین نیاز جھکاتے ہیں۔آخر کیوں؟ یہ سوال ان کے ذہن میں بار بار پیدا ہوتا ہے۔وہ اپنی زندگی کا جب اس کی زندگی سے موازنہ کرتی ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتی ہے کہ:

''وہ آزاد ہے۔میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔وہ کتوں کے بھونکنے کی پروانہیں کرتے۔میں سرگوشیوں سے ڈرتی ہوں۔وہ پردے کے باہر ہے میں پردے کے اندر ہوں۔وہ ڈالیوں پر چہکتی ہے۔میں پنجڑے میں بند تڑپتی ہوں۔اس نے شرم چھوڑ دی ہے۔میں اس کا دامن پکڑے ہوئے ہوں۔اس حیانے اوراس بدنامی کے ڈرنے مجھے دوسروں کی لونڈی بنارکھا ہے''۔(ص۴۰)

سماج کے رسم ورواج کی فرسودہ زنجیڑیں اور معاشی غلامی کا طوق ہی اس کی زندگی کا عذاب ہے۔ایک رات جب اس کا شوہراس پر بدچلی کی تہمت لگا کر گھر سے نکال دیتا ہے تو اپنی محنت کے بل پر وہ اپنے لئے روزی کمانے کی جد

وجہد کرتی ہے۔ بیسوا بھولی بائی کے دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں لیکن ابھی اس سمت قدم اٹھانے کا وہم بھی اس کے دل میں نہیں آتا ہے۔اس لئے کہ جسم بیچ کر اور عصمت کا سودا کر کے اسے اپنی ذات اور اپنے نفس کا تحفظ گوارا نہیں۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں اسے اپنے سامنے تین ہی راستے نظر آتے ہیں۔

ا: خودداری اور احساس نفس کا خون کر کے ظالم شوہر کی منت کرنا اور اس کے بے سروسامان گھر میں قدم رکھ کر پھر ان بیڑیوں کو پہن لینا جو ٹوٹ چکی ہیں۔

۲: اپنی زنگی گنگا کی مقدس لہروں کو سونپ دینا۔

۳: اور بھولی بائی کی طرح بازار حسن کی زینت بن کر سماج سے اس جبر وظلم کا انتقام لینا جو اس کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔

پہلا راستہ ظلم اور بے انصافی کے سامنے سرنگوں ہونے کا راستہ ہے، دوسرا بزدلی اور بے ہمتی کا اور یہ دونوں اسے گوارا نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے وہ تیسرے راستے پر قدم رکھ دیتی ہے۔ سمن کا یہ اقدام اس کے کردار کا انحطاط یا المیہ نہیں۔اس لئے کہ اس نے شکست نہیں مانی۔ سپر نہیں ڈالی۔ ظلم اور بے انصافی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ خوف اور کم ہمتی نے اسے فرار کا راستہ نہیں دکھایا۔ یہ المیہ ہے اس فرسودہ معاشرت کا جو اس کی خودداری، اس کی انسانی سربلندی اور نخوت و لطافت کو صدیوں سے اپنے قدموں تلے روندتی آئی ہے۔

پریم چند نے فنکارانہ مہارت سے سمن کے لردار کی مصوری کی ہے۔اس کا کردار 'بیوہ' کی پریما ست بڑی مماثلت رکھتی ہے، 'غبن' کی جالبا اور 'چوگان ہستی' کی صوفیا میں بھی سمن کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ سب عورت کے حقوق اور اور اس کی آزادی کے لئے لڑتی ہے۔ سمن حالات کی برخی سے الجھنے اور بے رحمی سے ٹکرانے کی ہمت رکھتی ہے۔اور در اصل سمن کا کردار اس وقت تک کامیاب اور زندگی سے معمور رہتا ہے جب تک مصنف حقیقت پسندی کا دامن چھوڑ کر آدرش وادواد کا سہارا نہیں لیتا۔

ناول کے دوسرے اہم کردار پدم سنگھ، بٹھل داس، سدن اور کرشن چندر ہیں۔ پدم سنگھ متوسط طبقہ کے کے ایک تعلیم یافتہ سماجی کارکن ہیں۔نجی زندگی میں اس کی وضع داری بری سے بری روایات کو بھی گورا کر لیتی ہے۔لیکن قومی خدمات کے میدان میں وہ معاشرتی اصلاحات کے لئے بڑی سرگرمی سے کوشش کرتے ہیں۔ان کا دل انسانی دردمندی سے معمور ہے لیکن وہ خاندانی عزت اور وقار کے سامنے وہ انسانیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ان کی اصلاح پسندی

عقل وشعور سے زیادہ جذبات کی تابع ہے۔سمن کو دال منڈی سے نکالنے کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔اس لئے نہیں کہ یہ ایک قومی خدمت ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے اس پاپ کا پرائشچت ہو جائے گا جو سمن کو گھر سے نکال کر سرزد ہوا تھا۔

بٹھل داس کا کردار بھی ایک ایسے ہی قومی کارکن کا کردار ہے۔وہ پدم سنگھ سے زیادہ حوصلہ مند، مستقل مزاج اور بیباک ہے۔اگر چہ سماجی مسائل پر دونوں دونوں کے سوچنے کا انداز ذرا مختلف ہے۔لیکن اصلاحی طریقہ کار اور راستہ ایک ہی ہے دونوں سماجی مسائل کو ان کی ظاہری علامات کی روشنی میں جذباتی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔مختلف مسائل کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے معاشی اور معاشرتی پس منظر میں گہرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ نہیں کرتے۔ان کے خیالات بڑی حد تک مصنف کے اپنے اصلاحی تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

سدن کا کردار ناول کے خاکے میں ایک شوخ رنگ کی طرح ابھرتا ہے۔یہ کردار اس اعتبار سے اضافی اور غیر ضروری ہے سمن سے اس کی محبت ناول کے پلاٹ یا سمن کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتی لیکن پریم چند نے اسے کچھ ایسی سادگی اور پرکاری سے پیش کیا کہ سب سے علیحدہ اور منفرد نظر آتا ہے۔

کرشن چندر کا کردار بھی ایک موثر اور جیتا جاگتا کردار ہے۔پریم چند نے اپنے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ کی مدد سے اس میں حقیقت کی روح پھونک دی۔جیل سے آنے کے بعد اپنی عزیز اور معصوم بیٹیوں کو مظلومی اور بدحالی میں دیکھ کر ان کے دل پر جو بیتتی ہے، بے مائیگی اور بے چارگی کا احساس ان کے دل و دماغ میں جو ہیجان پیدا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ گاؤں کے اوباشوں کی صحبت میں اور کبھی کبھی گاؤں کی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے جس طرح زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرتے ہیں وہ ایسا بھرپور اور حقیقت پسندانہ اظہار ہے کہ قاری کی تمام ہمدردی اس کردار کی طرف کھنچ جاتی ہے۔اس کی خودکشی دراصل اس کی ذہنی کیفیات اور ان جابر حالات کا فطری نتیجہ ہے جن سے دوچار تھا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ناول کے بیشتر کردار۔واقعات اور مکالموں کے آئینے میں جس طرح نمودار ہوتے ہیں ان کی رومانیت اور غیر فطری انداز فنی اعتبار سے ناول کی وقعت بہت کم کر دیتا ہے سمن کو جلد سے جلد طوائف بنانے اور اس کے نتائج کو سامنے لا کر پلاٹ میں پیچیدگی اور کلائمکس پیدا کرنے کی دھن میں مصنف حادثات اور اتفاقات کا سہارا لیتا ہے مثلاً سمن جس دن یہ پیشہ ترک کرتی ہیں اس دن اچانک وہ تمام معززین یکے بعد دیگرے

اس کے پاس آتے ہیں جن کا مضحکہ اڑانے اور جن کی خبر لینے کا اہتمام وہ پہلے سے کر چکی ہیں یہاں ایک اور خامی کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہ حالات اور حوادث ہیں جو سمن وکشاں کشاں بازار حسن کی طرف لاتے ہیں۔لیکن عصمت فروشی کی گھناؤنی حرکت میں قدم رکھتے ہوئے اس کے دل میں وہ ہچکچاہٹ اور کشمکش نہیں ہوتی جو اس طبقہ کی پلی ہوئی لڑکی کے دل میں ہونا چاہئے۔کم از کم مصنف نے اس طرح کی کسی کشمکش کا اظہار نہیں کیا ہے۔

سدن کا کردار ایک حقیقی اور زندہ کردار ہے۔وہ ایک معمولی پڑھا لکھا اور الھڑ نوجوان ہے لیکن پریم چند نے اس سے قومی کارکن بنانے کی کوشش میں جس طرح کے عالمانہ اور اصلاحی مضامین لکھوائے ہیں وہ اوپر سے لادی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور ڈرامائی واقعہ ناول کے آخری حصے میں اس وقت سامنے آتا ہے جب پدم سنگھ کی چند ماہ کی کوششوں سے دال منڈی کی طوائفیں عصمت فروشی سے توبہ کر لیتی ہیں اور جب بورڈ شہر سے باہر ان کے لئے کالونی بنا دیتا ہے تو وہ انتہائی خوشی سے اپنی برسوں کی سجی سجائی دوکانیں چھوڑ کر اس ویرانہ میں جا بستی ہیں۔مصنف لکھتے ہیں:

''ساری دال منڈی ایک ہی دن میں خالی ہوگئی جہاں شب و روز کی بہار رہتی تھی وہاں شام ہوتے ہوتے سناٹا چھا گیا'' (ص۳۱۲)

یہی نہیں انھوں نے اپنے برادری کا ایک عظیم الشان جلسہ کر کے متفقہ طور پر طے کیا کہ آج سے ہم بے شرمی، ذلت، معصیت اور عیش پرستی کی زندگی ترک کر کے جائز کمائی کی زندگی کا آغاز کریں گے اور مصیبتیں جھیل کر اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کریں گے۔

یہاں اس سے قطع نظر کہ ناول کے فنی اور جمالیاتی پہلو طری طرح مجروح ہو گئے ہیں اور پریم چند ایک ناول نگار کا چولا اتار کر مبلغ اور مصلح کے روپ میں سامنے آ گئے ہیں۔ان کے اعلی سماجی مقاصد بھی مروجہ اخلاقیات کے کے بوجھ سے دب گئے ہیں، جلسہ میں جو طوائفیں تقریریں کرتی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس حقیقت کے طرف اشارہ نہیں کرتی ہے کہ انھیں سماجی اور معاشی حالات سے مجبور ہو کر بازار حسن کی زینت بننا پڑا، بلکہ ان کی تقریروں سے یہ صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ہوس پرستی، کام جوئی اور عیش پرستی کی خاطر یہ ناپاک پیشہ اختیار کیا۔ان کو

بہکانے اوراس راستہ کی طرف لانے والا سماج نہیں شیطان تھا۔ محبوب جان کہتی ہے:

''ہم نے بہت دنوں تک بے شرمی اور ذلت کی زندگی بسر کی۔ بہت دنوں تک شیطان کی قید میں رہے، بہت دنوں اپنی روح اور ایمان کا خون کیا اور بہت دنوں تک مستی اور عیش پرستی میں غافل رہے۔آج خداوند کریم نے ہماری حالت پر رحم کر کے ہمیں قید معصیت سے نجات دی''۔(ص ۳۱۷)

اس طرح مصنف اس بدنصیب طبقہ کو گناہوں کی غلامی اور معصیت کے بازار سے نجات دلانے میں ضرور کامیاب ہوجاتا ہے۔لیکن ان حالات کی دریافت میں اسے کامیابی نہیں ہوتی جو ہندوستان کی لاکھوں عورتوں کو گناہوں کے اس بازار میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہاں پریم چند کا فکری تضاد کچھ نمایاں ہوجاتا ہے اوران کے سماجی آدرش اخلاقیات کا لباس پہن لیتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ پریم چند پلاٹ اور کرداروں کی تعمیر پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ان کی نظر مقصد پر رہتی ہے۔جس طرح مٹی کے کھلونے کی مدد سے بچوں کو حساب سمجھایا جاتا ہے۔ پریم چند کرداروں کی مدد سے اپنے معاشرتی مقاصد کی وضاحت کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دوسرے ناولوں کی طرح ''بازار حسن'' میں بھی واقعہ نگاری اور کردار نگاری کی کمزوریاں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ان کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم ناتھ در لکھتے ہیں:۔

''کوئی یہ نہیں کہہ سکتا پریم چند کو ان کمزوریوں کا علم نہیں تھا اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے مغرب کے معیاری ادب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔اسی لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند نے اپنی تصانیف اور اپنے فن کو سماج سدھار کا غلام بنایا اور غلام کی پرواہ نہیں کی یا یہ کہئے کہ انہوں نے نچلے طبقے کے لئے لکھا جس کو بیدار کرنا تھا اور ان لوگوں کی پروانہیں کی جنھوں نے انگیریزی کے وسیلے سے اچھے ناولوں کو پڑھنا سمجھا تھا''۔(پریم چند اور گورکی،ص۲۸۲)

یہ حقیقت ہے کہ ناول میں ایسی خشک اور فلسفیانہ تقریریں اکثر مل جاتی ہیں جو باشعور قاری کی طبیعت کو افسردہ کر دیتی ہے۔لیکن اپنی خامیوں کے باوجود اس ناول کا بڑا حصہ واقعہ نگاری انداز بیان کی دلکشی،مکالموں کی بے تکلفی اور کرداروں کے نفسیاتی مطالعہ ایک ایسا معیار رکھتا ہے جو مصنف کی تخلیقی صلاحیتوں اور اس کے مشاہدہ کی وسعت کا شاہد ہے۔

3.7 خلاصہ

ناول گئودان میں دیہاتی خاندان اور ایک کسان کی زندگی کا ترجمانی تھا۔جس کو اس نے نہایت دلکش انداز سے پیش کیا ہے جس میں کھلیان کا دلچسپ منظر، جو پال کی چہل پہل ،کھیتوں کی ہریالی ،غریبوں کی آرزوں کی تصویریں، مالداروں کی سازشیں،اور ہلکے پھلکے دیہاتی جھگڑے بڑی کامیابی سے پیش کئے ہیں۔خاص طور سے ناول کا خاتمہ نہایت اثر انگیز اور دلکش ہے،اس میں حقیقت،آرزو،ایک غریب کسان کے وقت آخر کا منظر غیر معمولی طور پر موثر اور حیرت انگیز طور پر فنکارانہ ہے۔جس میں پریم چند کی پوری عمر کا تجربہ،مشاہدہ اور فنی مشق اپنی پوری وآب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ناول بازار حسن فنی اعتبار سے ناول فی الاصل سمن کی سرگزشت ہے،وہ جس سمت قدم اٹھاتی ہے،جس انداز سے سوچتی ہے،اس کے ارادے اور حوصلے اپنے ماحول سے جس طرح متصادم ہوتے ہیں وہی ناول کا پلاٹ ہے۔وہ طوائف نہیں ۔'بازار حسن' میں پہونچ کر بھی وہ طوائف نہیں ہوتی ۔وہ اس میراث کو نہیں اپناتی جو اس بدنصیب طبقہ کی قسمت ہے۔وہ اس گھاؤنی زندگی سے نفرت کرتی ہے اور کسی قیمت پر اپنا جسم نہیں بیچتی بلکہ اپنی سریلی آواز اور مدھر گیتوں کی قیمت وصول کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے۔اس اک کردار اردو ناول کا پہلا کردار ہے جو ظلم اور بے انصافی کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا۔

ان دونوں ناولوں میں پریم چند نے سماجی مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ ایک ناول میں جہاں غربت اور لاچاری کو بیان کیا ہے وہی دوسرے ناول میں عورت کی بے بسی کو۔پریم چند کی یہ دونوں ناول شاہکار ناول ہیں۔

3.9 فرہنگ

زینت ۔ سجاوٹ،خوبصورتی　　جمالیات۔ حسن شناسی　　مبلغ۔ تھوڑا،کل

مصلح ۔ درست کرنے والا،اصلاح کرنے والا　　مماثلت۔ مانند ہونا

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ پریم چند کے ناول گئودان کا تنقیدی جائزہ پیش کریئے؟

۲۔ ناول گئودان کی کردار سازی کو بیان کریئے؟

۳۔ ناول بازار حسن کا تنقیدی مطالعہ پیش کریئے؟

۴۔ ناول بازار حسن کے اسلوب کو بیان کریئے؟

6.11 سفارش کردہ کتابیں

۱: گئودان کا تنقیدی مطالعہ۔ سید احتشام حسین

۲: گئودان کا تنقیدی مطالعہ۔ انور کمال حسینی

۳: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار۔ قمر رئیس

۴: اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ سنبل نگار

۵: گئودان اور بازار حسن۔ ویکیپیڈیا

پریم چند سے قبل اردو افسانہ

سبق کی ساخت:

7.1 تمہید

7.2 مقاصد

7.3 پریم چند کی افسانہ نگاری سے قبل سماجی بیداری

7.4 ادبی بیداری و افسانہ نگاری کا آغاز

7.5 پریم چند سے قبل افسانہ نگاری کے نقوش

7.6 پریم چند کے پیش رو افسانہ نگار

7.7 چند مشہور افسانے

7.8 خلاصہ

7.9 فرہنگ

7.10 نمونہ امتحانی سوالات

7.11 سفارش کردہ کتابیں

7.1 تمہید

1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے میں کئی سطحوں پر تبدیلی رونما ہوئی۔ ادب بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ جس قدر صنف شاعری کی فکری جہتوں میں تبدیلی آئی اصناف نثر بھی اسی قدر متاثر ہوا اور اب ادبی نثر صرف تفنن طبع کا ذریعہ نہ رہ کر اس سے سماجی اصلاح کا کام بھی لیا جانے لگا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک اور اس کی متعدد عصری تحریکوں سے یہ بات ظاہر ہونے لگی کہ اب ادب کے مقاصد میں تبدیلی آنی چاہئے۔ مضامین سرسید، محمد حسین

آزاد کا نیرنگ خیال، مرزا غالب کے خطوط، مولوی اسماعیل کی تمثیلی کہانیاں اور اسی طرح کی متعدد تحریریں اس بات کا مظہر تھیں کہ اب نثری اصناف میں واضح تبدیلی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ اسی زمانے میں اردو میں ناول نگاری کی شروعات ڈپٹی نذیر احمد کے ذریعہ ہوئی جو انفرادی و اجتماعی اصلاح کے عمدہ نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں چند اور نثر نگاروں نے کہانی اور افسانے کے بیچ کی کچھ چیزیں لکھیں۔ کچھ ایسے مضامین سامنے آئے جن سے تفنن طبع کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سیاسی اصلاح کا بھی کام لیا جا سکتا تھا مثلاً خواجہ حسن نظامی کے مضامین جس نے آگے چل کر انشائیہ کے نقوش ابھارنے کی کامیاب کوشش کی۔ بیسوی صدی آغاز سے پہلے ایسے متعدد ادبی اشارے ملنے لگتے ہیں جن سے عصری آگہی کا پتا چلتا ہے۔ ایسے لکھنے والوں میں سرسید، بھارتیندو، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، بنکم چند، رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ عزیز طلبا! اس سبق میں پریم چند کی افسانہ نگاری سے قبل ایسے ہی لکھنے والوں کی تحریروں، کہانیوں، مضامین اور انشائیوں کا ذکر ہوگا جنھوں نے پریم چند کے لئے اور ان کی افسانہ نگاری کے لئے زمین ہموار کی۔ اس سبق میں آپ ان ناول نگار اور افسانہ نگاروں کے متعلق جانکاری حاصل کریں گے جن کی تحریروں نے پریم چند کو افسانہ نگاری کی طرف راغب کیا۔

7.2 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ

- ☆ افسانہ نگاری کے ادبی پس منظر کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ☆ فن افسانہ نگاری کے آغاز و ارتقا پر اظہار خیال کر سکیں گے۔
- ☆ پریم چند سے قبل کے فکشن نگاروں کا عمومی جائزہ لے سکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے افسانوں سے قبل ابتدائی افسانہ نگاری پر بحث کر سکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے افسانہ سے قبل اہم افسانوں کا جائزہ لے سکیں گے۔

7.3 افسانہ نگاری سے قبل ادبی پس منظر

کسی بھی اہم واقعہ یا کام اور فکر وفن کے آغاز کا کچھ نہ کچھ پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ پریم چند کے فکشن نگاری سے قبل بھی ایسے واقعات، حالات اور پس منظر رونما ہوئے جنھوں نے پریم چند کے افسانوں کو بنیاد فراہم کیا۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی بنیاد جن سماجی، سیاسی اور مذہبی ومعاشی عقائد پر قائم ہیں ان عقائد کا آغاز یوں تو سو سال پہلے ہو گیا تھا لیکن 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد تیزی سے رونما ہوئے۔ سیاسی سطح پر کانگریس کی بنیاد پڑی۔ علمی وادبی سطح پر کئی علمی وادبی تحریکیں شروع ہوئیں اور سماجی ومعاشی اصلاحی سطح پر ہندوستانی سماج میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان ہی تبدیلیوں اور پس منظر نے پریم چند کے ذہنی اور فکری پس منظر کو جلا بخشا۔ پریم چند کی کہانیاں، افسانے اور ناول انسانی زندگی کا بالخصوص دیہی زندگی کے ہر گوشے کے حقائق کو بیان کرتی ہے۔ پریم چند کی ادبی تحریروں کا زمانہ 1900 سے 1936 یعنی چھتیس سال کی وسعتوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں ہندوستان کی صدیوں پرانے اقتصادی ڈھانچے نے نیا روپ لینے کی کوشش کی۔ مغربی تہذیب وتمدن نے مشرقی تہذیب وتمدن بالخصوص ہندوستانی سماجی ڈھانچے کو متاثر کیا۔ نئے پیداواری قوتوں، مشینی ایجادات اور صنعتی ترقی نے سماج میں نئے نئے طبقات وحالات پیدا کئے اور سیاسی طور پر یہی زمانہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا Turning Point تھا۔

پریم چند کی ادبی نگارشات کی ابتدا میں ہی یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک کی حقیقی زندگی اصل میں دیہات کی زندگی ہے اور وہ اسی ہندوستانی حقیقی زندگی کی فلاح وبہبود چاہتے تھے۔ پریم چند کے نے ہندوستان کی بڑی آبادی جو معاشی بحران سے دوچار تھی کا بہت ہی قریب سے مطالعہ کیا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ پریم چند بذات خود اپنے آپ کو اسی طبقے کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ کیوں کہ انہوں نے بھی ہوش سنبھالنے کے بعد اسی افلاس، اسی بے سروسامانی اور ان ہی تلخ حقائق کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ پریم چند کے بیشتر افسانوں اور کہانیوں اور ناولوں میں اسی زراعت پیشہ طبقہ اور دبے کچلے پسماندہ لوگوں کی زندگی کی جدوجہد کی تصویر میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پریم چند کے نزدیک ہندوستانی زندگی کی یہی تصویریں اصلی اور حقیقی زندگی کی تصویریں تھیں۔ پریم چند کے فکر وفن پر اپنی گفتگو کا

آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی کتاب ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' میں لکھا ہے۔

''موضوع اور فن کے لحاظ سے ان کے ناولوں کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے عہد کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے کیوں کہ اس پس منظر میں ان کے فکر و شعور نے ارتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ اجتماعی زندگی کے مختلف عوامل نے ان کی فکر کی راہوں کا تعین کیا ہے اور بدلتے ہوئے حالات اور واقعات کے سانچے میں ڈھل کر ان کے تصور نے تشکیل پائی ہے۔''

پریم چند کے افسانوں پر جن دیگر حالات کا اثر پڑا ان میں ہندوستان کی عام اقتصادی وخراب معاشی حالت، ہندوستانی کسانوں اور کاشتکاروں پر ظلم واستبداد، ہندوستان کے دیہی معاشی نظام کی پامالی اور ان پر مختلف طرح کے محصول و مالگذاری کا بوجھ۔ اس زمانے میں جن شخصیات نے پریم چند کو متاثر کیا ان میں پنڈت مدن موہن مالویہ جو خود کسانوں کی ابتر معاشی حالات سے پریشان تھے۔ بقول مدن موہن مالویہ ''یہ لوگ مقروض پیدا ہوتے ہیں۔ مقروض زندگی گزارتے ہیں اور مقروض مرجاتے ہیں اور اپنا بار اپنے ورثا کی طرف منتقل کر جاتے ہیں''۔ بیسویں صدی کی شروعات میں جب قومی تحریکیں تیز ہوئیں، سیاسی شعور بیدار ہوا، استحصالی پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی تو سامراجی طاقت نے پہلے سے زیادہ قوت سے ہندوستانی عوام کو دبانا شروع کیا۔ ان حالات کا اثر پریم چند کی زندگی، ان کی فکر اور ان کے فن پر مرتسم ہوئے۔ پریم چند کے فکر وفن کو ان کے عصری، مذہبی وسماجی اصلاحات نے کافی متاثر کیا۔ راجہ رام موہن رائے کے برہموسماج کی اصلاح اور اس پر رابندناتھ ٹیگور اور کشیپ چندسین جیسے روشن خیال اور اصلاح پسند شخصیات کا اثر نے بھی پریم چند کی اصلاحی ذہنیت کو جلا بخشی۔ برہموسماج اور آریہ سماج کی نئی تعلیم کے تئیں عقلی دلائل اور سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے شعور کو بھی پریم چند نے سماج میں مثبت تبدیلی کی نظر سے دیکھا۔ سوامی وویکانند کی تحریک سے بھی وہ متاثر رہے۔ پریم چند کی اصلاح پسند طبیعت کو سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور مختلف طرح کی سائنسی وفکری تحریکوں نے بھی متاثر کیا۔ ان سبھی تحریکوں کے ساتھ ساتھ قومی بیداری اور سیاسی جدوجہد کے جدید طرز فکر نے بھی پریم چند کو متاثر کیا۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں جا بجا مذکورہ اصلاحی تحریکوں اور شخصیات سے متعلق خیال ونظریات ملتے ہیں۔

7.4 ادبی بیداری وافسانہ نگاری کا آغاز

عزیز طلبا! یہاں ادبی بیداری سے مراد صنف نثر میں ادبی بیداری سے ہے۔آپ جانتے ہیں کہ فکشن کے زمرے میں داستان کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔اردو نثر میں اس زمانے کے مانگ کے مطابق افسانوی رنگ میں داستانیں لکھی گئیں۔فورٹ ولیم کالج کی تحریر پر بعض داستانوں کو سلیس اور آسان اردو میں دوبارہ لکھنے کی کوشش کی گئی۔ غالب کے خطوط کو جدید اردو نثر کے آغاز کا سنگ میل سمجھنا چاہئے اور سرسید کے مضامین سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے ذریعہ شائع علمی ادبی مضامین بھی اردو نثر کے سلسلے میں اہمیت کے حامل ہیں۔تاہم نثری ادب میں نیا شعور 1857 کی بغاوت کے بعدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔اس ضمن میں جن شخصیات نے اردو نثر کے مقصدی ادب کی طرف عوام کی ذہنوں کو کھینچا ان میں بھارتیندو، سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، بنکم چند چٹر جی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ان شخصیات نے سماجی ومعاشی زندگی کو بہت باریکی سے اور نزدیک سے دیکھ کر ان میں ہونے والی تبدیلیوں کو عوام سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اردو نثر نگاری میں ادب اور زندگی کو ایک دوسرے سے روشناس کرانا شروع کیا۔سرسید تحریک اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نکلنے والا معروف ومشہور رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نے اصلاحی نثر اور مقصدی ادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔سرسید احمد نے یوں تو 'آثار الصنادید' 'تاریخ سرکشی بجنور' 'اسباب بغاوت ہند' اور لائل محمڈنس آف انڈیا وغیرہ تصانیف سے نثری ادب کو مالا مال کیا لیکن عوام کو تہذیب، تمدن اور ادب کی طرف رجوع کرنے میں تہذیب الاخلاق کا کردار نہایت اہم ہے۔

سرسید کے بعد مولانا محمد حسین آزاد جو دہلی کے مشہور ومعروف علم دین اور اردو کے پہلے اخبار 'دہلی اردو اخبار' کے بانی مولانا محمد علی باقر کے صاحب زادے تھے نے نثری اصناف کے آغاز وارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔یوں تو ان کی کتابیں دربار اکبری، آب حیات، سخندان فارس، دیوان ذوق اور بچوں کی اردو کی درسی کتابوں کے لئے مشہور ہیں لیکن افسانوی ادب کی طرف آنے والی نسلوں کو رجوع کرنے میں ان کی تصنیف 'نیرنگ خیال' نے اہم کردار ادا کیا۔نیرنگ

خیال غالبا پہلی تمثیلی نثر کا نمونہ ہے جو انگریزی کے رمزیہ مضامین کے خاکے کی طرح پیش کئے گئے ہیں۔اس کے بعض حصے نثری اسلوب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی نثر و نظم میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی کتاب حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید اور مقدمہ شعروشاعری نثری ادب میں مثالی درجہ رکھتی ہیں لیکن حالی کے مقالات ایک نئے ادبی نقطہ نظر کی طرف بعد کے آنے والے فکشن نگاروں کو کھینچتی ہیں۔مولوی نذیر احمد جو پیشے سے استاد تھے لیکن ان کا ذہن نئے افکار و خیالات سے معمور تھا۔اپنی محنت سے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے لیکن ان کا اصل کارنامہ اردو میں ناول نگاری کی داغ بیل ڈالنا ہے۔انہوں نے اردو فکشن کی بنیاد ڈالی گو کہ اس سے پہلے اردو میں فکشن کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ان کے ناول مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت اردو ناول نگاری کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔گو کہ یہ سبھی ناول سماجی اصلاح اور نوجوان نسل کی تربیت کے لئے لکھے گئے تھے۔نذیر کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی جنہوں نے اردو نثر میں المامون، الفاروق، سیرت النبی، شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر لکھا لیکن ان کا ایک اور کارنامہ ان کے مقالات و مضامین ہیں۔نذیر احمد کے بعد فکشن نگاروں میں رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر کا نام بہت ہی معروف ہے جنہوں نے اس فن کو اس کی فنی خوبیوں کی بنیاد پر پرکھنے کی کوشش کی۔ان کے بعد سجاد حسین اور رسوا نے ان ہی بنیادوں کو مضبوط کر کے فکشن کی نئی عمارت تعمیر کی۔رتن ناتھ سرشار نے اپنی مشہور کتاب 'فسانہ آزاد' کے لئے اپنی اصل پہچان بنائی لیکن انہوں نے اس کے علاوہ جام سرشار، سیر کوہسار، کامنی، بچھڑی دلہن، پی کہاں، کڑم دھم لکھ کر افسانوی ادب کی ابتدا میں اہم کردار ادا کئے ہیں۔مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول گو کہ مسلمانوں کی قدیم تاریخ سے متعلق ہیں لیکن ان کا مشہور زمانہ رسالہ 'دلگداز' نے افسانوی ادب کے آغاز میں اہم کردار ادا کیا۔مولانا نے کئے ناول لکھے ہیں جن کو تاریخی ناول کے زمرے میں رکھا جانا چاہئے۔فردوس بریں، ایام عرب، حسن کا ڈاکو، منصور موہنا اور زوال بغداد افسانوی ادب میں خوشگوار اضافہ ہیں۔اردو کا مشہور و معروف مزاحیہ ہفتہ وار اودھ پنچ نے بھی افسانوی ادب کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا جس کے پہلے مدیر سجاد حسین تھے۔اودھ پنچ کے معروف نثر نگار جنہوں نے افسانوی ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ان میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی، پنڈت رتن ناتھ سرشار کے علاوہ سجاد حسین نے بذات خود کئی ناول لکھے جن میں حاجی بغلول، کایا پلٹ اور احمق الذی کافی مشہور ہیں۔

افسانوی ادب کے آغاز وارتقا میں مذکورہ ادبا کے علاوہ مرزا محمد ہادی رسوا بھی ممتاز حیثیت کے حامل ہیں جنہوں نے ناول کے فن کو وقعت بخشی۔ان کے ناول امراؤ جان ادا،شریف زادہ اور ذات شریف ناول نگاری کے فن پر پورا اترتے ہیں۔ان کے علاوہ اس زمانے کے دوسرے ناول نگار اور افسانہ نویسوں میں مولانا راشد الخیری نے بھی اہم کارنامے انجام دیئے۔تاریخی ناول نگاری میں راشد الخیری کا اہم مقام ہے جنہوں نے صبح زندگی،شام زندگی،شب زندگی، ماہ عجم،منازل،الساترہ اور عروس کربلا لکھ کر فکشن نگاری کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔اسی زمانے میں افسانوی ادب کو فروغ دینے میں کچھ ایسے ادبا کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں جنہوں نے اپنی اہم خدمات پیش کیں۔ایسے ادبا میں محمد علی طیب، جوالا پرشاد برق،عباس حسین ہوش،شاد عظیم آبادی،قاری سرفراز حسین،مرزا محمد سعید اور پنڈت کشن پرشاد کے لکھے ہوئے ناول بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

7.5 پریم چند سے قبل افسانہ نگاری کے نقوش

عزیز طلبا! واضح رہے کہ 1906 کے آس پاس پریم چند کا پہلا افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن رسالہ 'زمانہ' میں شائع ہوا تھا۔اس سے قبل سر عبدالقادر نے لاہور سے 'مخزن' نامی ایک رسالہ جاری کیا تھا جس میں مقامی ادبا کے نگارشات کے علاوہ غیر ملکی کہانیوں کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔یہ تمام کہانیاں اور افسانے محبت اور رومان پر مبنی ہوتی تھیں۔ایسے لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور سلطان حیدر جوش کے نام لئے جا سکتے ہیں۔اسی زمانے میں راشد الخیری نے نصیر اور خدیجہ اور بدنصیب کا لال لکھا جب کہ نابینا بیوی، سلطان حیدر جوش کا لکھا ہوا افسانہ شائع ہوا۔یہ وہ زمانہ تھا جب افسانوں پر تخیلی خیالات اور رجحانات غالب تھے۔چنانچہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں حقیقت بیانی کی بہ نسبت تخیل آفرینی کا رجحان غالب تھا۔یہ سبھی افسانہ نگار تخیلی فضا میں اپنے افسانوں کی تکمیل کر رہے تھے اور افسانوں میں محبت کے افلاطونی نظریے کی عکاسی۔ان کا حقیقی زندگی اور سماجی مسئلوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔آگے چل کر سماجی مسائل،حقیقی زندگی اور انفرادی جدوجہد کو پریم چند نے اپنا موضوع بنایا۔سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان کے کئی کہانیوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا

جس سے اردو دنیا کو نثر کے رنگ و آہنگ سے روشناس ہوئی۔ یلدرم کی تخلیقات میں ثالث بالخیر، جلال الدین، خوارزم شاہ، خیالستان اور حکایات واحساسات بہت ہی رنگین و معنی خیز نثر میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ان میں بھی سماجی مسائل کے بدلے جذبات کو پیش کرنے کی کوشش ہے۔لیکن یہاں طنز و مزاح کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ پریم چند سے قبل یہ افسانوی دور اردو ادب کا رومانی دور کہا جا سکتا ہے۔

پریم چند کے ابتدائی دور کے ناولوں مثلاً ان کے پہلے ناول 'اسرار معابد' اور پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' سے قبل کے افسانوی ادب پر ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر و مرزا محمد ہادی رسوا کے افسانوی ادب کو ابتدائی نقوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان حضرات کے ناولوں اور کہانیوں سے قبل ہندوستان کے مشہور چھوٹے چھوٹے قصوں کو ایک چھوٹی سی کتاب میں جمع کر کے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے 'قصص مشرق' کے نام سے شائع کیا تھا جبکہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے علاوہ بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیاں لکھی تھیں جو 'منتخب الحکایات' کے نام سے شائع ہوا۔لیکن ان دونوں کتابوں کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور قصوں کو افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں مگر ان میں افسانہ نگاری کے نقوش ضرور تھے۔

7.6 پریم چند کے پیش رو افسانہ نگار

عزیز طلبا! پچھلے صفحات میں آپ نے مطالعہ کیا کہ پریم چند کی افسانہ نگاری سے قبل اردو میں چند ایسی کہانیاں یا انشائیوں کی شکل میں مضامین ملتے ہیں جنہیں اردو افسانے کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے۔آپ نے داستانوں سے متعلق جانکاری حاصل کی جنہیں ہم افسانوی ادب کا پہلا پڑاؤ کہہ سکتے ہیں۔ان میں سے بعض پر مختصر افسانوں کا گمان تو ہوتا ہے کیوں کہ ان قصوں کہانیوں میں منظر نگاری بھی ہے، کردار بھی ہے اور پلاٹ و مقاصد بھی۔لیکن فنی اعتبار سے انہیں افسانہ نہیں کہہ سکتے۔انیسویں صدی کی آخری دہائی میں محمد حسین آزاد، فیض الحسن، پیارے لال آشوب، عبدالحلیم شرر، شوبرت لال برمن اور خواجہ حسن نظامی کے قصوں کہانیوں اور انشائیوں جیسے مضامین پر افسانوں کا گمان ہوتا ہے۔بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا راشد الخیری کا نصیر اور خدیجہ اردو افسانے کا نقش اول قرار دیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ

رسالہ مخزن لاہور میں دسمبر 1903 میں شائع ہوا تھا۔ اس ابتدائی دور کے دیگر افسانہ نگاروں میں علی محمود، وزارت حسین، حکیم یوسف حسن، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور پنڈت بدری ناتھ سدرشن کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ شروع میں ان سبھی افسانہ نگاروں کی تخلیقات سیدھے سادھے انداز کے ہیں۔ عام طور سے ان افسانوں کے موضوعات حب الوطنی، تخیل پرستی، مشرقی تہذیبی روایات اور مشرقی اقدار پر مبنی ہیں۔ انداز بیان زیادہ تر مقفی، رنگین اور پر تصنع ہے۔ ابتدائی افسانوں میں پلاٹ اور کردار اور دیگر اجزائے ترکیبی کی تنظیم برائے نام ہے۔ البتہ منظر نگاری اور طرز بیان نہایت دلکش اور لب ولہجہ جذباتی ہے۔ ان افسانوں میں واقعات اچانک ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار ان میں اپنی شمولیت ظاہر کر کے قاری کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے اور قاری وقتی طور پر تفنن طبع کا لطف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

7.7 چند مشہور افسانے

پریم چند سے قبل بہت سارے افسانے لکھے گئے جن کے متعلق آپ نے پچھلے صفحات میں پڑھا ہے۔ ان افسانوں میں حقیقت پسندی کم اور رومان زیادہ تھی۔ نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کے طرز میں لکھے گئے افسانوں کا خاص وصف رومانیت ہے۔ ان افسانوں میں تخیل کی پرواز اور زبان کی شعریت زیادہ پائی جاتی ہے۔ افسانے کے اول نقش میں ان کا اہم مقام ہے۔ ایسے افسانوں میں نگارستان، جمالستان کے افسانوں کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ابتدائی ایام کے افسانوں میں بھی کٹھپتلیوں کی طرح چلنے والے کردار نہیں بلکہ متحرک کردار نظر آتے ہیں۔ ان میں پلاٹ کا ارتقا، جزئیات کا بیان اور واقعات بہت ہی سلیقے سے اور ترتیب وار ملتے ہیں۔ ان افسانوں میں وقت اور مقام کا تعین بھی محسوس ہوتا ہے اور افسانہ اپنے اختتام پر کوئی نہ کوئی تاثر ضرور چھوڑ جاتا ہے مثال کے طور پر راشد الخیری کا پہلا طبع زاد افسانہ 'نصیر اور خدیجہ' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ رسالہ مخزن لاہور میں دسمبر 1903 میں شائع ہوا تھا۔ نصیر اور خدیجہ افسانہ ایک طویل خط کے صورت میں لکھا گیا افسانہ ہے جس میں بڑی بہن نے اپنے چھوٹے بھائی کو پند و نصیحتیں کی ہیں اور مرحومہ بہن کے بچوں کی ناگفتہ بہ حالت کی جانب بھائی کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان کی پرورش کا معقول انتظام کرنے کی درخواست کی ہے۔ اس زمانے کے دیگر افسانہ نگار حکیم یوسف حسن، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور

سدرشن ہیں۔ان سبھی کے افسانوں میں تخلیقات سیدھے سادھے انداز میں ملتے ہیں۔ ان میں حب الوطنی،تخیل پرستی،مشرقی تہذیبی روایات اور مثبت اقدار جیسا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

7.8 خلاصہ

عزیز طلبا! آپ نے اس سبق میں پریم چند سے قبل کے اردو افسانوں اور افسانہ نگاروں کے متعلق عمومی جانکاری حاصل کی۔1857ء کے بعد اردو ادب بالخصوص نثری اصناف ہیں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے بارے میں پڑھا۔ یہ بھی معلومات کیا کہ افسانوں کی بنیاد کن حقائق پر رکھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے جو حقائق و حالات بیسویں صدی کے آغاز میں تھے ان حقائق و حالات کا اثر افسانوں پر پڑنا لازم تھا۔عصری، مذہبی و سماجی اصلاحات نے بھی بشمول پریم چند کے دیگر افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔داستانوں کے بعد ناول اور ناول کے بعد کہانی اور افسانوں کی طرف رجوع ہونا اس بات کی واضح دلیل تھی کہ حالات بدل رہے تھے۔اس بدلتے ہوئے حالات میں جن افسانہ نگاروں اور نثر نگاروں نے مقصدی ادب کی طرف عوام کے ذہنوں کو کھینچا ان میں بھارتیندو، سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، بنکم چند چٹرجی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام بطور خاص لئے جا سکتے ہیں۔نذیر احمد نے اردو میں افسانوی ادب کی ناول نگاری کے ذریعہ بنیاد ڈال کر ایک نئی مثال قائم کی۔انہوں نے مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت لکھ کر نوجوان نسلوں کو راہ راست پر لانے کی کامیاب کوشش کی۔رتن ناتھ سرشار نے داستان سے افسانے تک کا نقش اپنی تحریروں میں چھوڑا۔ان کی خاص تحریریں جام سرشار، سیر کوہسار، کامنی، بچھڑی دلہن، پی کہاں اور کڑم دھڑم خاص ہیں۔رسالہ زمانہ اور رسالہ دلگداز نے بھی افسانوی ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کئے۔مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی افسانوی ادب کو مختلف طرح سے مالا مال کیا۔انہوں نے فردوس بریں، ایام عرب، حسن کا ڈاکو، منصور موہنا وغیرہ لکھ کر افسانوی ادب میں خوش گوار اضافہ کیا۔اردو کا مشہور و معروف مزاحیہ ہفتہ وار 'اودھ پنچ' جس کے پہلے مدیر سجاد حسین تھے نے بھی پریم چند سے پہلے اردو نثر بالخصوص افسانوی ادب میں اپنا متحرک کردار ادا کیا۔ بذات خود سجاد حسین نے حاجی بغلول، کایا پلٹ اور احمق الذی لکھ کر اپنی خدمات پیش کی۔ پریم

چند سے قبل جن افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ان کی کہانیاں اور افسانے محبت اور رومان پر مبنی ہیں۔ رومانی کہانیاں اور فسانے لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور سلطان حیدر جوش کے نام خصوصیت سے لئے جا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں راشد الخیری نے نصیر اور خدیجہ اور بدنصیب کا لال لکھ کر افسانے کی بنیاد مضبوط کی اور سلطان حیدر جوش نے نابینا بیوی لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا۔ پریم چند سے قبل اردو افسانے کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد آپ اس لائق ضرور ہو گئے ہوں گے کہ اس موضوع پر اظہار خیال کر سکیں۔

7.9 فرہنگ

تفنن طبع	تفریحی مشغلہ	فکشن	افسانوی ادب
اقتصادی	مالی، معاشی	زراعت	کھیتی
بحران	تعطل	استبداد	ظلم و جور سے حکومت کرنا
مرتسم	نشان زدہ، مہر لگانا	تصنع	تکلف، بناوٹ
ناگفتہ بہ	جو کہا نہ جا سکے		

7.10 نمونہ امتحانی سوالات

1۔ ابتدائی افسانہ نگاری پر مختصر نوٹ لکھئے۔

2۔ پریم چند اور ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں نے کن اصلاحی تحریکوں سے اثر قبول کئے۔ وضاحت کیجئے۔

3۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے افسانوی ادب کا مختصر جائزہ لیجئے۔

4۔ پریم چند سے قبل افسانہ نگاری کے نقوش کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔

5۔ پریم چند کے پیش رو افسانہ نگاروں کا اجمالی جائزہ لیجئے۔

7.10 سفارش کردہ کتابیں

1 سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

2 نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو

3 ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

4 مرتب دیانرائن نگم، 'زمانہ' پریم چند نمبر

5 مرتب پروفیسر گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل

پریم چند کی افسانہ نگاری

سبق کی ساخت

8.1 تمہید

8.2 مقاصد

8.3 پریم چند کے معاصر افسانہ نگار

8.4 پریم چند کے ابتدائی افسانے

8.5 پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

8.5.1 پریم چند کے افسانوں میں حقیقت پسندی

8.5.2 پریم چند کے افسانوں میں دیہی مسائل

8.5.3 پریم چند کے افسانوں میں حب الوطنی کا جذبہ

8.6 پریم چند کے مشہور افسانے

8.7 خلاصہ

8.8 فرہنگ

8.9 نمونہ امتحانی سوالات

8.10 سفارش کردہ کتابیں

8.1 تمہید

پریم چند کا زمانہ 1880 سے شروع ہوکر 1936 تک جاری رہا۔ پریم چند کے افسانوں اور کہانیوں سے پہلے بھی کئی کہانیاں اور افسانے لکھے گئے اور ان کے ہم عصروں نے بھی بہت سی کہانیاں اور افسانے لکھے۔ پریم چند کے

بعد افسانہ نگاروں کا لامتناہی سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ نہ تو پریم چند سے پہلے نہ ہی ان کے ہم عصروں نے اور نہ ان کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ایسی خوبیاں ملتی ہیں جنہیں پریم چند کے افسانوں کے ہم پلہ کیا جا سکے۔ شروع میں پریم چند نے فرضی ناموں سے کہانیاں اور افسانہ لکھے اور بعد میں پریم چند کے نام سے۔ پریم چند کے افسانوں میں جن افراد، شخصیات اور نظریات کا عکس ملتا ہے ان میں راجہ رام موہن رائے، وویکا نند، دیا نند، مہاتما گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو، بھگت سنگھ اور چندر شیکھر کے سوشل ریفارم، مذہبی حقیقت پسندی، سماجی برابری اور حب الوطنی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ پریم چند انسانی ہمدردی اور حقوق انسانی کے نظریات کے لئے مغربی ممالک کے سماجی مصلح گیری بارڈی، کارل مارکس اور لینن وغیرہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پریم چند کا بچپن گاؤں میں ہی گزرا۔ انہوں نے دیہی زندگی کو بڑے شوق سے برتا۔ گاؤں کی خوشیاں، معاشی مشکلات، سماجی نابرابری اور مذہبی چپقلش کو بہت نزدیک سے محسوس کیا اس لئے ان کی کہانیوں میں ان کے ناولوں میں اور ان کے ڈراموں میں بھی دیہی زندگی کی بہتر عکاسی ملتی ہے۔ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' کے نام سے شائع ہوا جسے حکومت وقت نے ضبط کر لیا۔ پریم چند کی اولین کہانیوں میں عیدگاہ، دو بیل، پنچایت، نمک کا داروغہ، پوس کی رات، بڑے گھر کی بیٹی، منتر اور سوز وطن شامل ہیں۔ عزیز طلبا اس یونٹ میں آپ پریم چند کی افسانہ نگاری کے متعلق قدرے تفصیلی جانکاری حاصل کریں گے۔

8.2 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ☆ پریم چند کے افسانوں کی انفرادیت بیان کر سکیں گے۔
- ☆ معاصر افسانہ نگاروں میں پریم چند کا مقام کا تعین کر سکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے ابتدائی دور کی افسانہ نگاری کی خصوصیات سے بحث کر سکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے افسانوں میں حقیقت نگاری پر اظہار خیال کر سکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے افسانوں میں دیہی اور علاقائی مسائل کا تجزیہ کر سکیں گے۔

8.3 پریم چند کے معاصر افسانہ نگار

عزیز طلبا! آپ سبھی جانتے ہیں کہ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا وہ بنارس کے قریب لمہی گاؤں میں 31 جولائی 1880 میں پیدا ہوئے۔ انہیں گھر میں پیار سے نواب رائے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے والد عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ پریم چند کے دادا گرسہائے لال پٹواری رہے رہے تھے۔ پریم چند کی والدہ کا نام آنند دیوی تھا۔ پریم چند کا بچپن کافی پریشانیوں میں گزرا جن کا اثر ان کے افسانوں اور کہانیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی میں ہوئی اور بعد میں انگریزی بھی سیکھا۔ متعدد پریشانیوں کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا لیکن تنگ دستی، گھریلو پریشانیوں اور والد کے ناگہانی انتقال کے بعد اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکے۔ کچھ دنوں تک پانچ روپے مہینہ تنخواہ پر ٹیوشن پڑھایا پھر سررشتہ تعلیم میں تربیت حاصل کرنے کے بعد کانپور میں اسکول میں ٹیچر ہوگئے۔ چند مہینے بعد ان کا تبادلہ پرتاپ گڑھ ہوگیا اور پھر ٹیچرس ٹریننگ کے لئے الہ آباد بھیج دیئے گئے پھر الہ آباد مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے لیکن جلد ہی ان کا تبادلہ کانپور گورنمنٹ اسکول میں ہوگیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں منشی پریم چند نے ادبی میدان میں بالخصوص فکشن کے صنف میں اپنا قدم رکھا اور 'زمانہ' کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم سے تعلقات استوار ہوئے جنہوں نے پریم چند کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔

عزیز طلبا! آپ جان چکے ہیں کہ پریم چند کا تعلق خالص دیہی علاقے سے تھا۔ چنانچہ ان کی کہانیوں اور افسانوں میں دیہی زندگی کی حقیقی عکاسی ملتی ہے۔ پریم چند سے قبل مختصر اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا لیکن اس پورے دور میں کوئی ایسا افسانہ نگار نظر نہیں آتا جسے پریم چند سے بہتر افسانہ نگار کہا جاسکے۔ پریم چند کے ہم عصروں میں ایک اہم نام سجاد حیدر یلدرم کا بھی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم بنیادی طور پر رومانوی افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کا اکثر موضوع اور دائرہ کار عورت کی محبت ہے۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور سلطان حیدر جوش نے بھی رومانوی اور تخیلی افسانے لکھے۔ سجاد حیدر یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں 1880 میں پیدا ہوئے۔ اعلی تعلیم علیگڑھ سے حاصل کی۔ زبان وادب میں ترکی زبان وادب سے گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ ان کے افسانوں کا زیادہ تر خمیر ترکی زبان کے

افسانوں اور کہانیوں سے تیار ہوتی ہے۔ ترکی زبان سے واقفیت کے سبب ترکی سفارت خانے میں ترجمان کی حیثیت سے تقرر ہوا اور بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ گوکہ یلدرم کے بیشتر افسانے ترکی زبان سے ترجمہ شدہ ہیں لیکن ان پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'خیالستان' ہے۔ یلدرم نے ترکی کے علاوہ روسی اور انگریزی زبانوں کے تراجم اور طبع زاد افسانے بھی لکھے ہیں۔ سلطان حیدر جوش بدایوں کے رہنے والے تھے لیکن ان کا بچپن دہلی میں گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی دہلی میں ہوئی۔ اعلی تعلیم کے لئے علی گڑھ آئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ سلطان حیدر جوش نے اہل ہند کی یورپ کی اندھی تقلید کو اپنا موضوع سخن بنایا اور اس موضوع پر مضامیں کے علاوہ ناول اور افسانے بھی لکھے۔ سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں اصلاح کا جذبہ اس قدر غالب ہے کہ ان کے افسانے وعظ و نصیحت بن کر رہ جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری (1877-1966) کثیر جہت ادیب ہیں۔ انہوں نے افسانے اور انشائیے، مضامین اور تنقیدی مضامین لکھے۔ نیاز فتح پوری شعر و ادب کی افادیت کے قائل نہیں۔ وہ انہیں لطف اندوزی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور ادب میں جمالیاتی اقدار کے حامی ہیں۔ وہ افسانے کے میدان کچھ خاص نہیں لیکن میدان تنقید میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں۔

8.4 پریم چند کے ابتدائی افسانے

پریم چند کے ابتدائی دور کے افسانے عام طور سے افسانوی کہانیاں ہیں۔ اس کی مثال ان کی ابتدائی دور کے افسانوی مجموعے 'سوز وطن' کی کہانیوں یا افسانوں سے دیا جا سکتا ہے۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' 1907ء میں نواب رائے کے فرضی نام سے شائع ہوا اور 1908 میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ 'سوز وطن' شائع ہوا۔ پہلے دور کی کہانیوں اور افسانوں میں پریم چند ٹیگور کے ادب پاروں جو ہندی اردو کے ترجموں کے ذریعہ مقبول ہوئے تھے اور اردو میں رومانیت پسند افسانے نے جو ان کے ہم عصروں نے لکھے تھے اور کچھ مغربی ادب کے مطالعے اور تراجم کا اثر پریم چند کے ابتدائی افسانوں پر نظر آتا ہے۔ پریم چند کے پورے افسانوی فن کو چار ادوار میں تقسیم کر کے زیادہ بہتر طریقے سے ان کی فنی خوبیوں کو اور ادبی ارتقا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ابتدا سے 1909ء تک کی کہانیاں جبکہ دوسرا

دور پریم چند کے تاریخی اور اصلاحی افسانے ہیں جو 1909ء سے 1920ء کے درمیان میں لکھے گئے۔ پریم چند کے افسانوں کے تیسرے دور میں وہ افسانے شمار کئے جاتے ہیں جو اصلاحی اور سیاسی نوعیت کے ہیں اور 1920ء سے 1932ء کے درمیان لکھے گئے ہیں جبکہ چوتھا اور آخری دور پریم چند کے سیاسی اور فکری افسانوں پر مشتمل ہے جو 1932ء سے ان کے انتقال تک کے زمانے پر مشتمل ہے۔

پریم چند کی کہانیوں کے پہلے مجموعے 'سوز وطن' کا اشتہار اگست 1908ء زمانہ میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی پانچوں کہانیاں حب وطن کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ 1909ء میں پریم چند کا تبادلہ مہوبہ ہو گیا۔ اس وقت وہ نائب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول تھے۔ سوز وطن کی کہانیاں حکومت کی ناراضگی کا موجب ہوئی۔ حالاں کہ یہ کہانیاں فرضی نام نواب رائے کے نام سے لکھی گئی تھی لیکن حکومت نے جلد ہی پتہ لگا لیا کہ یہ ایک سرکاری ملازم دھنپت رائے کا قلمی نام ہے۔ چنانچہ پریم چند کو اس کے لئے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور سوز وطن کے سارے نسخوں کو ضبط کر لیا گیا۔ پریم چند کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ حکومت کی اجازت کے بغیر نہ کچھ لکھیں اور نہ شائع کریں۔ اسی واقعے کے بعد پریم چند نے فرضی نام کے بجائے قلمی نام پریم چند اختیار کیا۔ سوز وطن کی کہانیوں کا دلسوز واقعہ خود پریم چند نے یوں بیان کیا ہے:

> ''ایک دن میں رات کو اپنی راؤٹی میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے نام ضلع کے حاکم اعلی کا پروانہ پہنچا کہ میں ان سے فوراً ملوں۔ جاڑوں کے دن تھے، صاحب دورے پر تھے۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات چالیس میل طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ صاحب کے سامنے ''سوز وطن'' کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹنکا۔ اس وقت میں نواب رائے کے نام سے لکھا کرتا تھا مجھے اس کا کچھ پتہ چل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور اسی کی جوابدہی کے لئے مجھے بلایا گیا ہے۔
>
> صاحب نے مجھ سے پوچھا:
> ''کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے۔؟''
> میں نے تسلیم کیا۔

صاحب نے مجھ سے ایک ایک کہانی کا نفس مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے:

''تمہاری کہانیوں میں باغیانہ خیالات بھرے ہوئے ہیں۔اپنی خوش نصیبی سمجھو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔مغلوں کا راج ہوتا،تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ لئے جاتے۔تمہاری کہانیاں غیر جانبدارانہ ہیں،تم نے انگریز سرکار کی توہین کی ہے۔''

دوسرے دور کے افسانوں میں جو 1914-1909ء کے درمیان میں لکھے گئے مہوبہ اور بندیل کھنڈ کے تاریخی کھنڈرات کی عظمت رفتہ کو موضوع بنایا ہے اور اس کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا۔پریم چند کا خیال تھا کہ ان تاریخی کھنڈرات کے شاندار ماضی کو افسانوں کے ذریعہ زندہ کیا جائے۔چنانچہ اس دور کے تاریخی افسانے اسی تحریک کی عکاسی کرتے ہیں۔اس دور کے جن افسانوں اور کہانیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ان میں رانی سارندھا1910،راجا ہردول1911،آلہا1912 اور گناہ کا 'اگنی پن' اس دور کے یادگار افسانے ہیں۔اسی دور میں پریم چند نے پریم پچیسی، پریم بتیسی اور پریم چالیسی میں شامل کئی افسانے لکھے۔اصل میں پریم چند اس زمانے میں حب وطنی کے جذبے سے سرشار تھے اور مادر وطن کی عظمت رفتہ کے ذریعہ ہندوستانیوں کی رگوں میں پھر سے تازہ خون دوڑانا چاہتے تھے۔اس دوران پریم چند نے چند اصلاحی افسانے بھی لکھے جن میں بازیافت، حج اکبر،سوتیلی ماں،نجات،مندر اور مستعار گھڑی قابل ذکر ہیں۔

8.5 پریم چند کے افسانہ نگاری کی خصوصیات

عزیز طلبا! آپ جان چکے ہیں کہ پریم چند پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے انسانی مسائل بالخصوص دیہی مسائل پر کھل بات کی۔ان کے زیادہ تر کردار گاؤں میں بسنے والے لوگوں کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں۔آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ پریم چند کو ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات سے گہری دلچسپی تھی اور وہ اپنی کہانیوں کا موضوع ان ہی سیاسی و معاشی پس منظر سے منتخب کرتے تھے۔چنانچہ ان کا پہلا افسانہ 1905 میں بنگال کی تقسیم سے متاثر ہو کر 'دنیا کا سب

سے انمول رتن' کے نام سے لکھا گیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ 1909ء میں ان کے پانچ افسانوں کا مجموعہ 'سوز وطن' شائع ہوا جسے بعد میں سرکار نے ضبط کرلیا۔ گو کہ پہلے اور دوسرے دور کی کہانیوں اور افسانوں میں کچھ صنفی خامیاں نظر آتی ہیں مگر ان سب میں مقاصد اور ادبی خصوصیات کی مستحسن کوشش نظر آتی ہے۔ حالاں کہ پریم چند نے کہانیوں اور افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور ناول بھی لکھے مگر پریم چند خود عوام کے لئے اور سماجی مقاصد کی تکمیل کے لئے کہانی یا افسانے کو زیادہ مفید تصور کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ افسانوں کا سیدھا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کہانی یا افسانے کی زبان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کہانی کی زبان بہت ہی آسان اور جلد سمجھ میں آنے والی ہونی چاہئے۔ ناول وہ لوگ پڑھتے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے اور وقت بھی ان ہی کے پاس رہتا ہے جن کے پاس دولت ہوتی ہے۔ کہانی عام انسانوں کے لئے لکھی جاتی ہے جن کے پاس نہ دولت ہے نہ وقت۔''

دیگر نثری ادب میں افسانوی دب کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ اسے کم وقت میں پڑھ کر ادبی لطف بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نگار کے مقاصد کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ پلاٹ کو کسی بھی کہانی یا افسانے کے لئے ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ جس وقت پریم چند نے کہانی لکھنا شروع کیا تھا اس وقت پلاٹ کا کوئی واضح تصور نہیں تھا لیکن پریم چند کو اس کا احساس ضرور تھا۔ چنانچہ اس لحاظ سے اگر پریم چند کی کہانیوں اور افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو وقت اور پختگی کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں کے پلاٹ میں ہمیشہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی اور اس سے ان کے فن کو مزید پختہ ہونے کا موقع ملا۔ اس کی مثال 'بڑے گھر کی بیٹی' اور 'پوس کی رات' سے دی جا سکتی ہے۔ بڑے گھر کی بیٹی کا پلاٹ بہت ہی پھیلا ہوا ہے اور انداز بھی بیانیہ ہے لیکن اس کے بعد کی کہانی 'پوس کی رات' میں پریم چند نے پلاٹ کو جدید انداز سے سنوارا ہے۔ عزیز طلبا! یوں تو پریم چند کی کہانی اور افسانوں کی متعدد خصوصیات ہیں۔ آیئے ہم یہاں ان کی تین اہم خصوصیات حقیقت پسندی، دیہی مسائل اور حب الوطنی کا الگ سے جائزہ لیتے ہیں۔

8.5.1 پریم چند کے افسانوں میں حقیقت پسندی

عزیز طلبا! پریم چند کی حقیقت نگاری کی حقیقت تقریباً ان کی ہر تخلیقات سے ظاہر ہے۔ حقیقت پسندی ہی تھی کہ اکثر نقادوں نے پریم چند کو نئی کہانی کے فن کا موجد قرار دیا ہے۔ کیوں کہ یہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ہندوستان کے دیہی علاقوں کے کثیر الجہات کشمکش کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے اور سماجی حقیقت کو اس طرح پیش کیا کہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہو گئے۔ حقیقت نگاری کی وجہ سے ہی ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' ضبط کر کے جلا دیا گیا۔ اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ جس مصنف کی ادبی زندگی آغاز اس طرح ہو کہ اس کا پہلا مجموعہ ہی حکومت وقت کی طرف سے بغاوت کے الزام میں نذر آتش کر دیا جائے۔ یہ باور کراتا ہے کہ وہ حالات کو بدلنا چاہتا تھا۔ ان حالات کو جو نچلے طبقے اور کسانوں کے مفاد کے خلاف تھے اور ان حالات کو آزادی کے بغیر بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ پریم چند چوں کہ خود ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے اور پوری زندگی مشقت کی چکی میں پستے رہے۔ چنانچہ انہوں نے ادب میں حقیقت نگاری کے تحت ان عام لوگوں کو بھی جگہ دی جسے دوسرے افسانہ نگار، ناول نگار اور فکشن نگار نہ دے سکے۔ وہ کسانوں، زمینداروں، چھوٹے چھوٹے گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے لوگوں اچھوتوں، مذہب کے ٹھیکے داروں، نیتاؤں اور سماج کے دیگر بہروپیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے اکثر و بیشتر یہی کردار ان کی سبھی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے ملک کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا تجزیہ کر کے اپنے افسانوں میں اصلاح و تبدیلی کی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور انہیں فنی نقطہ نظر سے اس چابک دستی سے برتا ہے کہ وہ حقیقت پسندوں میں ایک بڑے اور بلند مقام کے حقدار سمجھے جاتے ہیں۔ پریم چند نے زندگی اور اس کے حسین اور سچے جذبات کی داخلی اور خارجی کشمکش کی اور عوام کے قلبی اسرار کی جتنی بہتر عکاسی کی ہے کسی دوسرے ادیب کے یہاں مشکل سے ہی ملے گی۔

پریم چند ابتدا سے ہی حقیقت نگار واقع ہوئے تھے۔ ان کی نظر نے جو دیکھا، جو برتا اسے ہی پیش

کر دیا لیکن ایسا کرتے وقت اپنی کہانیوں اور افسانوں میں ایک زندہ چنگاری کو ضرور تلاش کرتے ہیں جو انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ انہوں نے خود حقیقت نگاری کی تفصیل بتاتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''واقعیت چاہتی ہے کہ آرٹسٹ دنیا کو اس طرح دکھائے جیسے وہ اسے دیکھتا ہے اگر اس کے انسانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچے، اگر اس سے اس کے حس انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے۔ پر اسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں ہے مگر ادیب سب کچھ سمجھنے پر بھی آئیڈیلسٹ بننے کے لئے مجبور ہے جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے۔ موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اسے بیتاب کریں گی۔۔۔۔ اگر کسی بہتر زندگی اور خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو اصلاح کی کس منزل مقصود کی طرف لے جائیں گے۔''

پریم چند کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی کہانیوں اور افسانوں سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔ ان کا مشہور زمانہ خطبہ جو ترقی پسند تحریک کی صدارت کرتے ہوئے دیا گیا تھا کا آغاز ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔۔۔۔۔ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ افسانے میں حقیقت پسندی کے کتنے حامی ہیں۔ دیگر افسانوں کے علاوہ کفن، نئی بیوی' اور بڑے بھائی صاحب پریم چند کی حقیقت پسندی کی انتہائی نقطہ عروج کہے جا سکتے ہیں۔

8.5.2 پریم چند کے افسانوں میں دیہی مسائل

عزیز طلبا! آپ جان چکے ہیں کہ پریم چند نے اپنی بیشتر کہانیوں، افسانوں میں خمیر اپنے دیہی علاقوں ہی سے تیار کیا ہے۔ ان کے پلاٹ نگاری اور کردار دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے

گاؤں کے نچلے طبقے سے لے کر زمیندار طبقے تک کی ہو بہو عکاسی کی ہے۔ان کے افسانوں میں زمیندار، پٹواری،تحصیلدار، چوکی دار، جج ، وکیل، ملا، پنڈت، مزدور، کسان ، گھریلو عورتیں، چھوٹے چھوٹے کام دھندے اور دیہی صنعت میں لگے ہوئے افراد سبھی ملتے ہیں۔ پریم چند نے طبقاتی کشمکش کی بہترین عکاسی اپنی کہانیوں میں کی ہے۔ یہ کشمکش ان کے ناولوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے ہمیشہ کسانوں اور مزدوروں کے مقام کو سوسائٹی میں سب سے افضل سمجھا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ''چوں کہ ہمارا ملک بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اس لئے کل کارخانے اور صنعت وحرفت ہمیشہ زراعت کے طابع ہی رہیں گے۔ اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری دیہی زندگی برباد نہ ہو''۔ پریم چند پہلے افسانہ نگار ہین جنہوں نے اپنے افسانے میں دیہی مسائل کو اجاگر بھی کیا اور حل بھی پیش کیا۔ان کا کردار یا ہیرو حویلیوں کا ،اونچی عمارتوں کا اور کسی ڈرائنگ روم کا شخص نہیں بلکہ گاؤں کے کھیت کھلیان میں رہنے والے جاڑا، گرمی اور برسات کی سختیوں کو برداشت کرنے والے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والے مزدور اور کسان ہیں۔ان کے بہت سے افسانے ایسے بھی ہیں جن میں خود ان کی ذاتی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔اس کی مثال کپتان، علیحدگی، تحریک اور مستعار گھڑی وغیرہ سے دی جا سکتی ہے۔ پریم چند کو دیہاتی زندگی اور گاؤں میں رہنے والے لوگوں کی نفسیات اور سماجیات کا بخوبی علم ہے۔افسانہ کفن میں جس طرح انہوں نے دیہی زندگی کی حقیقت، ناہمواریاں، مشکلیں اور غربت کو پیش کیا ہے وہ ان کی نفسیاتی بالیدگی کا مظہر ہے۔ انہوں نے افسانے میں گھیسو اور مادھو کی کرتوتوں اور بے حسی کی جس طرح عکاسی کی ہے وہ ان کے کمال فن کا نمونہ ہے۔ایسی مثالیں زادراہ، واردات، پنچایت، عیدگاہ، بوڑھی کاکی، پنساری کا کنواں، پوس کی رات اور نئی بیوی سے بھی دی جا سکتی ہے۔انہوں نے دیہات کی تصویر کشی جس فنکاری سے کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔مثال کے لئے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> ''اساڑھ کا مہینہ تھا۔کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔گاؤں کی بوڑھی بنیائن نئی نویلی دلہن بنی ہوئی تھی اور فاقہ کش کہار بارات کا دلہا بنا

تھا۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔
نالے پرشور، ندیاں تھاہ، چاروں طرف ہریالی اور سبزہ نزہت کا حسن بسیط۔''

غرض کہ پریم چند نے دیہی زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا جس کا بہت زیادہ اثر ان کی کہانیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں بھری پری زندگی کی پوری عکاسی کرتی ہے۔ پریم چند کی کہانیاں اور افسانے ہمیں کتاب کے صفحات سے حقیقی زندگی میں لاکر کھڑا کر دیتی ہے اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ ان واقعات کو ہم اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پریم چند کی کہانیاں ان کے ہم عصروں اور ان کے بعد لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ پریم چند نے اردو ادب میں عوامی عکاسی کی جو روایت چلائی وہ بہت جلد مقبول عام ہوئی اور وہ سبھی ادیب جو دیہی زندگی سے واقفیت رکھتے تھے انہوں نے پریم چند کی دیہی حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ پریم چند کے اس راستے پر چلنے والے افسانہ نگاروں میں سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور اپندر ناتھ اشک وغیرہ کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔

8.5.3 پریم چند کے افسانوں میں حب الوطنی

حب الوطنی پریم چند کے افسانوں کی چند اہم خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے۔ عہد پریم چند میں جو ملک کے حالات تھے خواہ سیاسی ہوں یا سماجی یا معاشی اس کا اثر ان کی زندگی اور ان کے ادب پر نمایاں ہیں۔ ''سوز وطن'' کی کہانیاں اس کی زندہ جاوید مثال ہیں۔ پریم چند نے خود اپنی کہانیوں کا مقصد حصول آزادی قرار دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس دور کے سب سے بڑے اہم مسئلے حب الوطنی اور آزادی کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ پریم چند کے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تخلیقات میں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے۔ حصول آزادی کے لئے ایسی اتحاد اور قومی ہم آہنگی بالخصوص ہندو مسلم کا آپسی اتفاق بہت ہی ضروری تھا اور انگریز اس مسئلے سے فائدہ اٹھا کر ان میں نفاق پیدا کرتے تھے۔ پریم چند نے اپنی تحریروں سے ہندو مسلم اتحاد کے مقاصد کے حصول کی کوشش کی۔ اس کی مثال ان

کے سبھی مجموعوں 'سوز وطن' 'پریم پچیسی' 'پریم بتیسی' 'واردات' 'زادراہ' 'خواب وخیال' 'خاک پروانہ' اور 'آخری تحفہ' کے اکثر بیشتر کہانیوں اور افسانوں میں مل جائے گا۔ پریم چند کے متعلق اور ان کی فنکارانہ عظمت کو حب الوطنی کے پس منظر میں سمجھنا چاہئے۔

1920-1932ء کے درمیان کی کہانیوں اور افسانوں پر حب الوطنی کا ہندوستانی سیاست کا رنگ اتنا غالب ہے کہ ان سے الگ ہٹ کر پریم چند کو سمجھنا مشکل ہے۔ پریم چند کے حب الوطنی کے متعلق عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مؤرخ کا قلم جب آج سے سو پچاس برس بعد لکھے گا تو اس میں اس تیس بتیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔''

حب الوطنی کا جذبہ ہی تھا کہ پریم چند نے سرکاری ملازمت کا جوا اپنے کاندھے سے اتار پھینکا اور اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے قلم کے لئے بھی آزادی حاصل کر لی۔ وہ بے جھجک ہو کر بغیر پابندیوں کے وطن کے حق میں اور جدو جہد آزادی کے حق میں وہ سب کچھ لکھنے لگے جس کا انہوں نے من بنا لیا تھا۔ چنانچہ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد پوری طرح ان کے قلم نے حب الوطنی کی راہ اختیار لی۔ اس زمانے کی تحریروں میں اصلاحی تحریک کے ساتھ ساتھ سیاسی اور حب الوطنی کا رنگ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی مثالیں جیل، بھاڑے کا ٹٹو، قاتل اور ستیہ گر افسانوں سے دی جا سکتی ہے۔

8.6 پریم چند کے مشہور افسانے

پریم چند سے قبل کے افسانہ نگاروں نے دیہی مسائل، غربت، افلاس اور مزدوروں سے متعلق کم توجہ دی۔ پریم

چند نے باضابطہ اپنے افسانوں اور کہانیوں سے دیہی مسائل، غربت، کسان، مزدور کے مسائل اور بے بسی کی طرف توجہ دی اور اسے اپنی تحریروں میں فنی حیثیت سے پیش کیا۔ پریم چند کے مشہور افسانے جن میں انہوں نے اس کی طرف توجہ دلائی ان میں بطور خاص غریبی کا انعام، بیوہ کا ایثار، آنسوؤں کی ہولی، سہاگ کا جنازہ، اُبھاگن، پوس کی رات، کفن، دوبیل، سوا سیر گیہوں، بوڑھی کاکی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ پریم چند نے اس کے علاوہ ملک وقوم کے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے اور عظمت رفتہ کو یاد دلانے اور بحال کرنے کے لئے کہانیوں اور افسانوں کا سہارا لیا۔ پریم چند نے حب الوطنی، ہم آہنگی اور ہندو مسلم اخوت پر خصوصی توجہ دلائی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'سوز وطن' جو ملک وقوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھا حکومت وقت کو ناگوار گزرا۔ ان کو طلب کیا اور تفتیش کے بعد سوز وطن کے مجموعے کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے موضوع سے متعلق مشہور افسانوں میں دنیا کا سب سے انمول رتن، یہی میرا وطن ہے، عشق دنیا اور حب وطن، رانی سارندھا، راجہ ہردول، انسان کا مقدم فرض وغیرہ خاص ہیں۔

8.7 خلاصہ

عزیز طلبا! آپ نے اس سبق میں پریم چند کی افسانہ نگاری کے ضمن میں ان کے معاصر افسانہ نگاروں اور پریم چند کے ابتدائی افسانے کے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پریم چند کی افسانہ نگاری کی چند اہم خصوصیات کے متعلق بھی پڑھا۔ پریم چند کے افسانہ نگاری کی اہم خصوصیات میں حقیقت نگاری، دیہی مسائل اور حب الوطنی سرفہرست ہیں۔ آپ جان چکے ہیں کہ پریم چند کا زمانہ 1880 سے 1936 تک کا ہے۔ جس میں ان کا ادبی سفر قریب 30 سال کے عرصے پر مشتمل ہے۔ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' 1908ء میں شائع ہوا جس میں پانچ کہانیاں شامل تھیں۔ ان کا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' اسی مضمون میں شامل تھا۔ 1908 سے 1936 تک کے اس مختصر سے عرصے میں ان کی متعدد کہانیاں اور افسانے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوئے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پریم چند ایک اسکول ٹیچر تھے اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ان پر برطانوی حکومت کی سخت نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے مجموعے کو سرکار نے ضبط کر لیا۔ یوپی کے مختلف اضلاع میں درس وتدریس کے دوران ہی

پریم چند نے اپنے نگارشات کی تخلیق کی۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ پریم چند چوں کہ گاؤں کے ہی رہنے والے تھے اس لئے ہندوستان کے گاؤں کے مسائل کو انہوں نے بہت نزدیک سے صرف دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ برتا بھی تھا۔ اس کا عکس ان کے اکثر و بیشتر افسانوں میں ملتا ہے۔ ان افسانوں میں زمیندار، پٹواری، تحصیلدار، جج، وکیل، ملا، پنڈت، مزدور، کسان، گھریلو عورتیں اور چھوٹے چھوٹے کام دھندوں میں لگے ہوئے افراد ان کے افسانوں کے کردار ہیں۔ پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے متمنی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں واردات، زادراہ، خواب و خیال، خاک پروانہ اور آخری تحفہ کے اکثر و بیشتر کارناموں میں اس کی عکاسی ہوتی ہے۔ پریم چند حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں اور پوری زندگی حب الوطنی کے فروغ اور جدوجہد آزادی، سماجی مساوات کا درس تخلیق سے دیتے رہے۔ پریم چند کے مشہور افسانوں میں غریبی کا انعام، بیوہ کا ایثار، آنسوؤں کی ہولی، سہاگ کا جنازہ، ابھاگن، پوس کی رات، کفن، دوبیل، سوا سیر گیہوں، بوڈھی کاکی اور عیدگاہ وغیرہ ہیں۔

8.8 فرہنگ

لامتناہی	ختم نہ ہونے والا	سوشل ریفارم	سماجی اصلاح
کثیر جہت	کثیر سمت، کثیر پہلو	مستعار	ادھار
اصرار	ہٹ، ضد	منحرف	پھرنے والا

8.9 نمونہ امتحانی سوالات

1۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

2۔ پریم چند کے افسانوں میں حقیقت پسندی کا جائزہ لیجئے۔

3۔ پریم چند نے افسانوں میں دیہی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس قول کی وضاحت کیجئے۔

4۔ پریم چند کے افسانوں میں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے۔تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

5۔ پریم چند کے مشہور افسانوں کا اجمالی جائزہ لیجئے۔

8.10 سفارش کردہ کتابیں

1۔ سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

2۔ نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو

3۔ ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

4 مرتب دیانرائن نگم، 'زمانہ' پریم چند نمبر

5 مرتب پروفیسر گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل

پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ 'نئی بیوی' 'نجات' 'کفن'

اکائی کی ساخت

9.1 تمہید

9.2 مقاصد

9.3 پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ

9.4 افسانہ 'نئی بیوی' کا تجزیہ

9.5 افسانہ 'نجات' کا تجزیہ

9.6 افسانہ 'کفن' کا تجزیہ

9.7 خلاصہ

9.8 فرہنگ

9.9 نمونہ امتحانی سوالات

9.10 سفارش کردہ کتابیں

9.1 تمہید

عزیز طلبا! زیر مطالعہ یونٹ نمبر 3 جس میں پریم چند کے فن افسانہ نگاری سے متعلق اور ان کے تجزیاتی مطالعے سے متعلق تین اسباق شامل ہیں۔ آپ نے دو اسباق کا مطالعہ کر لیا ہے جن میں پریم چند کی افسانہ نگاری کے پس منظر سے متعلق، ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں سے متعلق مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے پریم چند سے قبل کے افسانوں کا مطالعہ آپ نے سبق نمبر 1 میں کیا ہے۔ سبق نمبر 2 میں پریم چند کی افسانہ نگاری کی عمومی خصوصیات اور ان کے افسانوں کی معنویت، افادیت اور اہمیت سے متعلق بھی مطالعہ کیا ہے۔ نیز پریم چند کے افسانوں میں حقیقت پسندی، دیہی مسائل اور حب

الوطنی کی خصوصیات کی جانکاری بھی حاصل کی ہے۔آپ کومعلوم ہے کہ پریم چند کی پیدائش 1880 میں ہوئی اوران کا انتقال 1936 میں ہوا۔ یہ وہی زمانہ ہے جس زمانے میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تحریک عروج پر تھی اور یہ وہی زمانہ ہے جب برطانوی سامراج کی استبدادی قوتوں نے ہندوستان کو اپنے شکنجے میں مزید مضبوطی سے جکڑنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کی دیہی صنعت ومعیشت کو تباہ کیا، یہاں کی گنگا جمنی تہذیب بالخصوص ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش کی، کسانوں پر مظالم کی انتہا کردی اور سماجی وسیاسی رہنماؤں کو قید کرلیا۔ان سب حالات وواقعات کا پریم چند کے افسانوی ادب پر گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ ان کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں میں جابجا سماجی نابرابری، معاشی بدحالی، قانونی استبداد اور سیاسی کشمکش کی عکاسی ہوتی ہے،عزیز طلبا! پریم چند کے افسانوں سے متعلق اس تیسرے یونٹ کے تیسرے سبق میں آپ ان کے معروف افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔ نیز ان کے معروف ومشہور افسانوں کے تناظر میں پریم چند کی طرز نگارش، اسلوب بیان اور حقیقت نگاری وغیرہ کا جائزہ بھی لیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے تین معروف ومشہور افسانوں 'نئی بیوی' 'نجات' اور 'کفن' کا تنقیدی جائزہ بھی لیا جائے گا جس سے آپ کو پریم چند کی فن افسانہ نگاری کی خصوصیات اور مخصوص افسانوں کے متعلق خصوصی معلومات حاصل ہوجائے گی۔

9.2 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ☆ پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ کے سکیں گے۔
- ☆ افسانہ 'نئی بیوی' کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- ☆ افسانہ 'نجات' کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- ☆ افسانہ 'کفن' کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- ☆ پریم چند کی طرز نگارش اور اسلوب کی جانکاری حاصل کرسکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے افسانوں میں سماجی بیداری پر اظہار خیال کرسکیں گے۔

9.3 پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ

پریم چند نے تقریباً تین سو کہانیاں اور افسانے لکھے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی تعداد میں لکھنے والے فن کار کے فن کے سارے لوازمات کو اور ساری فنی خوبیوں کو برتنا کوئی آسان کام نہیں۔ چنانچہ پریم چند کی ابتدائی کہانیوں اور افسانے فنی اعتبار سے کمزور ہیں اور ان پر داستانوی رنگ کی آمیزش ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پریم چند کے افسانوں میں پختگی آتی گئی۔ خواہ وہ کہانیاں اور افسانے ہوں یا ناول اور ڈرامے۔ افسانوں میں کفن اور ناولوں میں گئودان ان کے فکشن نگاری کے نقطہ عروج ہیں اور باوجود کوششوں کے کوئی بھی افسانہ نگار اور ناول نگار نہ تو کفن سے آگے نکلا اور نہ گئودان سے۔ چنانچہ اگر ابتدائی کہانیوں اور افسانوں کو الگ کرنے کے بعد پریم چند کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے، ان کی فنی خوبیوں کو جانچا پرکھا جائے اور ان کی کہانیوں میں عصری حسیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پریم چند کے کئی افسانوں میں پریم چند کی عصری حسیت کا کما حقہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں کی تہداری ہمیں معنویت عطا کرتی ہے۔ پریم چند بھی فرائڈ کی طرح نام نہاد تہذیب و اخلاق اور سماجی بندھنوں کے تحت انسانی شخصیت میں پیدا ہونے والے تضاد اور انتشار سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ ایک انسان کے لئے جنگلی وجود کی جانب مراجعت کو ہی اس کی سچی خوشی کا باعث گردانتے ہیں۔ اس کی مثال 'نئی بیوی' اور 'معصوم بچہ' سے دی جا سکتی ہے۔ پریم چند کے اکثر افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں واضح طور پر موضوع کی برتری اور پلاٹ کا احساس پورے افسانے پر چھایا رہتا ہے۔ وہ زندگی اور سماج کے جس مسئلے کو بھی افسانے کا موضوع بناتے ہیں وہ موضوع پورے افسانے کی تشکیل کے دوران ان کے ذہن پر حاوی رہتا ہے۔ پریم چند کے متعدد افسانے ایسے ہیں جن پر ان کا موضوع حاوی ہے۔ بقول حامدی کاشمیری:

> ''وہ سماجی برائیوں، طبقاتی نظام کی خرابیوں، انسانی اعمال کے نتائج وعواقب اور نفسیاتی محرومیوں کو افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ یوں تو وہ چابکدستی

سے کردار و واقعہ سے بھی مدد لیتے ہیں اور قصہ پن کی چاشنی سے کام لیتے ہیں، لیکن وہ افسانے بن جاتے ہیں؟ ایسے افسانوں میں وہ واضح، معین اور ٹھوس اخلاقی یا سماجی نظریے کے تحت کہانی کو اپنی مرضی کے تابع کرتے ہیں تا کہ لوگوں پر ان کا نظریہ واضح ہو۔ نتیجے میں افسانے سے اس کا آزاد اور خودمختارانہ وجود چھن جاتا ہے، اور افسانہ چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جاتا ہے، ایسی مقصدی کہانیوں کے انبار لگانے سے پریم چند نے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا ہے''۔

عزیز طلبا! آپ کو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ شروع شروع میں پریم چند نے متعدد ایسی کہانیاں لکھیں جن پر مقصدیت حاوی نظر آتا ہے۔ تاہم بعد کے افسانوں بالخصوص ان کے آخری دور 36-1932 تک کے افسانوں میں فنکارانہ حسن دیکھنے کو ملتا ہے جو موضوعیت کے باوجود بھی اپنے اندر نکھرا ہوا تخلیقی حسن رکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پریم چند نے اپنے اکثر افسانوں کے کردار اپنے ہی گردوپیش اور اپنے ماحول سے لیتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود بھی ایسے کئی افسانے ہیں جو ہمیں ندرت کا احساس دلاتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے کرداروں کے عمل اور ردعمل کے ذریعہ ان کے جذباتی اور ذہنی رویوں کے ذریعہ غیر معمولی اور مسرت بخش انسانی سچائی، رواداری اور طبقاتی کشمکش کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کے یہاں کئی ایسے کردار نظر آجائیں گے جو مذکورہ حقائق کی تصدیق کرتے ہیں مثلاً کفن کے گھیسو اور مادھو، دیوان کا مسٹر مہتا، استعفی کا فتح چند، دست غیب کا لالہ جیون داس ایسے ہی کردار ہیں جو دیکھنے میں عام لوگوں کی غربت، کمزوری ولاچاری، ضعیف الاعتقادی، کم ہمتی، ندامت اور بزدلی کی نمائندگی کرنے کے باوجود اپنی انفرادیت کا احساس اپنے کردار کے ذریعہ دلاتے ہیں۔ کئی افسانوں میں پریم چن دنے انسانی زندگی کی اصل صورت حال کو اس قدر ہو بہو پیش کیا ہے اور اتنی نادر تصویر کشی کی ہے کہ سارا منظر چل چتر کی طرح ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ پوس کی رات، معصوم بچہ، کفن، نئی بیوی، شطرنج کی بازی، پنچایت، عیدگاہ اور بوڑھی کا کی جیسے افسانوں سے دی جاسکتی ہے۔

عزیز طلبا! آپ کے کورس میں پریم چند کے افسانوں کے تنقیدی مطالعہ کے طور پر تین افسانوں نئی بیوی، نجات اور کفن کا تنقیدی جائزہ شامل ہے۔ آیئے اب ہم ان تینوں افسانوں کا الگ تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ

تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے ان افسانوں کے متن کو ایک سے زیادہ بار پڑھ لیں تا کہ تجزیہ کرتے وقت آپ کو دشواری نہ ہو۔آپ کی آسانی کے لئے ہم ان تینوں افسانوں کے متن کا تھوڑا تھوڑا حصہ ان کے تجزیہ سے پہلے پیش کرتے ہیں۔

9.4 افسانہ 'نئی بیوی'

نئی بیوی پریم چند کا مشہور و معروف افسانہ ہے۔اس افسانہ کے کرداروں کے ذریعہ پریم چند نے انسان کی ظاہری و باطنی خواہشات کا بہت ہی باریکی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔انسانی نفسیات، جبلت اور مختلف عمر کی جنسی خواہشات کا اظہار اس افسانے کا موضوع ہے۔ پانچ حصوں میں منقسم یہ افسانہ اپنے قاری پر بے حد نفسیاتی و جسمانی تأثر چھوڑتا ہے۔تجزیہ سے پہلے بہتر ہے کہ اس کے متن سے کچھ اقتباس آپ پڑھ لیں تا کہ تجزیہ بہتر ڈھنگ سے سمجھ میں آسکے۔

(1) ہمارا جسم پرانا ہے لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑتا رہتا ہے۔اس نئے خون پر زندگی قائم ہے۔دنیا کے قدیم نظام میں یہ نیا پن اس کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک ٹہنی میں، ایک ایک قطرے میں تار میں چھپے ہوئے نغمے کی طرح گونجتا رہتا ہے۔اور یہ سو سال کی بڑھیا آج نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگا مل نے نئی شادی کی ہے ان کی جوانی از سر نو عود کر آئی ہے۔۔۔۔۔۔

چھ مہینے کی عزلت اور نفس کشی کے بعد لالہ ڈنگا مل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کر لی۔آخر غریب کیا کرتے زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی اور اس عمر میں تو رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہوگئی تھی۔لکڑی کی ضرورت جبھی ہوتی ہے جب پاؤں میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں رہتی۔

(2) جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔دکان سے اب انہیں اس قدر انہماک نہیں ہے۔۔۔۔۔

غریب خاندان کی لڑکیوں میں بھی یہی عیب ہوتا ہے ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے۔نہ کھا سکیں، نہ پہن سکیں، نہ دے سکیں۔انہیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں؟''

دریا کی سیر تو ہوئی مگر کچھ لطف نہ آیا۔

(3) کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کر کے لالہ جی نے سمجھا کہ یہ محرم کی پیدائش ہے۔لیکن پھر بھی برابر مشق جاری رکھی۔۔۔۔۔

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جا کر گملوں کو دیکھنے لگی۔آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آ رہی تھی۔اس کے انداز گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی۔لالہ جی کی ساری خفت غائب ہوگئی۔

(4) دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(5) جگل نے آشا کو سر سے پاؤں تک جگمگاتے دیکھ کر کہا۔'بس بہو جی! اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں۔آج میں آپ کو چولہے کے پاس نہ آنے دوں گا''۔

پریم چند کے اس معروف افسانے کا اہم کردار لالہ ڈنگا مل، ان کی پہلی بیوی لیلا وتی، ان کی دوسری بیوی آشا دی اور ان کے پرانے نوکر مہاراج کا نوجوان لڑکا جگل ہیں۔پریم چند نے اس افسانے میں انسانی نفسیات اور نفسانی وجنسی خواہشات کا تجزیہ انوکھے انداز میں کیا ہے۔سیٹھ جی کے پاس دنیا کی سبھی آسائش موجود ہے لیکن روحانی اور جنسی خواہشات کے اطمینان کے لئے پہلی بیوی کے مرنے کے چھ مہینے بعد دوسری شادی کرتے ہیں۔دوسری بیوی آشا دیوی کی عمر نہایت کم ہونے کی وجہ سے ذہنی وجسمانی آسودگی دونوں کو حاصل نہیں ہو پاتی۔سیٹھ جی کی نئی بیوی سارے عیش و عشرت ہوتے ہوئے بھی سیٹھ جی کی طرف نہیں بلکہ اس دیہاتی نوجوان نوکر کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔یہاں پریم چند نے انسان کے جذباتی اور جنسی خواہشات کی بہترین عکاسی کی ہے۔آشا دیوی عمر رسیدہ شوہر سے جنسی آسودگی حاصل کرنے میں ناکام ہو کر مالک اور نوکر کے اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر نوجوان نوکر جو عجیب وغریب اجڑ اور دہقانی اور مسخرہ ہے کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔پریم چند نے اس کہانی میں قاری کو یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ جنسی خواہشات ومحبت دولت اور پیسے سے نہیں خریدی جا سکتی۔حالاں کہ اس افسانے میں پریم چند نے اپنے اخلاقی آدرشوں کے برعکس انسانی خصلتوں اور حقائق کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔کہانی کے کلائمکس پر جو جملے استعمال کئے ہیں وہ انسانی خصائل اور نفسیاتی وجذباتی جبلت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

''یہ سب ماں کا کام ہے' بیوی جس کام کے لئے ہے اسی کے لئے ہے''۔

''آخر بیوی کس کام کے لئے ہے؟''

'' آپ مالک ہیں نہیں تو بتلا ہی دیتا، بیوی کس کام کے لئے ہے''۔

موٹر کی آواز آئی، نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل سر سے کھسک کر کندھے پر آ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔ ''لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم ذرا آ جانا''۔

9.5 افسانہ 'نجات' کا تجزیہ

عزیز طلبا! اس سبق میں زیر مطالعہ پریم چند کا دوسرا افسانہ 'نجات' ہے۔ یہ افسانہ سدگتی کے نام سے ہندی میں بھی شائع ہوا ہے۔ پریم چند کے اکثر و بیشتر افسانے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ افسانہ دیہی زندگی کی اس سماجی حقیقت کی تصویر کشی کرتا ہے جس کے بوجھ تلے دبے ہوئے غریبوں، پسماندہ طبقوں اور نچلی ذاتوں کے خاندان پوری زندگی باہر نہیں نکلتے اور ''نجات'' کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ کہانی کے اہم کرداروں میں دکھی چمار، اس کی بیوی جھریا اور بیٹی دھنیا کے علاوہ پنڈت گھاسی رام اور اس کی بیوی پنڈتائن ہیں۔ پہلے آپ اس افسانے کے چند اقتباس کا مطالعہ کیجئے تاکہ تجزیہ کرنے میں آسانی ہو سکے۔

(1) دکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا اور اس کی بیوی جھریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارن نے کہا۔

''تو جا کر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں''۔

دکھی ''ہاں جاتا ہوں لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟''

جھریا ''کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی۔ ٹھکرانی سے مانگ لانا''۔

(2) پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور اپاسنا میں لگ جاتے، منہ ہاتھ دھوتے، آٹھ بجتے، تب اصلی پوجا شروع ہوتی۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر

آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تکل لگاتے۔

(3) دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں وہ سب بھول گیا۔ پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا۔ دل ڈوبا جاتا تھا۔ پر دل کو سمجھا کر اٹھا۔ پنڈت ہیں۔ کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر ستیہ ناس ہو جائے۔ تب ہی ان کا دنیا میں اتنا مان ہے۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے۔ جسے چاہیں بنا دیں، جسے چاہیں بگاڑ دیں۔

(4) آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا۔ مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہیں آیا اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھاتے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہو، کہیں کوئی دکھا دے۔

رات تو کسی طرح کٹی مگر صبح بھی کوئی چمار نہیں آیا۔ چمارن بھی روپیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔ پنڈت جی نے رسی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھر پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے۔ وہاں سے آ کر فورا نہائے۔ درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔ ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھکتی، خدمت اور اعتماد کا انعام تھا۔

سماجی استحصال پر مبنی اس افسانے میں پریم چند نے دیہی ہندوستان کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے اس افسانے کے ذریعہ سماج میں غیر مساویانہ سلوک اور نچلے طبقوں سے ہتک آمیز برتاؤ کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ اس افسانے سے ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات بالخصوص نام نہاد سب سے اونچا طبقہ کہے جانے والے برہمن اور سب سے نچلے طبقے کی نمائندگی کرنے والے ہریجن کی سماجی حیثیت، جبر و استبداد، استحصال اور ذہنی و نفسیاتی تنگ نظری کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے۔ افسانے میں نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا دکھی چمار اپنے کمسن بچی کی سگائی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے گاؤں کے پروہت، پنڈت گھاسی رام سے درخواست کرنے اور ان کو اپنے گھر آنے دعوت دینے جاتا ہے تاکہ شبھ دن اور شبھ ساعت میں بچی کی شادی ہو۔ خالی ہاتھ جانے کے بجائے وہ گھاس کی گٹھیا لے کر جاتا ہے۔ پنڈت کو دان دکچھنا کے طور پر گھاس کی گٹھیا لے کر جانا دکھی چمار کی ابتر معاشی حالت کی عکاسی کرتا ہے۔ بجائے اس کے دروازے پر آنے کے پنڈت اسے بغیر کھائے پیئے بھوکے پیٹ چار کام بتا دیتا ہے جس میں پنڈت کے گھر کی صفائی، کھلیان سے بھوسا ڈھونا اور سب سے مشکل کام لکڑی کے گانٹھ کو چیرنا شامل ہے۔ دکھی چمار پورے دن بغیر کچھ کھائے

پیئے اس امید پر کام میں جٹا رہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی سگائی کی مہورت وساعت اچھی نکلے گی اور پنڈت جی اسے آشرواد دیں گے۔ بھوکے پیٹ لکڑی چیرتے چیرتے شام ہوجاتی ہے اور آخر دم دکھی چمار غش کھا کر گر جاتا ہے۔ وہیں اس کی موت ہوجاتی ہے۔ اب مسئلہ ہے کہ پنڈت کے دروازے پر چمار کی موت اور اس کی لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ پنڈتائن چماروں کی ٹولی سے آدمی بلانے کا مشورہ دیتی ہے لیکن گونڈ اس بات پر سب کو راضی کر لیتا ہے کہ یہ پولیس کیس ہے اور بھوکے پیاسے بیگاری کرتے ہوئے دکھی کی موت ہوئی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی اس کی لاش اٹھانے نہ جائے۔ لاش کے پاس عورتیں تو آتی ہیں لیکن کوئی مرد نہیں آتا۔ دن گزرنے کے بعد رات اور صبح تلک لاش سے بدبو آنے لگتی ہے اور آخر کار پنڈت گھاسی رام رسی کا پھندا بنا کر دکھی چمار کی لاش میں پاؤں میں باندھ کر لاش کو گھسیٹ کر جنگل میں چھوڑ آتا ہے۔ اس افسانے کا آخری پیراگراف آزادی سے قبل ہندوستان کی معاشی، سماجی اور مذہبی حالت کے ساتھ ساتھ بداعتقادی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

9.6 افسانہ 'کفن' کا تجزیہ

عزیز طلبا! پچھلے صفحات میں آپ نے پریم چند کے دو معروف افسانے 'نئی بیوی' اور 'نجات' کا مطالعہ کیا۔ آیئے اب آپ کے نصاب میں شامل پریم چند کے تیسرے افسانے 'کفن' پر اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ عزیز طلبا! جس طرح ناول میں گئودان پریم چند کا شاہکار ہے اسی طرح افسانوں میں کفن۔ کفن نہ صرف پریم چند کی شاہکار ہے بلکہ خود پریم چند کی دوسری کہانیاں اور افسانے اس کے ہم پلہ نہیں رکھے جاسکتے ہیں اور نہ تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ایسا کوئی افسانہ نگار نظر نہیں آتا جس کا کوئی افسانہ کفن کی فنی اونچائیوں کو چھو سکے۔ دراصل کفن اس وقت کے ہندوستان کے سماجی، معاشی اور مذہبی نابرابری اور فسطائی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے بالعموم دیہی ہندوستان میں اور بالخصوص مشرقی اتر پردیش میں۔ آیئے اب ہم افسانہ کفن کے چند اقتباس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(1) جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا درد زہ سے پچھاڑے کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی

تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔
گھیسو نے کہا ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا، جا دیکھ تو آ''

(2) گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا'' جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اسی چڑیل کا پھنساؤ ہوگا اور کیا، یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ مجھے وہاں ڈر لگتا ہے''۔

''ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی''

''تو تم ہی جا کر دیکھو نا''۔

(3) آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے۔ جیسے دو بڑے اژدہے کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ اور سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

(4) گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو؟''

مادھو بولا ''ہاں لکڑی تو بہت ہے، اب کچھن چاہئے''۔

'' تا کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں''

''ہاں اور کیا لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے''۔

کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہئے''۔

''کپھن لاس کے ساتھ جل تو جاتا ہے''۔

''اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپیہ ملتے تو دوا دارو کرتے''۔

عزیز طلبا! آپ نے افسانہ کفن کا اقتباس پڑھا۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ پورا افسانہ پڑھیں اور پھر اس کا تجزیہ کریں۔ کفن ایک تمثیل ہے اور یہ کہانی بدھیا کے موت کے ارد گرد گھومتی ہے جو مادھو کی بیوی اور گھیسو کی بہو ہے۔ یہ افسانہ ہماری سماجی زندگی اور گاؤں کی معیشت کا وہ دردناک پہلو ہے جو اکثر ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اونچی ذات اور دولت مند طبقے کے لوگوں نے نچلے طبقے کے انسانوں کا جس طرح استحصال کیا ہے اور اس کی روح تک کو نچوڑ دیا کہ اس میں عام انسانی حس تک بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے اور یہی مادھو اور گھیسو کے کردار کے ذریعہ پریم چند نے قاری کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہانی ایک دردناک طنزیہ کی تصویر کشی ہے اور طنزیہ انداز میں شروع ہوتی ہے۔ جب جھونپڑے کے اندر جوان بہو بدھیا درد زہ سے پچھاڑے کھا رہی ہے اور جھونپڑے کے باہر بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے باپ بیٹے خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک دوسرے کو اندر جا کر دیکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور کوئی نہیں جاتا۔ اس کی وجہ ان کے پیٹ کی وہ آگ ہے جو الاؤ کی آگ میں بھنے ہوئے آلو سے بجھانا چاہتے ہیں اور یہ ڈر ہے کہ اگر ایک گیا تو دوسرا زیادہ کھا لے گا۔ پریم چند کا افسانہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ تصویر و تصور پیش کرنے کے لئے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ پریم چند نے دونوں باپ بیٹوں کے کردار کی تصویر کشی اس طرح پیش کی ہے کہ سارا منظر اور پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ پریم چند کے لفظوں میں ''چماروں کا یہ کنبہ سارے گاؤں میں بدنام تھا۔ دونوں کام چور تھے۔ اس لئے انہیں کہیں مزدوری نہیں ملتی تھی جب تک ایک دو فاقے نہ ہو جائے وہ کام یا چوری کے لئے گھر سے نہ نکلتے''۔ مادھو کے کارنامے کو پیش کرتے ہوئے پریم چند نے لکھا ہے ''مادھو سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ کیوں کہ وہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو پھر گھنٹہ بھر چلم پیتا''۔

آخر کار دونوں بدھیا کو اندر جا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور آلو کھا کر وہیں الاؤ کے پاس ہی لیٹ جاتے ہیں۔ ادھر بدھیا پچھاڑے کھاتے کھاتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار بدھیا اور اس کی موت ہے اور اس بے بس و نادار عورت کی موت کا المیہ پوری کہانی پر چھا جاتا ہے۔ پریم چند نے بدھیا کی موت کی زیادہ تفصیل نہ بیان کرتے ہوئے صرف چند جملے اس طرح بیان کئے کہ وہ روح فرسا مناظر قاری کے سامنے آپ سے آپ آجاتے ہیں۔ ''صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا''۔

پریم چند نے اس کہانی میں کرداروں کی بے حسی اور بے حیائی کو جس انداز سے کھول کر پیش کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی گر جائے حیوان کی سطح پر زندہ رہنے کے لئے بھی ریا کاری کے بغیر گزارا نہیں۔ بدھیا جب مر رہی ہوتی ہے تو دوا دارو کی بات تو الگ باپ بیٹے میں سے کسی نے بھی اندر جا کر دلاسا دینے یا ہمدردی کے دو لفظ کہنے کی ہمت گوارا نہیں کرتا۔ کفن دفن کے لئے مانگے ہوئے پیسوں سے خوب پیتے ہیں اور کھاتے ہیں اتنا کہ شکم سیر ہو جاتے ہیں اور بچی ہوئی پوڑیوں کا پتل اٹھا کر بھکاری کو دیتے ہوئے کہتے ہیں

''لے جا، خوب کھا اور آسرواد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی۔ روئیں روئیں سے آسرواد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔ بے کنٹھ میں جائے گی دادا۔ بے کنٹھ کی رانی بنے گی۔ یہ کہتے ہوئے مادھو رونے لگتا ہے اور اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ باپ گھیسو سمجھاتا ہے''

کیوں روتا ہے بیٹا؟ کھس ہو۔ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے''۔

کہانی اپنی صورت حال اور کرداروں کے اعمال و مکالموں سے قاری کو شدید درد اور صدمے کی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے۔ پوری کہانی کی فضا طنزیہ ہے۔ پریم چند نے سماجی زندگی کے ایک سنگین سچائی سے پردہ اٹھایا ہے اور نام نہاد شرافت، انسانیت اور انسانی حقوق کے منہ پر زبردست طمانچہ لگایا ہے۔

9.7 خلاصہ

عزیز طلبا! آپ نے پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے تین معروف افسانے 'نئی بیوی' 'نجات' اور 'کفن' کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اس سبق میں آپ نے پریم چند کے افسانوں کی خصوصیات پر غور کیا ہے اور آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ پریم چند نے افسانوں میں سماجی و اخلاقی سدھار کے ساتھ ساتھ اس وقت کے دیہی مسائل کی طرف خصوصی دھیان دیا ہے۔ پریم چند نے سماجی برائیوں، زمیندارانہ نظام کی خرابیوں، انسانی بداعمالیوں کے نتائج اور نفسیاتی محرومیوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانے میں ہمیشہ کوئی

نہ کوئی واضح، معین اور ٹھوس اخلاقی یا سماجی نظریے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے مطابق 'ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا' کے ذریعہ انسانی اور چلتے پھرتے کرداروں کے عمل اور ردعمل، ان کے جذباتی اور ذہنی رویوں، انسانی رواداری، انسانی حقوق اور سچائی میں حسن کی تلاش کرنی چاہئے۔ان کے مختلف کرداروں گھیسو، مادھو، مسٹر مہتا، فتح چند، لالہ جیون داس، دکھیا اور بوڑھی کا کی اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پریم چند کو انسانی جذبات، احساسات اور نفسیات کے بیان پر قدرت حاصل ہے۔لہذا ڈنگامل کی پہلی بیوی لیلا وتی اور دوسری بیوی آشا دیوی کے بیان پریم چند کے نفسیاتی مشاہدہ کے عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند نے دیہی زندگی، بالخصوص مشرقی اتر پردیش کے گاؤں کی زندگی کی بہتر طور پر اور بہت خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ یہ عکاسی ان کے افسانے نجات اور کفن میں اپنے کمال درجے کو پہنچتا ہے جب وہ دکھی چمار کا نجات میں اور مادھو اور گھیسو کا کفن میں ان کے جذبات اور محرومیوں کی بہترین عکاسی کے ساتھ ساتھ سماج کے اس روح فرسا نظام کی طرف قاری کا دھیان کھینچتے ہیں۔کل ملا کر پریم چند کی افسانہ نگاری کا جواب نہ تو ان کے ہم عصروں میں کوئی دے سکا اور نہ کوئی ان کے انتقال کے بعد۔اب تک کوئی افسانہ نگار ایسا پیدا نہ ہوا جس کے افسانوں نے فنی لحاظ سے پریم چند کے افسانوں کو پیچھے چھوڑا ہو یا کم سے کم برابری ہی کیا ہو۔

9.8 فرہنگ

سامراج	شہنشاہی نظام حکومت	استبداد	ظلم و جور سے حکومت کرنا
مراجعت واپسی،	لوٹنا	عواقب	نتائج

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

1۔ پریم چند کے افسانوں کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ پریم چند کے اکثر افسانے ہمیں کن مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔مثال پیش کیجئے۔

3۔ افسانہ 'نئی بیوی' کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

4۔ افسانہ 'نجات' پر مختصر نوٹ لکھئے۔

5۔ افسانہ 'کفن' کا اجمالی جائزہ لیجئے۔

9.10 سفارش کردہ کتابیں

1۔ سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

2۔ نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو

3۔ ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

4۔ مرتب دیانرائن نگم، 'زمانہ' پریم چند نمبر

5۔ مرتب پروفیسر گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل

پریم چند سے قبل اردو ڈرامہ

سبق کی ساخت

۱۔۱ تمہید

۱۔۲ مقاصد

۱۔۳ پریم چند کے سوانحی کوائف

۱۔۴ ڈرامے کا فن

۱۔۵ پریم چند سے قبل اردو ڈرامہ

۱۔۶ خلاصہ

۱۔۷ فرہنگ

۱۔۸ نمونہ امتحانی سوالات

۱۔۹ سفارش کردہ کتب

تمہید

پریم چند اردو ادب کی دنیا میں ایک بہت معتبر نام ہے۔ جنہوں نے ادب کو اپنی تخلیقات کے ذریعے پروان چڑھایا ہے۔ انہوں نے ادب میں افسانہ اور ناول کو اپنا محور و مرکز بنایا مگر افسانے کے علاوہ ڈرامے کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ پریم چند کی پہچان ادبی دنیا میں افسانوی حیثیت سے ہے مگر ڈرامائی ادب میں بھی ان کا حصہ ہے۔ پریم چند جب ڈرامے میں طبع آزمائی کر رہے تھے تو ان سے قبل اردو ڈرامے کا دامن کافی لبریز ہو چکا تھا۔ ان سے قبل اردو ڈرامہ نگاروں میں نواب واجد علی شاہ، امانت لکھنوی، منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی، احسن لکھنوی، نرائن پرشاد بیتاب، محمد علی مراد لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، نواب محمد سید آزاد، امتیاز علی تاج وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جن کے ڈراموں کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی نیز وہ اسٹیج پر بھی کھیلے گئے۔ اس اکائی میں ہم پریم چند سے قبل اردو

ڈرامے کی تاریخ اور اس کے معیار کا جائزہ لیں گے۔

مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ
پریم چند کی حالات زندگی سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
فن ڈرامہ نگاری سے آشنائی ہوگی۔
ڈرامے کے اجزائے ترکیبی کو جان پائیں گے۔
اردو ڈرامہ کے آغاز وارتقا سے واقف ہو جائیں گے۔
ڈرامہ کے اقسام سے آشنا ہو جائیں گے۔

پریم چند کی سوانحی کوائف

پریم چند ۳۱/جولائی ۱۹۸۰ء کو بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور چچا انہیں نواب رائے کے نام سے پکارتے تھے۔ والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ گھر والوں نے بچپن میں اردو اور فارسی پڑھنے کے لیے ایک مولوی صاحب کے پاس مدرسے میں بھیج دیا۔ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ جب پریم چند کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو ان کی والدہ آنندی دیوی پانچ، چھ مہینے بیمار رہ کر انتقال کر گئیں۔ والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے پریم چند پر دھیان نہیں دیا اور گھر کا سارا نظام بدل دیا۔ پریم چند کی تعلیم وتربیت میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے والد کا تبادلہ جب گورکھپور ہو گیا تو پریم چند بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب وہ نویں جماعت میں تھے تو ضلع بستی کے ایک زمیندار گھرانے سے ان کی شادی کر دی گئی اور ایک سال بعد ۱۸۹۷ء میں ان کے والد انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد پریم چند کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ گھر کی ساری ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آ گئیں۔ مالی پریشانیوں کے باوجود انھوں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور ۱۸۹۸ء میں دسویں کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ پریم چند آگے بھی پڑھائی جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن گھر کی معاشی حالت اور ذمہ داریاں راستہ روکے کھڑی ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۹ء میں خوش قسمتی سے انہیں بہرائچ

کے ایک پرائمری اسکول میں معلّمی کا منصب مل گیا۔ ۱۸؍روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس نوکری سے انہیں بہت سہارا ملا کچھ عرصے بعد ان کا تبادلہ پرتاپ گڑھ ہو گیا۔ یہاں سے ٹریننگ کے لیے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ جولائی ۱۹۰۲ء سے اپریل ۱۹۰۴ء تک وہ ٹریننگ کالج میں رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور بنارس کے ہفتہ وار اخبار ''آوازِ خلق'' میں قسط وار اپنا پہلا ناول ''اسرار معابد'' لکھا۔ اس کی پہلی قسط اکتوبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوئی۔ یہ ان کا پہلا ادھورا ناول ہے جو منشی دھنپت رائے عرف نواب رائے کے نام سے لکھا تھا۔ کچھ عرصہ الہ آباد میں رہنے کے بعد پریم چند کا تبادلہ کانپور کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں کانپور سے ایک رسالہ نکلتا تھا جس کا نام ''زمانہ'' تھا۔ جس کے ایڈیٹر 'دیانرائن نگم' تھے۔ جو پریم چند کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ کانپور آنے کے بعد یہ دوستی اور مضبوط ہو گئی اور ان کے کہنے پر پریم چند نے پابندی کے ساتھ اس رسالے میں مضامین اور افسانے لکھنا شروع کیا۔ پریم چند نے وطن سے محبت کے جذبے میں کئی کہانیاں لکھیں اور ان کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۰۸ء میں سوز وطن کے نام سے شائع کرایا۔ جب انگریزی حکومت کو معلوم ہوا تو حکومت نے پریم چند سے کہا کہ ان کہانیوں سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ پھر اس لیے حکومت نے اس کتاب کو ضبط کر لیا۔ یہ مجموعہ نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا انگریز اس بات کو جان گئے تھے کہ دھنپت رائے ہی نواب رائے ہے اس لئے حکومت نے دونوں ناموں پر پابندی لگا دی۔ ان کے دوست 'دیانارائن نگم' نے مشورہ دیا کہ وہ پریم چند کے نام سے لکھا کریں اور اس کے بعد دھنپت رائے، پریم چند ہو گئے۔ اور ادب میں اسی نام سے مشہور اور مقبول ہوئے۔

پریم چند نے جنگ آزادی میں حصہ لینے کی غرض سے ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت وہ ادبی دنیا میں خاصے مقبول ہو چکے تھے۔ اس وقت تک ان کے کئی ناول اور افسانے منظر عام پر آ چکے تھے۔ لکھنو میں انجمن ترقی پسند تحریک کی صدارت ۱۹۳۶ء میں کی۔ اسی سال ۵۶؍سال کی زندگی گزار کر اس دنیا فانی سے چلے گئے۔ انھوں نے اردو ادب کو کئی ناول اور بہت سے افسانے دئے جس کی وجہ سے وہ اردو ادب میں ہمیشہ ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ جہاں انہوں نے گودان، میدان عمل، اسرار معابد، گوشہ عافیت جیسے شاہکار ناول لکھے تو وہیں کہانیوں پریم پچیسی، پریم بتیسی، سوز وطن اور واردات جیسے مجموعے موجود ہیں۔ ان اصناف کے علاوہ انہوں نے فن ڈرامہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور تین ڈرامے تخلیق کئے۔ کربلا، شب تار، روحانی شادی۔

ڈرامے کا فن

نقل کرنے کا مادہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ہم اپنے مطابق دیکھ کر لوگوں کی نقل کرتے ہیں بچپن سے ہی یہ انسانی فطرت میں بسی ہوتی ہے۔اسی لیے بچے بچپن میں کھیلتے ہوئے کبھی پولیس، کبھی چور، کبھی سبزی والا، تو کبھی ماسٹر، کبھی بادشاہ، کبھی وزیر بنتے ہیں اور کبھی اپنے گڈے گڑیوں کے ماں باپ۔یہی نقل کرنے کے فن کو کمال ہنرمندی کے ساتھ بیان کرنے کا نام ڈرامہ ہے۔

ڈرامہ لفظ کا معنی کھیل یا واقعہ کے ہوتے ہیں یا ایسا قصہ جو اسٹیج پر اداکاری کے لیے کھیلا جائے۔ڈرامہ لفظ DRAO سے ماخوذ ہے۔جس کا ماخذ یونانی زبان ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں کرنا یا کر کے دکھانا۔

ارسطو نے اپنی کتاب ''بوطیقا'' کی تشکیل منظوم ڈرامے کی روایت کے پس منظر میں کی تھی اس لیے اس کا آغاز بھی یونان سے ہوا ہے۔ ہندوستان میں ڈرامے کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہندوستان کے ڈرامے کے فن پر پہلی کتاب' بھرت منی' کی ''ناٹیہ شاستر'' ہے اور اسی طرح دنیا کے شاہکار ڈراموں میں' کالی داس' کے ڈرامے ''شکنتلا'' کا شمار ہوتا ہے۔ہمارے ادب میں کسی بھی کہانی کو دوسروں تک پہنچانے کے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ڈرامہ بھی کہانی بیان کرنے کی ایک شکل ہے۔کہانی کو بیان کرنے والی دوسری اصناف اور ڈرامہ میں یہ فرق ہے کہ ڈرامہ اسٹیج کرنے کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے اور اس کا اظہار کرتے ہوئے امتیاز علی تاج نے کہا ہے کہ

''جو کہانی اس خیال سے تیار کی جاتی ہے کہ ایکٹروں کی امداد سے اسٹیج پر
بطور واقعہ لوگوں کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے وہ ڈرامہ کہلاتی ہے''

معلوم ہوا کہ ڈرامہ نہ صرف مکالمہ میں لکھی جانے والی تحریر ہے اور نہ صرف کردار و واقعات کا مجموعہ ہے جب تک اسے پیش نہ کر دیا جائے وہ مکمل نہیں ہوتا۔ڈرامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں تحریر کے ساتھ ساتھ انسانی حرکات وسکنات کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔ڈرامہ کا ڈھانچہ کسی اسکرپٹ سے تیار کیا جاتا ہے لیکن اس کے ڈھانچے کی زیبائش کا کام اداکاروں کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی

ارسطو نے ڈرامہ کے چھ(٦) اجزائے ترکیبی بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں

پلاٹ

کردار

مکالمہ

زبان

موسیقی

آرائش

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں سب سے پہلا جز پلاٹ ہوتا ہے جس سے اداکاروں کے کرداروں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ مختلف واقعات، انسانی فطرت سے اخذ کیا جاتا ہے۔اس کا پلاٹ نہ تو ناول کی طرح بہت طویل ہوتا ہے اور نہ ہی افسانے کی طرح مختصر۔اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اسٹیج کرتے وقت وہ طے شدہ وقت پر پورا ہو جائے۔

ڈرامے میں عام طور پر پلاٹ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک اکہرے اور سادہ دوسرے تہہ دار۔سادہ پلاٹ کے ڈراموں میں کسی ایک شخص سے متعلق مختلف واقعات کو پیش کیے جاتے ہیں۔وہ سب آپس میں ملے ہوتے ہیں جن کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوتی۔اور تہہ دار پلاٹ سے مراد یہ ہے کہ اگر انسان کسی شخص سے متعلق بات کرے تو ضروری نہیں ان کا آپس میں ربط ہو۔ایسے پلاٹ میں اداکاروں کی مدد سے دوسرے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی شامل ہو جاتے ہیں جس سے تماشائی ڈرامہ دیکھتے وقت الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کردار نگاری

کردار نگاری ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے جس کو ڈرامہ نگار اس کی صلاحیتوں کے لحاظ سے ڈرامے میں پروتا ہے۔اس مرحلے میں ڈرامہ نگار کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے مثلاً کردار حقیقی ہوں نہ کہ مثالی کردار اور اپنے اعمال و گفتار اور لباس سے اس طبقے کا معلوم ہو جس کی وہ اداکاری کر رہا ہے۔کردار نگاری ڈرامے میں شروع سے آخر تک عوام کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ڈرامے میں کردار نگاری کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔اس میں مرکزی کردار ہیرو یا ہیروئن ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ کچھ ضمنی کردار بھی ہوتے ہیں جو ڈرامے کو پیش کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

ڈرامہ میں سارا دارومدار کردار پر ہی ہوتا ہے۔ ڈرامے میں کردار صرف ظاہری ڈھانچے نہیں بناتا بلکہ نفسیات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ کردار نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ڈرامہ نویس، کرداروں کے ذریعے ان کی زبان سے ایسی گفتگو ادا کرائے جو فطری معلوم ہو۔ کردار جس معاشرہ یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو زبان بھی اسکے مطابق ہونی چاہئے۔

مکالمہ

مکالمہ بھی ڈرامے کا اہم جز ہوتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے باتیں کرنا۔ اس کے ذریعے کردار سامعین یا دوسرے کرداروں سے مخاطب ہوتا ہے۔ فطری مکالمے اچھے ڈرامے کی پہچان ہوتے ہیں۔

زبان

زبان کا تعلق ڈرامے کی موضوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ تمام کردار اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے باتیں کرتے ہیں۔ ڈرامے میں تعلیم، تہذیب وثقافت اور ماحول کے ساتھ دوسرے کرداروں کی مناسبت سے زبان کا تعین کیا جاتا ہے۔ ڈرامے کی زبان آسان اور سیدھی ہونی چاہیے جس سے کہ ہر فرد کی رسائی اس تک ہو جائے۔

موسیقی

ارسطو نے موسیقی کو ڈرامے کے لیے پانچواں درجہ دیا ہے۔ جس کا سیدھا اثر سامعین پر ہوتا ہے موسیقی کے ذریعے ماحول حالات اور کرداروں کی ذہنیت کو اجاگر کرنے میں مدد ملتی ہے اس کے علاوہ کسی کو آگاہ اور خبردار بھی کیا جا سکتا ہے۔

آرائش

ارسطو نے ڈرامے میں ارائش کو چھٹا اور آخری جز قرار دیا ہے۔ بہت سی باتوں کو آرائش اور لباس کے ذریعے ہی پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ارسطو نے آرائش کو اہم جز قرار نہیں دیا۔ اس کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی دوسرے اجزاء کو دی ہے اس کا خیال تھا کہ آرائش کا تعلق شاعر سے زیادہ کاریگر سے ہے۔ ڈرامہ اسٹیج کرنے میں کاریگر کا اہم رول ہوتا ہے۔

ڈرامہ کے اقسام

عام طور پر ڈرامے دو قسم کے ہوتے ہیں

۱/ ٹریجڈی یعنی المیہ ڈرامے

۲/ کامیڈی یعنی طربیہ ڈرامے

ٹریجڈی یعنی المیہ ایسے ڈرامے ہیں جن کا انجام حزن وملال، غم انگیز اور المناک ہو جس سے تماشائیوں میں رنج اور ہمدردی پیدا ہو۔ المیہ کہلاتے ہیں\ کامیڈی یعنی طربیہ ایسے ڈرامے ہوتے ہیں جو خوشی اور مسرت پر ختم ہوتے ہیں اس قسم کے ڈراموں میں عوام تفریح کرتی ہے۔

پریم چند سے قبل اردو ڈرامہ

ہندوستان میں ڈرامہ کی روایت بہت قدیم اور مستحکم ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش یہاں کے رسم ورواج اور دیوی دیوتاؤں کے سامنے ناچنے گانے بالخصوص ''برہما'' اور طرح طرح کے سوانگ بھر کر رقص کرنا ساتھ ہی مختلف قسم کے رسم ورواج کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرنا یہاں کا شیوہ رہا ہے، اس میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہی افعال وحرکات نے ڈرامہ کی صورت اختیار کر لی۔

بحیثیت فن، ڈرامہ کو راجہ وکرم آدتیہ کے زمانے میں خصوصی ترقی ملی۔ اس کے دربار کے شاعر 'کالی داس' نے کئی ڈرامے لکھے جن میں ''شکنتلا'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کے لیے اس زمانے میں لاکھوں روپے خرچ کیے گئے جس کو دنیا بھر میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس کی مقبولیت کی یہ مثال ہے کہ اس کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ مشہور مفکر گوئٹے کا کہنا ہے کہ ''شکنتلا'' دنیائے ادب کی ایک عظیم تخلیق ہے۔ فرخ سیر کے درباری شاعر 'نواز' نے ۱۷۱۶ عیسوی میں اس کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا جو ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر 'کاظم علی جوان' نے آسان اردو میں کیا تھا۔ اسی طرح 'کالی داس' کے بعد اس فن کو 'ہرش دیو' اور 'بھبھوتی' نے فروغ دیا۔ ہرش دیو کے ناٹکوں میں ''رتناولی'' اور بھبھوتی کے ناٹکوں میں ''اتر رام چرتر'' اور ''مائی مادھو'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستان کی ادبی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم سے ہی اس فن کو فروغ دینے کے لیے بہت کوششیں

ہوئیں اس فن کا اوجِ کمال ''ناٹیہ شاستر'' کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ڈرامے کے اصول وضوابط پر جو کتابیں ہمیں نظر آتی ہیں وہ 'ارسطو' کی ''بوطیقا'' ہے اور 'بھرت منی' کی ''ناٹیہ شاستر'' ہے۔

,قدیم زمانے میں راجاؤں مہاراجوں، وزراء ،امراءاور برہمنوں کوتفریح طبع کے لیے کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو اس دور کے ادیبوں نے ڈراموں کوان کے لیے تفنن طبع کا ذریعہ بنایا۔اسی لیے اس زمانے کے ڈراموں کا اختتام زیادہ طور پر طربیہ ہوتا تھا۔ پرتگالیوں کی تجارتی مقصد کے لیے ۱۴۹۸ء میں جب ہندوستان میں آمد ہوئی تو انہوں نے اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بھی تبلیغ شروع کردی اورانہوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی غرض سے ہندوستان کی رائج الوقت زبان میں ڈرامے لکھوائے۔جس کی ترقی یافتہ شکل پارسی تھیٹر کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

ڈرامے کے سلسلے میں اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ ڈرامہ آفرینش انسان کے ساتھ معرض وجود میں آیا کیونکہ انسان اپنی خوشی اورغم کا اظہار شروع سے ہی مختلف طریقوں سے کرتا آیا ہے۔مختلف رسم ورواج کے تحت دیوی دیوتاؤں کے طرح طرح کے رقص کرنا اور مختلف طریقوں سے اظہار عقیدت کرنا اس کا شیوہ رہا ہے۔ یہی طریقہ اظہار ترقی کرتے ہوئے ڈرامے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے پرانے زمانے کی طرح آج بھی مختلف جگہوں پر سالانہ جلسے ہوتے ہیں جس میں گانے بجانے اور رقص وسرور کی محفلیں ہوتی ہیں جو قدیم ڈرامے کی روایت کے طور پر موجود ہیں۔

رفتہ رفتہ ان محفلوں نے ترقی کی اور نوٹنکیوں کا زمانہ شروع ہوا۔خطہ اودھ میں بہت سی نوٹنکیاں تھیں جو گاؤں گاؤں اور شہروں شہروں گھوم کر عوام الناس کوتفریح کا سامان مہیا کراتی تھیں۔اسی دور میں بھانڈوں، نقالوں، کٹھ پتلی اور رام لیلا جیسی دوسری چیزیں عوام کے درمیان آگئیں۔رام لیلا اور راس لیلا چونکہ ان دونوں کا تعلق مذہب سے تھا اس لیے عوام میں ان کو خاصی قدر ومنزلت کے ساتھ دیکھا گیا۔

جس طرح کہا گیا کہ راجہ مہاراجہ وغیرہ کی تفریح طبع کے لیے ڈراموں کو تیار کیا گیا اسی طرح لکھنو کے نوابین کو بھی مشغلہ تفنن چاہیے تھا۔اسی لیے نواب واجد علی شاہ کو بھی رقص وسرود اور ناچ ونوٹنکی سے کافی لگاؤ تھا اور یہ دلچسپی ان میں وراثت کے طور پر منتقل ہوئی تھی۔ واجد علی شاہ چونکہ حسن پرست اور رقص وموسیقی کا دیوانہ تھا اس لیے وہ راس لیلا اور کرشن لیلا کی جانب مبذول ہوا۔وہ ''راس لیلا'' اور ''کرشن لیلا'' کے کھیل کو بہت پسند کرتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ

وہ خود بھی حسن پرست تھا اور ''رہس'' میں کرشن اور گوپیوں کی داستان محبت تھی۔ نواب واجد علی شاہ نے ۱۸۴۱/۴۲ء میں ''رادھا کنہیا'' قصہ ''رہس'' کے لگاؤ کے سبب ہی لکھا تھا اور پھر اس کو اس سٹیج بھی کیا گیا جس میں خود واجد علی شاہ نے 'کنہیا' کا کردار ادا کیا تھا۔ انگریزی حکومت نے جب نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ کے ایک غیر آباد قلعے ''مٹیا برج'' میں ۱۸۵۶ء کو بھیجا اور جب واجد علی شاہ نے اس علاقے کو دیکھا تو وہ ایک غیر آباد اور ویران جنگل تھا پھر انہوں نے اسے لکھنوی طرز پر آباد کرنے کی بنا ڈالی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سنسان علاقہ بھی لکھنو کی طرح جگمگانے لگا اور اس وقت واجد علی شاہ نے ''مٹیا برج'' میں بھی ''رہس'' شروع کیا اور ۱۳/سال کی قلیل وقفے میں ۲۳/بار وہاں پر رہس سے کھیلا گیا۔

سید آغا حسن امانت لکھنوی وہ نام ہے جس نے واجد علی شاہ کے بعد اردو ڈرامہ کی ترویج کی۔ ان کا شاہکار ''اندر سبھا'' کے روپ میں آج ہمیں نظر آتا ہے۔ واجد علی شاہ اور امانت کے درمیان فرق یہ تھا کہ واجد علی شاہ کے ذریعے کھیلے گئے ڈرامے صرف ایک مخصوص طبقے کے ساتھ خاص تھے جبکہ امانت نے اپنے ''ڈرامے اندر سبھا'' کو پہلی بار عوام کے سامنے پیش کیا تو اس کو بہت قبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ بازاروں گھروں اور گلیوں میں ''اندر سبھا'' کی گونج سنائی دینے لگی۔ امانت لکھنوی کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے اندر سبھا آسان منظوم اردو زبان میں لکھا تھا اسی لیے اس کو اردو کا باضابطہ پہلا ڈرامہ قرار دیا گیا۔

''اندر سبھا'' کو جب پہلی بار اسٹیج کیا گیا وہ سن ۱۸۵۴ء ہے۔ جب کہ اس کو اس سے دو سال قبل ۱۸۵۲ء میں لکھا جا چکا تھا۔ ''اندر سبھا'' میں مختلف جگہوں سے مختلف کرداروں کو لے کر ایک کہانی ترتیب دی گئی ہے۔ کردار کے طور پر دیو، پری، گلفام کے علاوہ 'راجہ اندر' کی حسن پرست طبیعت کے ذریعے اس عہد کے رسم و رواج اور پورے معاشرے کو نمایاں کیا گیا ہے۔ امانت لکھنوی کی ''اندر سبھا'' کی قبولیت کو دیکھ کر اس کے بعد بہت سی سبھائیں لکھیں اور پیش کی گئیں لیکن جو قبولیت عام ''اندر سبھا'' کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔ اس بات سے کسی کو مفر نہیں کہ اردو ڈرامے کی ابتدا اودھ یعنی لکھنو میں ہوئی پھر ''اندر سبھا'' کے دور کے لکھنو بعد ڈراموں کا زوال شروع ہو گیا۔

جب لکھنو میں ڈرامہ زوال پذیر ہو رہا تھا تو اسی وقت بنگال نے اس فن کی آبیاری کا ذمہ اٹھایا اور امانت کے ''اندر سبھا'' کو ڈھاکہ میں اسٹیج کیا گیا۔ رفتہ رفتہ وہاں بھی طبع زاد ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے جانے لگے اور فن

ڈرامہ کی سرپرستی نوابین ڈھاکہ نے کی۔ایک صاحب ذوق 'شیخ فیض بخش' نے نوابین کی سرپرستی میں ہی اردو اسٹیج کے آغاز کا ارادہ کیا۔ان کی ان کوششوں کا ثمرہ 'فرحت افزا تھیٹریکل کمپنی' کے روپ میں معرض وجود میں آیا۔ یہ ایک تجارتی کمپنی کی شکل میں تھی۔اسی زمانے میں امام بخش کانپوری نے ''اندرسبھا'' کی طرز پر ایک ڈرامہ ''ناگرسبھا'' کے نام سے لکھا۔جس کو شیخ فیض کی تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج کیا۔چین و بنگال چونکہ جادوٹونے کے لیے مشہور ہے اسی لیے اس ڈرامے کی کہانی کا تانا بانا اس طرح بنا گیا تھا کہ وہ جادوٹونے بھی دکھائے گئے تھے۔بنگال،خصوصاً ڈھاکہ میں اردو ڈرامے کی ایک خاص روایت ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے جس کا اثر بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک باقی نظر آتا ہے

پارسی تھیٹر

لکھنو میں جب واجد علی شاہ کے ''رہس'' اور امانت کی ''اندرسبھا'' کے چرچے ہو رہے تھے،اسی زمانے میں بمبئی میں پارسی تھیٹر اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔پارسی اور مراٹھی اہل ثروت نے اس فن میں خاصی دلچسپی دکھائی اور ڈرامیٹک کور بنائے۔اس میں خاص کر مراٹھی اور گجراتی ڈرامے کھیلے جاتے تھے انہی ڈرامیٹک کور میں سے ایک 'ہندو ڈرامیٹک کور' تھا۔اردو ڈرامے کی پیشکش کا خیال پہلی بار اسی ڈرامے کے اراکین کی ذہن کی اپج تھی۔ اس لیے اردو ڈرامہ ''راجہ گوپی چندر اور جلندھر'' ہندو ڈرامیٹک کور نے ۱۸۵۳ء میں پیش کیا جو 'ڈاکٹر بھاد واجی لاڈ' کا لکھا ہوا تھا مغربی طرز پر اردو ڈرامے کی اس پیشکش نے خاصی شہرت حاصل کی۔

انگریزی کلچر میں ڈرامہ کو خاصی اہمیت حاصل ہے اور ہندوستان کے نظام میں انگریزوں کا خاصہ عمل دخل رہا ہے۔اس کا اثر پارسی تھیٹر پر بھی پڑا بلکہ انگریزوں نے اہل ثروت پارسیوں کے ساتھ مل کر گرانٹ روڈ بمبئی میں ۱۸۴۵ء میں ایک ہال بنام ''بمبئی تھیٹر'' بنایا،عرصہ دراز تک اس ''بمبئی تھیٹر'' میں صرف انگلش ڈرامے ہی اسٹیج کیے جاتے تھے یا یوں کہہ لیجیے جب تک اس ہال میں انگریزوں کا عمل دخل رہا تب تک اس میں انگریزی ڈراموں کے علاوہ کوئی ڈرامہ نہیں کھیلا گیا لیکن جب پارسیوں نے مکمل طریقے سے اس کی کمان سنبھالی اور انگریز اس سے دستبردار ہوئے تو اس کا نام بدل کر ''وکٹوریا تھیٹر'' رکھا گیا۔تب پارسی ڈرامیٹک کور نے کئی اردو ڈرامے اسی سٹیج سے پیش کیے ۔اس لیے اس ہال کو اردو ڈرامے کے اسٹیج کے فروغ میں کافی اہمیت حاصل ہے۔''حاجی میاں فضل اور کلال خانہ'' اور ''پٹھان سرفراز گل'' اردو ڈرامے ۱۸۵۴ء میں وکٹوریا تھیٹر ہال میں ہی اسٹیج کیے گئے۔پارسی تھیٹر کی قبولیت عام کا یہ

عالم تھا کہ ۱۸۶۱ء تک ۱۹ر چھوٹی بڑی کمپنیاں بمبئی میں بن چکی تھیں۔ ڈرامے کی یہ کمپنیاں مراٹھی اور گجراتی ڈراموں کے علاوہ اردو ڈرامے بھی اسٹیج کرتی تھیں۔ پارسیوں میں اردو تھیٹر کا باوا آدم کے طور پر ''دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھنی'' کا نام لیا جاتا ہے۔

جب مراٹھی اور گجراتی ڈرامہ ارتقا پذیر ہو رہے تھے اسی زمانے میں ''اندر سبھا'' کو گجراتی زبان میں تبدیل کر کے پیش کیا گیا اور ۱۸۶۷ء میں ''گل روز رینہ'' نامی ڈرامہ گجراتی زبان میں اسٹیج کیا گیا تو اس کو عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے اس کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے دوبارہ پیش کیا گیا۔ جب یہ ڈرامے گجراتی اور مراٹھی اور اردو میں پیش کیے جا رہے تھے تو اہل فن نے یہ اندازہ لگایا کہ اردو ڈرامے گجراتی اور مراٹھی کے مقابل عوام زیادہ پسند کر رہی ہے جس کا اثر یہ ہوا کہ مراٹھی اور پارسی قلم کار بھی اردو میں ڈرامہ لکھنے لگے۔ اردو کے علاوہ گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں جو ڈرامے کھیلے گئے ان میں ''راجہ گوپی چند اور جلندھر'' کے سوا کسی کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ہاں اس بات سے مفر نہیں کہ اس کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے بہت سے ڈرامے کھیلے گئے۔

جب ۱۸۸۱ء میں ''خورشید'' نامی ڈرامہ گجراتی زبان سے اردو زبان میں بھائی سہراب جی پٹیل نے ترجمہ کیا تھا تب ہی سے اردو ڈراموں کا چلن عام ہوا ہے اور اس کے بعد کچھ مسلم ڈرامہ نگار بھی اس فن میں طبع آزمائی کرنے لگے جیسے حسینی میاں ظریف، محمود میاں رونق، مرزا نظیر بیگ وغیرہ یہ لوگ مختلف ناٹک کمپنیوں سے تصنیف و تالیف روزگار کے سلسلے میں وابستہ رہے۔

عوام کی ڈراموں سے دلچسپی پیدا کرنے کا سہرا پارسی تھیٹروں کا نتیجہ ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ڈرامہ نگاروں نے پارسی تھیٹر کے انداز میں ڈراموں کو تخلیق کرنا شروع کیا۔ جن لوگوں نے اس طرز تحریر کو اپنایا ان میں نسروان جی مہربان جی آرام، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، نرائن پرشاد بیتاب بنارسی، حسین میاں ظریف اور آغا حشر کاشمیری کے نام قابل ذکر ہیں۔

'نسروان جی مہربان جی آرام' نے پارسی تھیٹر کے شروعات زمانے میں ''خورشید اور نور جہاں'' ڈرامے کا اردو میں ترجمہ کیا۔ آرام جی خود ایک اداکار تھے ساتھ ہی وہ اردو کے پہلے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔

احسن لکھنوی نے سب سے پہلے اپنے نانا کی مثنوی ''زہر عشق'' کو ڈرامے کی شکل دی اور اس ڈرامے کو انہوں نے ''دستاویز محبت'' کے نام سے موسوم کیا مگر یہ ڈرامہ اسٹیج نہیں ہو سکا۔ انھوں نے 'الفریڈ کمپنی' کے بینر تلے اپنا

ڈرامہ ''چندراولی'' اسٹیج کیا۔انہوں نے اردو ڈرامے کی خدمت میں آٹھ سال صرف کیے اور بہت سے ڈراموں کے ذریعے اس فن کے دامن کو مالا مال کیا۔ پھر اس کے بعد اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے۔ان کے مشہور ڈراموں میں چند یہ ہیں۔خون ناحق عرف مار آستین (ہملیٹ)۱۸۹۸ء، بزم فانی عرف گلنار فیروز (رومیو جیولٹ)۱۸۹۸ء، چلتا پرزہ ۱۹۰۲ء، کنگ تارا ۱۹۰۴ء وغیرہ۔

منشی ونایک پرشاد دطالب بنارسی نے وکٹوریا ناٹک کمپنی کے لیے اخلاقی اقدار اور سماجی اصلاحی ڈرامے لکھے۔جس میں ''گوپی چند'' ''نازان'' ''نگاہِ غفلت'' اور ''لیل ونہار'' قابل ذکر ہیں۔

اردو ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھانے میں 'پنڈت نرائن پرشاد بیتاب' کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے ان کے مشہور ڈرامے ''قتل نظیر'' ''کرشن اوتار'' ''کسوٹی'' ''گورکھ دھندا'' ''مہابھارت'' ''رامائن'' ''مدرانڈیا'' ''سیتا اور شکنتلا'' قابل ذکر ہیں۔

آغا حشر کاشمیری اردو ادب کے ایک مشہور اور قابل قدر ڈرامہ نگار ہیں۔ڈرامے کی روایت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے۔ انہوں نے الفریڈ کمپنی میں کام کیا پھر کچھ دنوں کے بعد 'شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی' کا قیام کیا۔انہوں نے اپنے لافانی ڈراموں سے اردو فن ڈرامہ کو مالا مال کیا۔ انہوں نے اس فن میں ایسے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہمسروں سے ممتاز ہو گئے۔آغا حشر کاشمیری ڈرامے کی دنیا سے ۲۳ر سال تک وابستہ رہے۔انہوں نے ڈرامہ لکھتے کے وقت فن کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ عوام کی دلچسپی اور اسٹیج کے لوازمات کا خاص خیال رکھا۔آغا حشر کے شروعات ڈرامے اسی طرز کے ہیں جو اس وقت کا عام چلن تھا مگر آغا حشر نے جلد ہی اس طرز تحریر کو خیر آباد کہہ دیا۔ان کے شروعاتی ڈرامے اسیر حرص، مار آستین، مرید شک، میٹھی چھری وغیرہ ہیں۔اس کے بعد کے ڈرامے خواب ہستی، خوبصورت بلا، سلور کنگ کے روپ میں ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا پلاٹ شیکسپیئر کے ڈراموں سے ماخوذ ہے مگر آغا حشر نے اپنی جدت طبع اور تخیل پردازی سے ڈراموں کا نہ صرف مزاج بدلا بلکہ اس کا انجام بھی بدل دیا۔آغا حشر کے ڈراموں میں سماج اور سماج کے مسائل کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

آغا حشر کے ڈراموں کے نے اردو ڈراموں کو بہت مقبولیت عطا کی۔دیکھتے ہی دیکھتے لوگ ان کے طرز پر ڈرامے کھیلنے لگے۔اِن ڈرامہ نگاروں کے علاوہ بہت سے دوسرے ڈرامہ نویس بھی تھے جو پارسی تھیٹروں کے لیے

مسلسل ڈرامہ نویسی کے کام انجام دے رہے تھے اور کمپنیاں ان کے ان کے ڈرامے اسٹیج کر رہی تھیں۔

پارسی تھیٹر میں اسٹیج ہونے والے اکثر ڈرامے وہ تھے جن کا پلاٹ مذہبی، تاریخی، اور اخلاقی قدروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ ڈرامے میں ہندو مسلم پارسی وغیرہ روایات سے اخذ ہوتے تھے پارسی اسٹیج میں ۱۸۸۵ تک نسوانی کردار ادا کرنے کے لیے مردوں کا ہی انتخاب ہوتا تھا۔ بعد میں وکٹوریا ہال میں کچھ خواتین چہرے بھی اسٹیج پر نظر آئے۔ پارسی تھیٹر کے ذریعے جب ڈراموں کو اسٹیج کیا جا رہا تھا تو اس وقت کچھ ایسے ڈرامے بھی لکھے گئے جس کو اسٹیج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یعنی وہ صرف کتابی ڈرامے تھے یہ ایسے ڈرامہ نویس تھے جنہیں اسٹیج سے شناسائی نہیں تھی۔ اس لیے ان کے ڈراموں میں اسٹیج کی نزاکتوں کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ان ڈرامہ نگاروں میں محمد حسین آزاد کا تمثیل نما ڈرامہ ''اکبر'' مرزا ہادی رسوا کا ''لیلی مجنوں'' ''طلسم اسرار'' عبدالحلیم شرر کا ''شہید وفا'' اور ''میوہ'' عبدالماجد دریا آبادی کا ڈرامہ ''زود پشیماں'' برج نارائن چکبست کا ڈرامہ ''کملا'' اور پریم چند کا ڈرامہ ''کربلا'' کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خلاصہ

پریم چند کی ادب کی دنیا کے ایک عظیم فنکار ہیں انہوں نے اردو ہندی دونوں زبانوں میں ادب تخلیق کیا ہے۔ ہندی ادب والے انہیں اپنیاس سمراٹ یعنی ناول نگاری کا بادشاہ کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمبا وقت ادب کے نام وقف کیا۔ پریم چند کی ولادت بنارس کے گاؤں لمہی پانڈے پور میں ۳۱/جولائی ۱۸۸۰ء کو ہوئی۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ جبکہ چچا انھیں نواب رائے کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنا ادبی نام دیا نرائن نگم کے کہنے پر پریم چند کر لیا تھا۔ پریم چند نے ۱۸۹۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد ایک اسکول میں معلّمی کے فرائض انجام دینے لگے۔ پریم چند نے تحریک آزادی سے متاثر ہو کر اپنی ۲۰/سال کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پریم چند نے ناول افسانے میں بہت تخلیقات کیں ساتھ ہی فن ڈرامہ نویسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ڈرامہ ایک ایسی کہانی کو کہتے ہیں جس میں مختلف کرداروں کے ذریعے کسی قصے کو پیش کیا جائے۔ قدیم یونانی زبان میں اس کا معنی کرنا یا کر کے دکھانے کے ہیں۔ ارسطو نے ڈرامے کے چھ اجزائے ترکیبی بیان کیے ہیں۔

پلاٹ، کردار، مکالمہ، زبان، موسیقی، آرائش،

عام طور پر ڈرامے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ المیہ اور طربیہ

ہندوستان میں ڈرامہ کی روایت بہت قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس فن کو تقویت راجہ وکرم آدتیہ کے زمانے میں ملی۔ اس کا درباری شاعر کالیداس نے ''شکنتلا'' نامی ڈرامہ لکھا۔ اس فن کا اوج کمال ''ناٹیہ شاستر'' کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ۱۴۹۸ء میں جب پرتگالی ہندوستان آئے تو انہوں نے اس وقت کی رائج زبان میں ڈرامے لکھے۔ جس کی ترقی یافتہ شکل کے روپ میں پارسی تھیٹر وجود میں آیا۔ لکھنو میں واجد علی شاہ کے زمانے میں بھی ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ ان کا ڈرامہ'' رادھا کنہیا'' بہت مشہور ہوا۔ اس کے بعد امانت لکھنوی نے اس فن کو پروان چڑھایا۔ واجد علی شاہ کے دور میں ہی پارسی تھیٹر اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ پارسیوں اور مراٹھیوں نے ڈرامیٹک کور بنائے تھے اسی میں ایک ہندو ڈرامیٹک کور تھا۔ جس نے ڈاکٹر بھاد واجی لاڈ کا لکھا ڈرامہ'' راجہ گوپی چند راور جلندھر'' اسٹیج کیا تھا۔

بھائی سہراب جی پٹیل کا'' خورشید'' نامی ڈرامہ جب گجراتی سے اردو میں تبدیل ہوا تب سے مسلم ڈرامہ نگار بھی اس فن میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ عوام کی ڈراموں سے دلچسپی پیدا کرنے کا سہرا پارسی تھیٹر کا نتیجہ ہے۔ پارسی تھیٹر میں اسٹیج ہونے والے ڈراموں کا پلاٹ اکثر مذہبی تاریخی اور اخلاقی قدروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پارسی تھیٹر کے زمانے میں کچھ ایسے ڈرامے لکھے گئے جن کو اسٹیج نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی وہ صرف کتابی ڈرامے تھے ان ڈرامہ نگاروں میں محمد حسین آزاد، مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، عبدالماجد دریا آبادی، برج نرائن چکبست اور پریم چند کا نام لیا جاتا ہے۔

فرہنگ

استعفیٰ	ملازمت چھوڑنا	بغاوت	غداری
نقوش	نشان	عقیدت	یقین
فروغ	پھیلانا	آرائش	سجاوٹ
ابتدا	شروعات	کلچر	تہذیب
طبع زاد	خود کا لکھا ہوا	تبلیغ	پیغام پہونچانا

رائج الوقت	جس کا چلن ہو	رقص	ناچ
اصول وضوابط	قاعدہ قانون	خطہ	علاقہ
طبقہ	گروہ	منظوم	جو نظم کی شکل میں ہو
پیشکش	کسی چیز کو پیش کرنا	شہرت	مشہور ہونا
وابستہ	جڑا ہوا	کنارہ کش	دوری
ممتاز	منفرد	طلسم	جادو

نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ اردو ڈراما کا آغاز وارتقاء پر نوٹ لکھیے؟

۲۔ ڈراما کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے؟

۳۔ پریم چند کی حالات زندگی کے بارے میں لکھئے؟

۴۔ ڈرامہ کے فن اور اس کی اقسام کے بارے میں بتایئے؟

۵۔ اردو ڈرامہ میں پارسی تھیٹر کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے؟

سفارش کردہ کتب

اردو ڈراما تاریخ وتجزیہ	پروفیسر محمد کاظم
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی
ڈراما نگاری کا فن	محمد اسلم قریشی

پریم چند کی ڈرامہ نگاری

سبق کی ساخت

تمہید

مقاصد

اردو ڈرامے کا آغاز اور پس منظر

پریم چند کے معاصر ڈرامہ نگار

پریم چند کی ڈرامہ نگاری

خلاصہ

فرہنگ

نمونہ امتحانی سوالات

سفارش کردہ کتابیں

تمہید

اصناف اردو ادب میں ڈرامہ ایک اہم صنف ہے بلکہ عالمی سطح پر ڈرامے کو ایک عظیم الشان صنف سمجھا جاتا ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں اس کو قدیم ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ جس کی مثال سنسکرت ڈراموں کی شکل میں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سنسکرت ڈراموں پر موجودہ کتابوں میں سب سے قدیم کتاب بھرت منی کی ناٹیہ شاستر ہے۔ لیکن اس کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس دور کی ترقی یافتہ کتاب ہے اس کا مطلب ہوا کہ ڈرامے کا چلن اس وقت کافی ترقی کر چکا تھا۔

دنیا کے دوسرے ادب کی طرح اردو ادب میں بھی ڈرامہ پروان چڑھا۔ یہ فن حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتا رہا۔ نوٹنکی، راس لیلا، رام لیلا، یاترا وغیرہ اس کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی واجد علی شاہ کا 'رہس' ہے اور امانت کی 'اندر سبھا' تک آتے آتے اس میں کافی نکھار نظر آتا ہے۔ ایک ادیب اپنے مزاج کے

اعتبار سے الگ الگ صنف میں طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔ یہی حال پریم چند کا ہے۔ انہوں نے ناول افسانے کی علاوہ ڈرامہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ جب پریم چند نے ڈرامہ لکھنا شروع کیا اس وقت دوسرے ڈرامہ نگار جیسے طالب بنارسی، احسن لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، نارائن پرشاد بیتاب، امتیاز علی تاج ڈرامے لکھ رہے تھے۔ پریم چند نے ڈرامہ نگاری میں طبع آزمائی تو کی مگر اس فن میں کوئی خاصی پہچان نہیں بنا سکے۔ اس اکائی میں ہم اردو ڈرامہ کے آغاز سے لے کر پریم چند تک کی ڈرامہ نگاری کا سرسری جائزہ لیں گے۔

مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

اردو ڈرامے کی روایت کو جان سکیں گے۔

اردو ڈرامے کے کچھ ڈرامہ نگاروں سے واقفیت ہو سکے گی۔

پریم چند کے عہد کے ڈرامہ نگاروں سے واقف ہو جائیں گے۔

پریم چند کی ڈرامہ نگاری سے واقف ہو جائیں گے۔

اردو ڈرامے کا آغاز اور پس منظر

ڈرامہ صنف ادب میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہے۔ جس کو مثال کے طور پر ہم دنیا کے ادب عالیہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ تبدیلی زمانہ کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے فن اور مذاق میں بھی تبدیلیاں اتی رہیں اسی لیے ان تصورات کو سامنے رکھ کر فن اور اسٹیج کے اصول ولوازمات بدلتے رہے ہیں۔ ڈرامہ کے فن اور روایت پر نظر ڈال کر انسان کے جمالیاتی حس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فن ڈرامہ نے دنیا کے مختلف ادب میں اپنی پہچان بنائی بلکہ ڈرامے کو ادب عالیہ میں بھی شمار کیا جانے لگا۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر زبان کے ادب میں ڈرامے نے اپنی جگہ قائم کی ہے اسی لیے اردو ادب بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔ دنیا کے ڈرامائی ادب کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم اردو ادب کے ڈرامے کی طرف نظر کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو ڈرامے کی عمر دنیا کے ڈرامائی ادب کے سامنے بہت کم ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اردو ڈرامہ ابھی کمسن ہے اور عہد طفولیت کے دور سے بس تھوڑا سا ہی بڑا ہوا ہے۔ کیونکہ ایسی صنف سخن

جس کی قدامت مسلم ہے اس میں اردو ڈرامے کی ڈیڑھ سو سالہ زندگی چہ معنی دارد؟ ڈیڑھ سو سال کی اس قلیل ترین مدت میں اردو ڈرامہ نے بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ جہاں اس کی پرورش قومی اور ملکی روایت کی آغوش میں ہوئی وہیں دوسری طرف غیر ملکی اثرات بھی اس میں در آئے۔

قومی اور ملکی سطح پر ہندوستان کے سنسکرت ڈراموں نے اس فن کو اپنے عروج پر پہنچایا تھا اور ایسی مثالیں قائم کی جو آج بھی دنیا میں قابل قدر گردانی جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ زمانہ گزرتا گیا اور اسباب معیشت پر گہرا اثر ہوا۔ پھر یوں ہوا کہ اداکاری کے یہ کا یہ فن نچلی سطح کے لوگوں کے نصیب میں آیا جنہوں نے اسے وقتی تفریح اور ذریعہ معاش بنالیا۔ دکنی ہندوستان میں 'کچی پڑی' کی شکل میں سنسکرت ڈراموں کی جھلک باقی رہی مگر مختلف علاقوں میں علاقائی اثر کے پیش نظر اس کی شکلیں بدلتی چلی گئیں۔ جن میں کوئی شکلوں کے نام یہ ہیں۔ نوٹنکی، بھانڈوں کی نقلیں، راس لیلا، رام لیلا، یاترا نواج کی شکنتلا وغیرہ

نوٹنکی

ہمارے اردو ادب میں ڈرامے کو جس ابتدائی صورت میں پیش کیا گیا یا یوں کہہ لیجیے کہ ڈرامہ کو جو اردو اسٹیج میسر آیا ان میں نوٹنکی، سنگیت، جنگ نامہ، بھانڈوں کی نقلیں، کٹھ پتلیوں کا تماشہ اور آلھا وغیرہ ہیں۔ وسط ہند، شمالی ہند اور پنجاب وغیرہ کے علاقے میں یہ شکلیں رائج تھیں۔ جبکہ بنگال میں یاترا اور لیلا وغیرہ چلن میں تھے۔ انہی کی ترقی یافتہ اور ارتقائی منزل ڈرامے کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ اردو تھیٹر کی شروعات سے قبل سنسکرت اور ہندی ناٹک زوال پذیر ہوگئے تھے۔ لیکن اردو تھیٹر کے آغاز کے وقت ہندوستان میں رقص و موسیقی کا بازار گرم تھا۔ اور نوٹنکی اپنے عروج پر تھی جو سنگیت ناٹک کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اسٹیج کی موجودہ شکل اس زمانے میں نہیں تھی مگر ہلکے پھلکے کے ساز و سامان کے ساتھ جیسے پردہ وغیرہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں نسوانی کردار بھی مردوں کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا سنگیت ناٹک یا نوٹنکی کے باقاعدہ گروپ ہوا کرتے تھے۔ جو گاؤں گاؤں اور شہر و شہروں چکر لگاتے اور تیوہاروں میں میلوں، ٹھیلوں میں شادیوں وغیرہ میں ناٹک کیا کرتے تھے اور ذریعہ معاش کے لیے پیسے جمع کرتے تھے۔ اسی زمانے میں کٹھ پتلیوں کا تماشہ اور بھانڈوں کی نقلوں کا چلن عام تھا۔

راس لیلا رام لیلا

مذہبی قصوں کو عوام میں بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی لیے جن چیزوں کے ساتھ مذہب جڑا وہ چیزیں عوام میں بہت مقبول ہوئیں ۔ ہندو میتھالوجی میں سیتا اور رام کا قصہ بہت اہمیت کا درجہ رکھتا ہے ۔ اسی لیے ڈرامے میں رام اور سیتا کا قصہ دکھانے کی غرض سے راس لیلا اور رام لیلا وجود میں آیا۔ مگر اس کی پیشکش بھی کچھ خاص دنوں میں کی جاتی تھی جو آج بھی اسی طرح رائج ہے۔ رام لیلا دسہرے کے تیوہار کے موقع پر ہندوستان میں بیشتر جگہ دکھائی جاتی ہے۔ اس کو اسٹیج کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے بچوں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ لیکن کہیں کہیں سنگیت ناٹک کمپنی کے کارکنان ہی اس کو پیش کر دتے تھے۔

بھانڈوں کی نقلیں

فارسی کی مشہور کہاوت ہے محفل ویران جہاں بھانڈ نباشد۔ یعنی وہ محفل ویران ہے جہاں بھانڈ نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی کی تقریبات میں بھانڈوں کا وجود اہم مانا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ہنسانے والی نقلوں کے ذریعے محفل میں موجود ہر شخص کی دلجوئی کرتے تھے۔ تفریح طبع کے لیے یہ ایک اہم جز مانا جاتا تھا۔ میلوں، بازاروں میں اور بڑی بڑی دعوتوں میں ان کو باقاعدہ دل لگی کے لیے بلایا جاتا تھا اور یہ مردانہ محفلوں میں دل جوئی کا سامان مہیا کراتے تھے۔ جبکہ زنانہ محفلوں میں ڈومنیاں اس کام کو انجام دیتی تھی۔ بھانڈوں کو اپنی پیشکش میں جب نسوانی کردار ادا کرنا ہوتا تھا تو اس کے لیے خوبصورت لڑکوں کا انتخاب کرتے تھے۔ جبکہ ڈومینیوں میں مردانہ کردار لمبی چوڑی عورتیں ادا کرتی تھیں۔ ان کی پیشکش میں چھوٹے چھوٹے ہنسانے والے مزاحیہ ڈرامے ہوتے تھے۔ جن کو تخیل کی بنیاد پر گڑھ کر مزاح کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ بھانڈوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ فی البدیہ بولتے تھے اور اس طرح سے نقالی کرتے تھے کہ مانو جیسا جیسے پہلے سے اسکرپٹ تیار ہے۔ بھانڈوں کے علاوہ ہجڑوں کی بھی ایک جماعت تھی جو عیش و نشاط کی محفلوں میں نقلیں اتار کر لوگوں کو تفریح کراتی تھیں۔ بلکہ یہ گروہ آج بھی شادی بھی حق کے موقع پر شادی والے گھر جا کر لوگوں کی دلجوئی اور تفریح کا سبب بنتے ہیں۔

یاترا

فن ڈرامہ کی بنیادی کڑیاں جو مذہب سے جڑتی ہیں ان میں 'یاترا' بھی شامل ہے ۔ یہ یاترائیں ملک ہندوستان کے مذہبی ڈرامے کی شکل تھیں۔ ان یاتراؤں میں شویاترا، کرشن یاترا، سیتایاترا، رام یاترا، شکتی

یاترا قابل ذکر ہیں۔ کرشن یاترا میں رادھا والے قصے کو کافی اہمیت میں حاصل ہوتی تھی کیونکہ اس میں رادھا کی آہ و زاری دکھائی جاتی تھی جو وہ کرشن کے لیے کرتی تھی یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں یاترا ناٹک کا ایک موضوع رادھا کرشن کی داستان محبت ہے۔ یاترا ناٹکوں کے گروپ ضرورتوں کے پیش نظر خود کو بدلتے رہے اور انہوں نے سنگیت ناچ اور پیشکش کے طریقہ کار میں بھی خاصی تبدیلیاں کی۔

نواج کی شکنتلا

بادشاہ حسین اپنی کتاب 'اردو میں ڈرامہ نگاری' میں لکھتے ہیں کہ:

''فارسی کے زیر اثر چند تماشے مخلوط فارسی اور پراکرت میں تیار ہوئے۔ اس قسم کا ایک تماشہ (ڈرامہ) نواز نامی ایک شخص نے فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا''

اس اقتباس کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ فرخ سیر کے زمانے میں شاعر نواز نے سنسکرت ڈرامہ 'شکنتلا' کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا تھا۔ یہ مغلیہ عہد تھا اور اس زمانے میں ایران کی علمی ادبی روایتوں کی وجہ سے ڈرامے کا وجود نہیں بچا تھا۔ تو ایسے میں سنسکرت ڈراموں کا مقامی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ جس کی شکلیں بھی بدل گئیں۔ بلکہ ان کو منظوم بیان کی جانے لگا اس کی سب سے واضح نظیر ''نواز (نواج) کی شکنتلا ہے جو چوپائی کی شکل میں وجود میں آئی۔ پروفیسر سید مسعود حسین رضوی اس بارے میں اپنی کتاب ''نگارشات ادیب'' میں لکھتے ہیں:

۱ ''نواز ہندی یعنی برج بھاشا کا شاعر تھا اور ہندی تلفظ کے مطابق نواج تخلص کرتا تھا''

۲ ''نواج شکنتلا ناٹک نہیں ایک منظوم قصہ ہے جو ہندی کی مختلف بحروں (کبت، دوہا، ہری گیت، چوپائی) میں بیان کیا گیا ہے۔ ناٹک کی کوئی خصوصیت اس میں موجود نہیں۔ خود نواج اسے ناٹک نہیں بلکہ کتھا یعنی قصہ کہتا ہے''

اقتباس بالا کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواج کی شکنتلا ناٹک نہیں بلکہ ایک منظوم قصہ ہے جو برج بھاشا میں لکھا گیا تھا۔

کاظم علی جوان کی شکنتلا

ڈاکٹر جان گلگرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ترجمے کے لیے جن مصنفین کو جمع کیا تو ان میں کاظم علی جوان بھی تھے۔اسی وقت کاظم علی جوان نے شکنتلا نامی قصے کو سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا اسی کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ حسین نے''اردو میں ڈراما نگاری''میں لکھا ہے۔

''اسی قسم کا ایک تماشہ (ڈرامہ) نواز نامی شخص نے تیار کیا تھا۔اس کا سلیس
اردو ترجمہ ۱۸۰۱ء میں کاظم علی جوان نے کیا۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاظم علی جوان کی شکنتلا ایک ڈرامہ ہے مگر اس کے ساتھ وہی ہوا جو نواز کی شکنتلا کے ساتھ ہوا۔یعنی یہ دونوں ڈرامے کے طور پر نہیں لکھے گئے بلکہ یہ ایک قسم کے قصہ تھے مگر اردو کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کو دیکھے بغیر اس کا ذکر اس طرح کیا کہ وہ ڈرامہ ہے۔

واجد علی شاہ کا رہس

لکھنو کے سلطان واجد علی شاہ کو شعر ادب کے علاوہ فنون لطیفہ سے گہرا لگاؤ تھا۔رقص سرور کی سرپرستی تو بہت بادشاہوں نے کی۔مگر واجد علی شاہ کا نام رقص وموسیقی کے سب سے بڑے نمائندہ کے طور پر لیا جاتا ہے۔واجد علی شاہ کی دلچسپی چونکہ رقص وسرور اور موسیقی کی طرف تھی اس لیے یہی دلچسپی انہیں رہس یعنی راس لیلا اور رام لیلا کی طرف لے گئی۔ راس لیلا میں کرشن کی داستان محبت ہے۔اس میں کرشن کا گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ کے واقعات کو دلچسپ انداز میں دکھایا جاتا ہے۔کرشن کا ذوق رقص،موسیقی کے ساتھ ساتھ حسن پرستی میں بھی عروج کو پہنچا ہوا تھا۔واجد علی شاہ بھی حسن پرست اور موسیقی کا دلدادہ تھا اس لیے اس نے اپنی تفریح کے لیے فنون لطیفہ میں خاصی دلچسپی دکھائی۔اور اس نے کئی ایسے عوامی رقص بنائے جس کو رہس کہا جاتا تھا۔ڈاکٹر مسیح الزمان اپنی کتاب''امانت کے اندر سبھا''میں لکھتے ہیں

''وقت اور روپے کی فراوانی نے پہلے تو انھیں اس عوامی رقص کی بہت سی
قسمیں ترتیب دینے کی طرف متوجہ کیا۔ جسے رہس مبارک کے نام سے
پکارا جاتا تھا پھر اس کے لیے رہس خانہ تعمیر ہوا۔اس میں ناچنے گانے کے

لئے ایسی نو جوان لڑکیاں اوران کو تعلیم دینے والے ملازم ہوئے اور یہ شوق مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا اس جگہ پہنچا کہ بادشاہ کی طباعی نے وہ رادھا کنہیا کا قصہ کے نام سے ایک ایسی چیز تصنیف کی جو کرشن لیلا اور ڈرامہ سے ملتی جلتی تھی۔

رہس کیا ہے

کرشن کی ایک لیلا کو رہس کے نام سے جانا جاتا ہے۔یعنی وہ کھیل یا ناچ جو کرشن نے گوپیوں کے ساتھ آدھی رات کے وقت کیا تھا اس کو راس لیلا یا رہس کے نام سے جانا گیا۔کرشن جی کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی گوپیوں سے یہ عہد کیا تھا کہ سردیوں میں ان کی دلی مراد کو پورا کریں گے۔تو جب سردی کا موسم آیا تو کرشن وِرِنداوَن میں چلے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی سریلی آواز میں بینا (بانسری) شروع کی۔جس کا عالم یہ ہوا کہ جس کے بھی کان میں یہ آواز پڑتی وہ بے قرار ہو جاتی۔اس طرح ساری گوپیاں اپنے کام کا چھوڑ کر ورنداون پہنچ گئیں۔کرشن سے وصال ہونے پر گوپیاں مغرور ہو گئیں۔کرشن نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو ان کا غرور ختم کرنے کے لیے وہاں سے غائب ہو گئے۔کرشن کے غائب ہونے پر گوپیوں کی بے چینی و بے قراری بڑھ گئی اور وہ ان سے دور ہونے پر جدائی کے گیت گاتیں اور روتی رہتی تھیں۔کرشن کو ان کی حالت زار پر رحم آیا اور دوبارہ ان کے درمیان آ گئے۔جس سے گوپیوں کی زندگی میں بہاریں لوٹ آئیں۔اس کے بعد کرشن ساری گوپیوں کو لے کر جمنا کے کنارے پہنچ گئے اور ساری گوپیاں ایک دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئیں۔کرشن نے خود کو ان میں اس طرح پیش کیا کہ ہر گوپی کے بیچ میں کرشن دکھائی دیتے تھے۔رات بھر گوپیاں کرشن کے ساتھ رہیں اور صبح ہوتے ہی گھر واپس آ گئی ہیں۔

رہس میں کرشن کے انھیں واقعات کو پیش کیا جاتا تھا اور گوپیوں کے وہ گیت جو انہوں نے کرشن کے لئے گائے تھے ان کو خاصی اہمیت دی جاتی تھی۔نواب واجد علی شاہ کا رادھا کنہیا بھی اسی سے متاثر ہو کر اردو زبان میں لکھا گیا تھا۔جس میں اہم کردار رادھا کنہیا ہیں جن کے اوپر پوری کہانی کا تانا بانا بنا ہوا نظر آتا ہے۔اس میں دکھا گیا ہے کہ کنہیا کو رادھا سے پیار ہے اور رادھا بھی ان پر فدا ہے۔اس ڈرامہ کو واجد علی شاہ نے اسٹیج کیا تھا جس میں کنہیا کا کردار خود ادا کیا تھا۔

امانت لکھنوی اور اندر سبھا

واجد علی شاہ کے رہس اور رادھا کنہیا کے قصے سے اردو ڈرامے کا آغاز مانا جاتا ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ رادھا کنہیا ڈرامہ شاہی محل میں کھیلا گیا مگر یہ بات نہیں کہی جا سکتی واجد علی شاہ کے رہس وغیرہ سے پہلے اردو میں ڈرامائی عناصر موجود نہیں تھے۔ اردو میں بھی دوسری زبانوں کی طرح یہ ڈرامائی عناصر موجود تھے۔ لوک روایتوں میں جیسے نقل، نوٹنکی، چہار بیت، مرثیہ خوانی وغیر جنہیں باقاعدہ اسٹیج کیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ واجد علی شاہ نے اسے دانستہ طور پر ڈرامے کی شکل میں پیش کیا مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مکمل ڈرامہ ہے۔

واجد علی شاہ کے بعد اردو ڈرامہ میں جس کا نام لیا جاتا ہے وہ سید آغا حسن امانت لکھنوی ہیں۔ آغا حسن امانت لکھنوی اپنے اندر سبھا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جو اردو کا پہلا باضابطہ منظوم ڈرامہ ہے۔ واجد علی شاہ نے راھا کنہیا کے قصوں پر مبنی جس طرز کے رہس کو پیش کرنے کی روایت شروع کی تھی اسے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی مگر عوام کا طبقہ اس سے محروم رہا۔ مگر جب امانت نے اپنے اندر سبھا پہلی بار عوام کے سامنے پیش کی تو اس کی شہرت تمام اطراف و جوانب میں پھیل گئی اور ہر کسی کی زبان پر اس کے چرچے آ گئے۔ امانت کی اندر سبھا آسان اردو زبان میں لکھی گئی تھی جس کی شکل منظوم تھی۔ اسی لیے اس کو اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ اندر سبھا کو پہلی بار اسٹیج جنوری ۱۸۵۴ء میں کیا گیا تھا جبکہ یہ ڈرامہ دو سال قبل اگست ۱۸۵۲ء میں مکمل ہو چکا تھا۔

پریم چند کے معاصر ڈرامہ نگار

طالب بنارسی

منشی ونایک پرشاد، ادبی نام طالب بنارسی ۱۸۵۵ء کو بنارس میں پیدا ہوئے اور یہیں سے تعلیم حاصل کی۔ طالب بنارسی اپنے ابتدائی زمانے سے ہی لکھنے لگے تھے زمانہ طالب علمی میں انہوں نے سیاسی و سماجی مضامین لکھے اور شائع کئے۔ ونایک پرشاد، طالب بنارسی کو اردو انگریزی اور فارسی زبان و ادب سے اچھا لگاؤ تھا۔ اوائل عمر میں جب وہ تھیٹر دیکھتے تھے تب انہوں نے ڈرامے لکھنے کا شوق ہوا اور انہی دنوں وہ بمبئی چلے گئے۔ بمبئی پہنچ کر وہ وکٹوریا ناٹک منڈلی میں بحیثیت ڈرامہ نگار مقرر ہوئے۔ وکٹوریا تھیٹریکل کمپنی اس دور کی بہت مشہور کمپنی تھی جو شہر شہر گھوم گھوم کر ڈرامے پیش کرتی اور داد و تحسین حاصل کرتی تھی۔ بالی والا جو وکٹوریا تھیٹریکل کمپنی کے مالک تھے اپنی کامیاب

اداکاری سے دیکھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ کمپنی کی شہرت میں بالی والا کا کردار بہت اہم ہے۔

طالب بنارسی نے ۱۸۸۴ء میں ڈرامے لکھنے شروع کیے اور ادب خدمت کا یہ سلسلہ ۱۹۱۱ء تک چلتا رہا یعنی انہوں نے کم وبیش ۲۸ رسال ڈرامے لکھے اور ڈرامہ نگاری میں پرانی روایت کہ پابند رہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے مطابق ان کے ڈراموں کی تعداد ۱۸ ر ہے۔ ان کے ڈراموں میں ہریش چندر کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اپنی کتاب ''اردو تھیٹر'' میں ڈرامہ ''ہریش چند'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''کافی تیاری کے بعد ہریش چند دکھلایا گیا اور واقعی اس نے ہندوؤں میں ہلچل مچادی اور مستقل ڈیڑھ سال تک دکھایا جاتا رہا اور ایک ہزار بار سے زائد دکھلایا گیا۔ اسے نہ صرف بالی والا بلکہ دادا بھائی ٹھوٹھنی اور محمد علی ابراہیم نے بھی لاکھوں روپے پیدا کیے۔ ماسٹر اشرف خان فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس سے بہتر آج تک کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا''

طالب بنارسی کے ڈراموں میں کی زبان سلیس اور بناوٹ سے پاک ہے۔ انہوں نے بعض ہندی زبان میں بھی ڈرامے لکھے ہیں ان کی زبان تھوڑی الگ ہے اور یہ وہ پہلے ڈرامہ نگار ہیں جنہوں نے اسٹیج کو پورے طور پر نثر سے آشنا کرایا تھا اور ڈراموں میں ہندی گانوں کی جگہ اردو گانوں کو رواج دیا۔ طالب بنارسی اپنے وقت کے کامیاب ڈرامہ نگار کے طور پر ہمارے سامنے نظر آتے ہیں اور تھیٹر کے زمانے میں ان کے ڈراموں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

احسن لکھنوی

سید مہدی حسن، ادبی نام احسن لکھنوی ڈرامہ نگاری میں ایک اہم نام ہے۔ والد کا نام میر حسن ہے جو اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ احسن لکھنوی کے ڈرامہ نگاری کی ابتدا ۱۸۹۷ء میں ہوئی اور سب سے پہلے انہوں نے اپنے نانا کے بھائی مرزا شوق کی مثنوی کو ایک ڈرامے کی شکل دی۔ اس کو دستاویز محبت کے نام سے موسوم کیا۔ احسن لکھنوی کے مکان کے قریب 'افضل محل' واقع تھا جس میں ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ جو بھی فارسی کمپنی یا دوسرے ناٹک کمپنیاں لکھنو آتیں وہ اسی افضل محل میں ڈرامہ کھیلا کرتی تھیں جس کی وجہ سے احسن کو تھیٹر کا شوق بچپن سے ہی ہو گیا تھا۔ افضل محل کی عمارت وکٹوریا اسٹریٹ کے برابر گولا گنج میں تھی۔ یہیں احسن کی ملاقات فارسی تھیٹر یکل کمپنی بمبئی

کے مالک دادا بھائی رتن جی ٹھوٹھنی سے ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۷۹ء میں وہ تھیٹریکل کمپنی کے ملازمین میں شامل ہو گئے اور اپنا پہلا ڈرامہ ''چندراوَلی'' اسٹیج کیا۔ پھر انہوں نے ۱۹۲۲ء تک مختلف ڈرامے لکھے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ کوشش کی کہ اردو اسٹیج پر ادبی رنگ غالب رہے مگر پارسیوں نے اس طرح کے تجربوں کو خلاف مصلحت سمجھا۔ آخر احسن لکھنوی نے اپنی خوددار طبیعت کی بنا پر ڈرامہ نویسی کی دنیا کو خیر آباد کہہ دیا اور مرثیہ خوانی کی طرف راغب ہو گئے۔ احسن لکھنوی کے ڈرامے مندرجہ ذیل ہیں:

چندراوَلی چلتا پرزا	کنگ تارا۔	شریف بدمعاش
گن سندری۔ سیتا ہرن	ادہر موجے	زہر عشق
(داستان محبت)		

احسن لکھنوی کے تراجم

ہیملیٹ کا ترجمہ خون ناحق	رومیو جیولٹ کا ترجمہ گلنار فیروز۔
کامیڈی آف ایرز کا ترجمہ بھول بھلیاں۔	میکبتھ اصل نام سے۔
ایز یو لائک اٹ۔ As you like it	مرچنٹ آف وینس۔
دل فروش	

آغا حشر کاشمیری

آغا محمد شاہ، ادبی نام آغا حشر کاشمیری اتر پردیش کے شہر بنارس میں تین اپریل ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غنی شاہ تھا۔ جو تجارت کے سلسلے میں کشمیر سے ترک وطن کر کے بنارس میں آباد ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے آغا محمد شاہ، آغا حشر کاشمیری کہلائے۔

آغا حشر کاشمیری کو بچپن سے ہی ڈرامہ اور شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ انہوں نے ۱۸/سال کی عمر میں اپنا پہلا ڈرامہ آفتاب محبت کے نام سے تحریر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے وقت کے ایک مشہور ڈرامہ نویس، احسن لکھنوی کو بطور تصحیح ڈرامہ دکھایا تو انہوں نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ ڈرامہ نگاری کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

آغا حشر کاشمیری کو احسن لکھنوی کا یہ جملہ کسنا اچھا نہیں لگا۔ اور وہ اس کو دل پر لے گئے مگر کبیدہ خاطر اور ملول

نہیں ہوئے ۔ نہ ہی احساس کمتری کو اپنے اوپر حاوی ہونے دیا۔ بلکہ انہوں نے اسے بطور چیلنج قبول کیا اور اپنی ریاضت وکسب سے اپنے تخلیقی قوت کو بروئے کار لائے اور اس طنز کا جواب اس خوبصورتی سے دیا کہ آج تک اردو ڈرامہ نگاری کی روایت آغا حشر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ہے۔

آغا حشر نے اپنی زندگی کے تقریبا ۳۳ر سال فن ڈرامہ نگاری کی آبیاری کی اور فن ڈرامہ نگاری کو مختلف جہتیں عطا کیں۔ انہوں نے شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کا آزاد اردو زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کہانیاں کو آغا حشر کاشمیری نے کچھ اس طرح ترتیب دیا کہ ان کے پلاٹ تو مغربی ڈراموں کے ماخوذ تھے مگر ماحول اور کردار ہندوستانی فضا میں پروان چڑھے تھے اور ان کے بعض ڈراموں کے پلاٹ مشرق سے ماخوذ ہیں جیسے سیتا بن باس، کا ماخذ رامائن ہے۔ بھیم پرتگیا مہابھارت سے لیا گیا ہے جبکہ رستم وسہراب فردوسی کہ شاہنامے سے اخذ ہے۔

آغا حشر کی ڈرامہ نگاری کے چار ادوار ہیں۔ ہر دور تدریجی کی ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ کیونکہ تبدیلی زمانہ کے ساتھ ساتھ چیزیں بدلتی رہی ہیں اسی لیے فن کار بھی اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے زمانے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی بدلتا چلا جاتا ہے اس لیے آغا حشر مذاق زمانہ کے مطابق تبدیل ہوئے اور خود کو عوام کی پسند کے مطابق ڈھال لیا۔ یہی فنکار کا کمال ہوتا ہے لیکن فن کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ فن کے معیار کو آہستہ آہستہ بلند کرتا رہے یہاں تک کہ عوام اس کی عادی ہو جائے اور یہ صلاحیت آغا حشر میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

آغا حشر کی شہرت فن ڈرامہ نگاری میں اس لیے ہوئی کہ انہوں نے فن میں اپنی وسعت اور لچک پیدا کر لی تھی۔ ہر ذوق ہر عمر کے لوگوں کے مطابق اس میں کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ یہ ان کا کمال ہیکہ انہوں نے اپنے اور عوام کے ذوق میں ایک توازن رکھا جس میں وہ بخوبی کامیاب ہوئے۔

آغا حشر کی ادبی زندگی کو کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے یہ زمانہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۳۵ء تک کا ہے جس میں انہوں نے کم وبیش ۳۳ر ڈرامے لکھے ہیں ان کے بعض مشہور ڈراموں کے نام یہ ہیں آفتاب محبت۔ مار آستین۔ سلور کنگ۔ یہودی کی لڑکی۔ پہلا پیار۔ عورت کا دل۔ آنکھ کا نشہ۔ سیتا بن باس۔ رستم وسہراب۔ عورت کا پیار۔ دل کی پیاس۔ عشق اور فرض۔ خون ناحق وغیرہ۔

منشی نرائن پرشاد بیتاب دہلوی

منشی نرائن پرشاد بیتاب دہلوی بھی ایک بڑے ڈرامہ نگار گزرے ہیں۔انہوں نے بھی شیکسپیر کے ڈراموں کواردو کا جامہ پہنایا ہے۔لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اصل کے مطابق رہے مگر اس سلسلے میں کڑی دشواری سامنے آئی۔کیونکہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا تانا بانا انگلستان کی معاشرت کا عکاس ہے۔جبکہ وہی چیز جب ہندوستان کے پس منظر میں پیش کی جاتی ہے تو کردار کے مطابق نہیں ہوتی ہے اور واقعات نامناسب معلوم ہوتے ہیں اسی طرح محاورہ ضرب الامثال اور زبان کو کسی دوسری زبان میں پیش کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہے۔

شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے ایز یو لائک اِٹ کا ترجمہ منشی نرائن پرشاد بیتاب نے ''جو آپ پسند کریں'' کے نام سے کیا تھا۔بیتاب کا یہ ترجمہ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔کوئی خاص تبدیلی نہیں کی ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر عطیہ نشاط اردو ڈراما روایت اور تجزیہ میں لکھتی ہیں۔

> ''۔۔۔انہوں نے کرداروں کے نام بھی نہیں بدلے اور ترجمے میں بھی
> مناظر اور واقعات میں اپنی طرف سے کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔مکالمے
> سلیس نثر میں ہیں کہیں کہیں پر اشعار البتہ داخل کر دیے ہیں۔''

منشی نرائن پرشاد بیتاب کی ڈرامہ نگاری میں ان کی پہچان اس وجہ سے بھی ہے کہ انہوں نے فن ڈرامہ نگاری کی اصلاح کے لیے ممبئی سے ایک رسالہ بنام شیکسپیئر جاری کیا تھا اور شیکسپیئر کے کچھ ڈراموں کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ فن ڈرامہ نگاری کے اس اصول کا لحاظ نہیں کر سکے کہ ڈرامہ میں کرداروں کی زبان فطری بول چال کی عین مطابق ہونی چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجمہ کو ڈرامہ نگاری کے میدان میں لائق توجہ نہیں سمجھا گیا ان کے بعض ڈراموں کے نام یہ ہیں۔امرت، گورکھ دھندا، مہابھارت، میٹھا زہر، حسن فرنگ، دورنگی دنیا، پتنی پرتاپ

امتیاز علی تاج

امتیاز علی تاج کا نام فن ڈرامہ نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ان کی ولادت تین اکتوبر ۱۹۰۰ء کو پنجاب میں ہوئی۔ان کے والد کا نام ممتاز علی تھا جو سر سید احمد خان کے دوستوں میں سے تھے۔اور ان کے دادا دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج کے طالب علم اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔امتیاز علی تاج نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے

آنرز کیا۔ وہ اپنے زمانے میں کالج کی کلچرل کارگردگیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ شاعری کو شوق اوائل عمر سے ہی تھا۔ اور ڈرامہ میں بھی خاصی رغبت رکھتے تھے۔ امتیاز علی تاج کی شخصیت مختلف الجہات تھی۔ انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، مگر انہیں شہرت ان کے لازوال کارنامہ ''انارکلی'' سے ملی۔ جو ڈرامے کی دنیا میں قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس ڈرامے میں ہر چیز موقع محل کے اعتبار سے مناسب جگہ معلوم ہوتی ہے۔ امتیاز علی تاج کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ڈرامہ کی زبان کا تعین، موضوع کردار کی مناسبت سے کرتے ہیں۔ یعنی تمام کردار ایک ہی زبان اور لب ولہجہ استعمال نہیں کرتے بلکہ ہر اداکار کی زبان سے اس کی تعلیم تہذیب وثقافت سماج اور ماحول کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ جیسے ہی امتیاز علی تاج کا نام آتا ہے تو انارکلی ڈرامے کی تصویر ذہن کی دریچے پر آجاتی ہے۔ یہ ان کا شاہکار ڈرامہ ہے اور سبب شہرت بھی ان کا یہی ڈرامہ ہے۔

تاج نے صرف انارکلی ہی نہیں لکھا انہوں نے متعدد ڈرامے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے دیگر انگریزی اور فرانسیسی زبان کے ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا ہے جیسے قرطبہ کا قاضی انگریزی ڈرامہ نویس لارنس ہاؤس مین کے ڈرامے کے ترجمہ ہے۔ خوشی ڈرامہ پیٹرو پیٹر فرانسیسی ڈرامہ نگار سے لیا گیا ہے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں میں کمرہ نمبر پانچ، قرطبہ کا قاضی، الو کی زبان، صرف کانوں کے لیے اور شیخ برادران وغیرہ ہیں۔

پریم چند کی ڈرامہ نگاری

جب برطانوی حکومت ہندوستان میں اپنے پنجے گاڑ چکی تھی اور ظلم وزیادتی سے یہاں کی تہذیب کو قدم بقدم زک پہنچا رہی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی ومذہبی رہنماؤں کو قید کیا جارہا تھا۔ یہ دور ہندوستان کی اتھل پتھل کا دور تھا اسی پرآشوب پرفتن دور میں پریم چند نے اپنی انکھیں کھولیں۔ جب شعور بیدار ہوا تو دیکھا کہ تحریک جدوجہد آزادی اپنے شباب پر ہے۔ اسی لیے پریم چند کے ادب میں اس جدوجہد کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں ان کے ناولوں افسانوں میں جا بجا سماجی نہ برابری معاشی بدحالی اور سیاسی کشمکش دیکھنے کو ملتی ہے وہیں ان کے ڈراموں میں قانونی استبداد سیاسی کشمکش نظر آتی ہے۔

جب ہم پریم چند کی ڈرامہ نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۶ء کا زمانہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس زمانے میں پریم چند کے علاوہ احسن لکھنوی، رونق بنارسی، حباب رام پوری، حسینی میاں ظریف، طالب

بنارسی، حافظ عبداللہ ڈرامہ نگاروں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ ڈرامہ نگار پارسی تھیٹر سے منسلک تھے۔ یہی زمانہ پارسی تھیٹر کے عروج کا زمانہ ہے۔ فارسی تھیٹر کو ہم اردو تھیٹر کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ پارسی تھیٹر اور اردو ڈرامہ ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔ پارسی تھیٹر کے ڈرامے زیادہ تر بنارس اور اس کے آس پاس کھیلے جاتے تھے اور پریم چند بھی انہی دنوں بنارس کے ایک گاؤں لمہی پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ پارسی تھیٹر کے زیادہ تر ڈرامے بنارس میں ہونے کی وجہ سے پریم چند کی زندگی پر بھی اثر ہوا۔ ساتھ ہی اردو کا بڑے ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کی جائے پیدائش بنارس ہی تھا۔ جنہوں نے بنارس میں ہی اپنی تھیٹریکل کا کمپنی بھی قائم کی تھی۔ پارسی تھیٹر کی مقبولیت اور اردو ڈرامے کے حوالے سے پریم چند لکھتے ہیں:

''نہ تو اردو میں اور نہ ہندی میں ڈرامے کی مقبولیت حاصل ہے اگر ڈرامے
کی روایت ہے تو صرف فارسی تھیٹر تک محدود ہے''

پریم چند کا جب ہم بحثیت ڈرامہ نویس مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے صرف تین ہی طبع زاد ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں سے صرف دو اردو اور ہندی میں ایک کربلا دوسرا روحانی شادی۔ اردو ہندی زبان میں شائع ہوئے۔ جبکہ تیسرا ڈرامہ 'سنگرام' صرف ہندی میں شائع ہوا۔ لیکن کلیات پریم چند کے مرتبہ مدن گوپال نے لکھا ہے کہ پریم چند کا کربلا' ڈرامہ' گنگا پستک لکھنؤ سے نومبر ۱۹۲۴ء پہلے ہندی میں شائع ہوا پھر جولائی ۱۹۲۶ء تا اپریل ۱۹۲۸ء ''زمانہ'' نے اردو میں اس کی اشاعت کی۔ پریم چند کا دوسرا اردو ڈرامہ ''روحانی شادی'' ۱۹۳۳ء میں عصمت بک ایجنسی دہلی سے اردو میں شائع ہوا۔ بعدہ سرسوتی پریس بنارس سے ہندی میں بنام ''پریم کی دیوی'' شائع کیا۔ پریم چند کا تیسرا طبع زاد ڈرامہ ''سنگرام'' ہے۔ جو ان کے دونوں ڈراموں سے پہلے کا ہے یہ فروری ۱۹۲۳ء میں ہندی پستک ایجنسی کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ پریم چند کا یہ ڈرامہ صرف ہندی میں شائع ہوا تھا۔

پریم چند نے جن انگریزی ڈراموں کے ترجمے کیے ہیں ان میں سے دو اردو ترجمے اور تین ہندی ترجمے ہیں۔ انگریزی ڈراموں کی مکمل تعداد چار ہے۔ ایک ڈرامہ ایسا ہے جو انہوں نے اردو ہندی دونوں میں ترجمہ کیا ہے۔

پریم چند نئے انگریزی ڈراموں کے بھی ترجمے کیے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

ا سائٹ لیس شب تار ماٹرلنک اردو

۲	سلور باکس	چاندی کی ڈبیا	گالزوردی	ہندی
۳	اسٹرائک	ہڑتال	گالزوردی	ہندی
۴	جسٹس	نیائے	گالزوردی	ہندی
۵	جسٹس	انصاف	گالزوردی	اردو

پریم چند کے طبع زاد ڈراموں پر گفتگو کرنے سے پہلے ان کے تراجم کیے ہوئے ڈراموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ پریم چند کے تراجم شدہ ڈراموں پر نظر ڈالیں چاہے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پریم چند کا ترجمہ بہت جھول دار ہے۔ انہوں نے ڈراموں کے مکالموں کا لفظی ترجمہ کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ یہاں تک کہ محاورے بھی اس زد سے نہیں بچ سکے انگریزی محاوروں کا ترجمہ لفظ بلفظ کیا گیا ہے جیسے:

تم کیوں آئے ہو بھلے آدمی　　یہاں بھلے آدمی ترجمہ

Gental Man کا کیا گیا ہے۔　　ہاں ہاں ہم سن چکے غریب عورت

یہاں غریب عورت کا ترجمہ Poor Lady　　کا کیا گیا ہے۔

اسی طرح پریم چند اس بات کا لحاظ نہیں رکھ پائے کہ کردار کی زبان اس کے معیار کے مطابق ہے کہ نہیں۔ ان کے جو اردو تراجم ہیں ان میں پریم چند نے مشکل اور فارسی آمیز اردو استعمال کر ڈالی ہے جو کسی بھی طرح کردار سے میل نہیں کھاتی۔ اسی طرح پریم چند کے ذریعے جن ڈراموں کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا ہے ان کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہاں جبراً ہندی استعمال کی گئی ہے۔ ان کے ڈراموں میں ایسے ہندی زبان مکالمے ہیں جس سے کردار کی اصلیت مسخ ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کردار کے مکالمے طویل ہو گئے تو وہاں پریم چند ترجمہ کرتے ہوئے بھول گئے کہ وہ ہندی میں ترجمہ کر رہے ہیں اور انہوں نے وہاں اردو زبان کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کے ایک ترجمے کیے ہوئے ڈرامے کا یہ مکالمہ دیکھیے

جیک:　کھید ہے مجھے دیر ہو گئی۔

یہ سب میں کچھ نہیں جانتا ہاں اگر آپ کا خیال ہے کہ میں نے بجا کیا ہے تو مجھے دکھ ہے۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا، اگر میں پیسے کو محتاج نہ ہوتا تو کبھی ایسا کام نہ کرتا۔

ٹینچ:　(دھیمی آواز میں بالکل گڑگڑا کر) آپ کوئی سمجھوتہ کر لیتے تو میرا چت بہت شانت ہو جاتا (وہ

سر اٹھا کر انتھونی کو دیکھتا ہے جو استھر بھاؤ سے بیٹھا رہتا ہے) سچ مچ اس سے مجھے بڑی چنتا ہو رہی ہے مجھے کئی ہفتوں سے اچھی نیند نہیں آتی (نراش ہو کر) آپ کو منظور نہیں ہے۔

ان تراجم کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ پریم چند ہندی میں ترجمہ کرتے کرتے اردو زبان میں چلے جاتے ہیں مگر پھر بھی جیسے ہی انہیں یاد آتا ہے وہ پھر ہندی زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ایک ہی کردار کی دو طرح کی زبان وہ بھی ایک ہی منظر میں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف وہیں پریم چند پورے جملوں کو ہندی روپ نہیں دے پائے ہیں۔ انہوں نے جبراً ہندی لفظ جملوں میں ٹانک دیے ہیں جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بہت سے جملوں میں ربط اور سلاست باقی نہیں رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پریم چند سوچ اردو میں رہے ہیں اور ترجمہ ہندی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں اردو کی ہندی سمجھ نہیں آتی ہے وہاں بعینہ اردو استعمال کر ڈالی ہے۔

پریم چند نے گالزوردی کے ڈرامے جسٹس کا ترجمہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں کیا ہے ہندی میں اس کا ترجمہ ''نیائے'' کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۳۰ء کو شائع ہوا۔ اور اردو ترجمہ بھی انصاف کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۳۰ کو شائع ہوا تھا۔ اس ڈرامے کو پڑھنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ صرف ان کی زبان ہی الگ نہیں ہے بلکہ ترجمے بھی الگ ہیں جسٹس ڈرامہ کا یہ اقتباس دیکھیے۔

داروغہ: (روکھی اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ) بڑے آشچر یہ کی بات ہے، مسٹر ووڈر! تمھیں یہ کہاں ملی۔

ووڈر: اس میں چادر کے نیچے، صاحب! ایسی بات دو برس سے نظر نہیں آتی۔

داروغہ: (آشچر یہ سے) کوئی سدھی بدھی بات تھی کیا؟ میں دو پہر کو اس سے ملوں گا۔ اس کا نام کیا ہے؟ مانو شاید کوئی پرانا آسامی ہے۔

ووڈر: ہاں صاحب! یہ چوتھی بار سزا بھگت رہا ہے۔ ایسے پرانے کھلاڑی کو تو زیادہ سمجھ سے کام لینا چاہیے تھا۔ (کرونا بھاؤ سے) کہہ رہا تھا من بہلاتا تھا۔ کہیں گھس گئے، کہیں سے نکل آئے۔ سب اس دھن میں پڑے رہتے ہیں۔

داروغہ: دوسرے کمرے میں کون رہتا ہے۔

ووڈر: اوکلیری، حضور!

داروغہ: اچھا یہ آئرش مین؟

ووڈر: اس کے دوسرے کمرے میں رہتا ہے وہ یورک فالڈر، سبھیہ شرینی کا۔اس کے بعد وہ بوڑھا کلپٹن۔

داروغہ: ہاں، وہ دارشنک۔ میں اس سے ملوں گا۔اس کی آنکھوں کے بارے میں پوچھنا ہے۔

ووڈر: کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو باقی سبھوں کو اس کی خبر ہو جاتی ہے۔سبھی بھاگنے پر اتارو ہو جاتے ہیں۔خوب ہلچل مچ رہی ہے۔

گورنر: (وچار کر کے) یہ ہلچل برا ہے۔(قیدیوں کو کسرت کرتے دیکھتا ہے) وہاں تو سب کے سب بڑا شانت معلوم ہوتے ہیں۔

ووڈر: اس آئرش مین اوکلیری نے آج دروازے پر دھکا دینا شروع کیا۔بالکل ذرا سی بات ان میں کھل بلی ڈال دینے کو کافی ہے۔وہ کبھی کبھی سب بے زبان جانوروں سے ہو جاتے ہیں۔

(بحوالہ کلیات پریم چند، جلد ۱۶/صفحہ ۲۷۱)

جیلر : (ہلکے پر معنی تبسم کے ساتھ) یہ عجب ماجرہ ہے۔مسٹر ووڈر! مگر تمھیں یہ ملی کہاں۔

نائب جیلر : جناب اس کی چٹائی کے نیچے۔ادھر دو سال سے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

جیلر : (تعجب سے) کیا اس کے ذہن میں کوئی خاص تجویز تھی؟

ووڈر : اس نے اپنی کھڑکی کی ایک سلاخ کو (اپنے انگوٹھے اور انگلی کی چوتھائی انچ کے فاصلے پر رکھ کر بتلاتا ہے) اتنا ریت ڈالا۔

جیلر : میں آج ہی شام کو اسے دیکھوں گا۔اس کا نام کیا ہے؟ مونی؟ میں سمجھتا ہوں کوئی پرانا خرانٹ معلوم ہوتا ہے۔

ووڈر : جی ہاں۔ چوتھی دفعہ کا سزایافتہ ہے۔لیکن ایسے پرانے کھلاڑی کواب تک سمجھ جانا چاہیے تھی (ترحم آمیز حقارت سے) مجھ سے تو یہی کہتا تھا کہ اپنا دل بہلا رہا تھا۔مگران لوگوں کا کیا اعتبار۔ کبھی آدھمکے، کبھی نکل بھاگے۔ ہروقت اس فکر میں رہتے ہیں۔

جیلر : اس کے پاس والے قیدی کا کیا نام ہے؟

ووڈر : اوکلیری۔

جیلر : وہی آئرلینڈ والا قیدی؟

ووڈر : جی ہاں۔اس کے بعد نوجوان فالڈر ہے۔ وہی جس کا نام اول درجے کے قیدیوں میں درج ہے۔اس کے بعد بوڑھا کلپٹن۔

جیلر : ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ وہی نہ جوفلاسفر کہلاتا ہے۔ مجھے ذرااس کی آنکھوں کا حال دریافت کرنا ہے۔

ووڈر : یہ بھی جناب عجیب بات ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کو پہلے ہی سے اس کی خبر ہے اور پھر سبھوں کے دماغ خراب ہوجاتے ہیں۔اس وقت بھی سبھوں کو یہی دھن سوار ہے۔

جیلر : (کچھ سوچ کر) یہ دھن بھی عجیب ہے۔(گھوم کر ورزش کرنے والے قیدیوں کو دیکھتا ہے) یہاں تو کافی سناٹا معلوم ہوتا ہے۔

ووڈر : آج صبح وہ آئرلینڈ والا قیدی۔اوکلیری، اپنے دروازے پیٹنے لگا۔آپ جانئے ایسی ذراذراسی باتوں پر بھی بھنا اٹھتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ لوگ بالکل بے زبان جانور ہی بن جاتے ہیں۔

(بحوالہ کلیات پریم چند، جلد۱۵، صفحہ۲۹۲)

مندرجہ والا مکالموں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دولوگوں کے ترجمے ہیں۔ساتھ ہی ترجموں میں کافی اختلاف بھی ہے کیونکہ ترجمہ کرتے وقت ایک جگہ پریم چند داروغہ کہتے ہیں وہیں دوسری طرف جیلر۔ایک جگہ داروغہ ہے تو دوسری جگہ نائب جیلر۔ایک جگہ گورنر ہے وہیں دوسری جگہ پھر جیلر ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ نہ صرف کرداروں

کے ڈائیلاگ زبان بدلی ہوئی ہے بلکہ بہت حدتک ردوبدل اور کمی بیشی بھی کردی گئی ہے۔

پریم چند کے طبع زاد ڈراموں میں ''کربلا'' ان کا مشہور ڈرامہ ہے۔ یہ ڈرامہ رسالہ زمانہ کانپور میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ میں سات سین ہیں دوسرے میں تیرہ اور تیسرے میں سات چوتھے ایکٹ میں دس اور پانچویں ایکٹ میں چھ سین ہیں۔

ڈرامہ کربلا کا موضوع واقعات کربلا یعنی جنگ کربلا ہے۔ یہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے بلکہ پریم چند نے اس کو پیش کرنے کا نیا طریقہ اپنایا۔ پریم چند کی یہ پہلی کاوش ہے کہ انہوں نے کربلا جیسے عظیم سانحے پر ڈرامہ لکھنے کا قصد کیا۔ پریم چند سے پہلے کسی نے اس موضوع پر کوئی ڈرامہ نہیں لکھا تھا۔ واقعات کربلا کو ڈرامہ کی شکل دینا یہ پریم چند کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں ان کا ادبی شعور نظر آتا ہے کیونکہ پریم چند کے اس ڈرامے کی زبان بہت صاف وسلیس ہے۔ کرداروں کے موقع مکالمے بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں ذیل اس کی مثالیں ملاحظہ کریں۔

علی اکبر: دریا کے کنارے خیمے لگائے جائیں۔ ٹھنڈی ہوا آئیگی۔

عباس: بڑے فراغت کی جگہ ہے۔

حسین: (آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے) بھائی لہراتے ہوئے دریا کو دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس جگہ ایک بار والد مرحوم کی فوج ٹھہری تھی، بابا بہت غمگین تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے۔ نہ کھانا کھاتے تھے۔ نہ سوتے تھے۔ میں نے پوچھا یا حضرت آپ اس قدر بے تاب کیوں ہیں۔ مجھے چھاتی سے لپٹا کر بولے ''بیٹا تو میرے بعد ایک دن یہاں آئیگا اس دن تجھے میرے رونے کا سبب معلوم ہوگا''۔ آج مجھے ان کی وہ بات یاد آتی ہے۔ ان کا رونا بے سبب نہیں تھا اس جگہ ہمارے خون بہائے جائیں گے۔ اسی جگہ ازواج مطہرات قید کی جائیں گی۔ اسی جگہ ہمارے سارے ساتھی شہید کیے جائیں گے۔ اسی جگہ کا وعدہ میرے نانا سے اللہ تعالی نے کیا ہے اور اس کا وعدہ تقدیر کی تحریر ہے۔ (جناب زینب خیمے سے باہر نکل آئی ہیں)

زینب: بھیا، یہ کون سا صحرا ہے کہ دیکھو خون سے کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ بانو بہت گھبرائی ہوئی ہیں اور اصغر چھاتی سے منہ نہیں لگاتا۔

حسین: یہی کربلا کا میدان ہے۔

زینب: (دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر) بھیا میری آنکھوں کے تارے تم پر میری جان نثار

ہو۔ہمیں تقدیر نے یہاں کہاں لا کے چھوڑا۔کیوں کہیں اور نہیں چلتے۔؟

حسین: بہن کہاں جاؤں۔چاروں طرف کے ناکے بند ہیں۔زیاد کا حکم ہے کہ میرا لشکر نہیں اترے۔مجبور ہوں،لڑائی بن بحث نہیں کرنی چاہتا۔

ڈرامے کی دلچسپی کے لیے اس میں ایک رومانی داستان بھی موجود ہے اور شعروشاعری کی چاشنی بھی۔

(شام کا وقت ہے نسیمہ باغیچہ میں بیٹھی آہستہ آہستہ گا رہی ہے)

دفن کرنے چلے تھے جب مرے گھر سے مجھے — کاش تم بھی دیکھ لیتے روزن در سے مجھے
سانس پوری ہو چکی دنیا سے رخصت ہو چکا — تم اب آئے ہوا اٹھانے مرے بستر سے مجھے
کیوں اٹھاتا ہے مجھے میری تمنا کو نکال — تیرے در تک کھینچ لائی تھی یہی گھر سے مجھے
ہجر کی شب کچھ نہیں مونس تھا میرا اے قضا — اک ذرا رو لینے دے مل مل کے بستر سے مجھے

یاد ہے لیکن اب تک وہ زمانہ یاد ہے
جب چھڑایا تھا فلک نے میرے دلبر سے مجھے

(وہب آتا ہے نسیمہ خاموش ہو جاتی ہے)

وہب: خاموش کیوں ہو گئیں یہی سن کر میں آیا تھا۔

نسیمہ: اپنا درد کیوں سناؤں جب کوئی سننا نہ چاہے۔

وہب: شکوہ کرنے کا حق تو میرا ہے۔پھر اسے تم زبردستی چھینے لیتی ہو۔

نسیمہ: تم کہتے ہو تم میرے ہو مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔مجھے ہر دم یہی اندیشہ رہتا ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ گے۔تمھارا دل مجھ سے بیزار ہو جائے گا مجھ سے بے اعتنائی کرنے لگو گے۔یہ خیال دل سے نہیں نکلتا۔تب میں رونے لگتی ہوں اور غمناک خیالات خوفناک صورتیں اختیار کر کے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔مجھے اب گمان ہوتا ہے کہ ہماری بہار بہت تھوڑے دنوں کی مہمان ہے۔میں تم سے منت کرتی ہوں کہ مجھ سے بے اعتمائی نہ کرنا۔ورنہ میرا جگر پاش پاش ہو جائے گا۔مجھے یہاں آنے کے پہلے کبھی نہ معلوم ہوا تھا کہ میرا دل اتنا نازک ہے۔

وہب: میری کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے۔میرے دل میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی ہے

مجھے خیال ہوتا ہے کہ اب دنیا کی کوئی فکر کوئی ترغیب کوئی تمنا میرے دل پر فتح نہیں پا سکتی۔ایسی کوئی طاقت نہیں ہے جس کا میں مقابلہ نہ کرسکوں یہاں تک کہ مجھے اب موت کا بھی غم نہیں ہے۔محبت نے مجھے بےخوف دلیر اور مستحکم بنادیا ہے۔مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت دل کی کیمیا ہے۔

نسیمہ: وہب تمھاری ان باتوں سے مجھے وحشت ہورہی ہے۔شاید کہیں ہماری تباہی سامان ہورہے ہیں۔اب میں تمھیں جانے نہ دوں گی۔مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ کون خلیفہ ہوتا ہے۔اور کون امیر۔مجھے مال وزر جاگیر کی مطلقا تمنا نہیں۔میں تمھیں چاہتی ہوں۔صرف تمہیں.....

آخر میں وہب بیعت نہیں قبول کرتا اور امام حسین کا ساتھ دیتے ہوئے شہید ہوجاتا ہے۔

جس طرح پریم چند کی کہانیوں مناظر قدرت کے منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے اسی طرح انکے ڈراموں میں مناظر فطرت کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔یہ سین ملاحظہ کیجیے۔

حسین: یہ گرمی نگاہیں جلتی ہیں۔پتھر کی مٹانوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔جسم جھلسا جاتا ہے۔بچوں کے چہرے سنولا گئے ہیں۔یہ لامتناہی سفید یہ وسیع ریگستان اس کی کہیں حد بھی ہے یا نہیں۔جن لوگوں نے پیاس کے مارے ہوک ہوک پانی پی لیا ہے ان کے کلیجوں میں درد ہورہا ہے اب تک کوفہ سے کوئی قاصد نہیں آیا۔

پریم چند کی ڈرامہ نگاری میں فن کا معیار مکمل نظر نہیں آتا ہے۔یعنی فنی نقطہ نظر سے ڈرامے میں خامیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ان کے ڈراموں کے کرداروں کے لمبے لمبے ڈائیلاگ سے طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے۔ پریم چند نے اپنے ڈرامے کربلا میں کشمکش اور تصادم کو ناول کے انداز میں بیان کردیا ہے جبکہ ڈرامائی انداز سے پیش کرنے سے وہ عاجز نظر آتے ہیں۔ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈرامے کے فن کے تقاضوں کو مدنظر رکھے بغیر صرف مکالمے لکھ ڈالے ہیں۔اس حوالے سے پروفیسر محمد کاظم اپنی کتاب اردو ڈرامہ تاریخ وتجزیہ میں لکھتے ہیں۔

> ’’۔۔۔۔جس طرح ان کی کہانیوں اور ناولوں میں سے زیادہ تر کی اہمیت موجودہ دور میں باقی نہیں رہی ہے ویسے ہی ان کے ڈراموں کے جو متون ہمارے سامنے موجود ہیں اس کی روشنی میں ان ڈراموں کو مکمل ڈرامہ نہیں کہا جاسکتا۔‘‘

خلاصہ

اصناف ادب میں ڈرامے کو قدیم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ ڈرامہ کی شکلیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ نوٹنکی راس لیلا، رام لیلا، یاترا، نواج کی شکنتلا وغیرہ ڈرامے کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ ہر زمانے میں مذہبی قصوں کو بہت اہمیت رہی ہے۔ اس لیے نواب واجد علی شاہ کے دور میں رہس کی ایجاد ہوئی۔ اسی زمانے میں امانت نے اندر سبھا اسٹیج کر کے عوام کو ڈرامہ کے قریب کیا جس کی شکل منظوم ڈرامے کی تھی۔ اور اسی کو اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے دور میں طالب بنارسی، احسن لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، منشی نرائن پرشاد بیتاب اور امتیاز علی تاج ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی پریم چند بھی ہیں۔ جب ہم پریم چند کا ذکر ڈرامے کے حوالے سے کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ آجاتا ہے۔ یہ پارسی تھیٹر کا زمانہ تھا۔ وہی پارسی تھیٹر جس کو ہم اردو تھیٹر کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔ پارسی تھیٹر نے اردو ڈراموں کو عروج بخشا ہے۔ پارسی تھیٹر کے بارے میں پریم چند نے لکھا ہے کہ ''اگر ڈرامے کی روایت ہے تو صرف پارسی تھیٹر تک محدود ہے۔'' پریم چند نے صرف تین طبع زاد ڈرامے لکھے ہیں۔ اور انگریزی کے چار ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ پریم چند کی ڈرامہ نگاری میں اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے جملے بہت بے ربط محسوس ہوتے ہیں ان کے ڈراموں کے متون کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مکمل ڈرامے نہیں ہیں۔

فرہنگ

عروج	بلندی	پیشکش	کسی چیز کو دکھانا
روایت	دوسرے کی نقل کرنا	متاثر	اثر لینا
منظوم	نظم کیا ہوا	تخلیق	بنانا
جہتیں	گوشے	ارتقاء	اونچائی
شہرت	مشہور ہونا	طفولیت	بچپن
رقص	ناچ	تخلیقی قوت	ایجاد کرنے کی طاقت
تصحیح	درستگی	لحاظ	خیال رکھنا
گفتگو	بات چیت	اہمیت	عزت

نمونہ امتحانی سوالات

اردو ڈراموں کی ابتدائی شکلوں میں سے کوئی دو کو تفصیلاً بیان کیجئے۔

امانت لکھنوی اور اندر سبھا پر اظہار خیال کیجئے۔

پریم چند کے معاصر ڈرامہ نگاروں میں سے کوئی دو ڈرامہ نگاروں کے بارے میں بالتفصیل لکھیے۔

پریم چند کی ڈرامہ نگاری پر روشنی ڈالیے۔

واجد علی شاہ اور رہس پر اظہار خیال کیجئے۔

سفارش کردہ کتب

اردو ڈرامہ تاریخ و تجزیہ	محمد کاظم
اردو ڈرامہ روایت اور تجزیہ	عطیہ نشاط
اردو ڈرامے کا ارتقا	عشرت رحمانی
ڈرامہ نگاری کا فن	محمد اسلم قریشی

4.3 پریم چند سے قبل اردو خطوط نگاری

۱۔۱ تمہید

اس سبق میں آپ خطوط نگاری کے فن سے واقفیت حاصل کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو خطوط نگاری کی ابتداء سے واقفیت حاصل کریں گے۔ ایک زمانے میں خطوط نگاری کا فن اپنے عروج پر تھا لیکن موجودہ دور میں یہ اپنے زوال کی منزل میں ہے۔ اس کے وجوہات سے بھی آپ واقف ہوں گے۔ آپ اس بات سے بھی آگاہی حاصل کریں گے کہ پریم چند سے قبل خطوط نگاری کا فن کس طرح پروان چڑھا اور کون کون سے خطوط نگار نے اس فن کو آگے بڑھانے میں اپنی خدمات دیں۔ اردو نثر کے فروغ میں اردو خطوط نے کیا اہم رول ادا کئے، اس سے بھی آپ واقف ہوں گے۔

۱۔۲ مقاصد

اس سبق کے مطالعے سے آپ یہ سمجھ پائیں گے کہ:

- ☆ خط لکھنا ایک فن ہے
- ☆ اردو میں اس کی ابتدا کس طرح ہوئی
- ☆ کون کون سے خطوط نگار نے اسے پروان چڑھایا۔
- ☆ پریم چند سے قبل خطوط نگاری کی کیا صورتِ حال تھی۔
- ☆ غیر افسانوی اردو نثر کے فروغ میں خطوط نے کیا اہم کارنامے انجام دیے۔

۱۔۳ خطوط نگاری کا فن

خطوط یا مکتوب، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''لکیر''، ''تحریر'' یا ''سطر'' کے ہیں۔ فارسی میں اسے

''نوشہ''، ''رقعہ''، ''نامہ'' اور ہندی میں اسے ''پتر'' کہتے ہیں۔خط کثیر کا معنی لفظ ہے اس کے معنی اگر لکیر، تحریر، سطر ،مکتوب، نامہ، رقعہ، نوشہ کے ہیں تو دوسری طرف کان سے منسلک داڑھی کے اس حصّے کو بھی خط کہتے ہیں جسے حرفِ عام میں قلم کہا جاتا ہے۔اس کے معنی شکل وصورت کے بھی ہیں اور حلیہ کے بھی۔علمِ ہندسہ میں اس لکیر کو کہتے ہیں جس کا طول ہو مگر غرض نہ ہو۔علم جغرافیہ میں خط تقسیم کرنے والی لکیر کے لئے مستعمل ہے جسے خط استوا، خط سرطان اور خطِ جذی کہتے ہیں۔ریاضی کی اصلاح میں اس لکیر کو کہتے ہیں جس میں طوالت ہو۔ادب میں خط یا مکتوب ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس میں معلومات، احساسات و کیفیات، فکر و خیالات کو پیغام کی صورت میں دوسروں تک لکھ کر پہنچائے جاتے ہیں۔خط بنیادی طور پر تبادلہِ خیال کا ذریعہ ہے جس میں خط لکھنے والا خط نگار (مکتوب نگار) اور جس کو لکھا گیا ہے اسے مکتوب الیہ کہتے ہیں۔چوں کہ مکتوب نگار اپنے دل کا حال مکتوب الیہ کو دل کھول کر لکھتا ہے اس لئے عربی زبان میں یہ مثل مشہور ہو گیا ہے کہ ''المکتوب نصف الملاقات'' یعنی مکتوب آدھی ملاقات ہوتے ہیں۔خطوط نگاری کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ گفتگو یا ملاقات کا نعم البدل ہے۔ہمارے بعض ناقدین نے کط کو آدھی ملاقات کہنے کے بجائے پوری ملاقات کا نام دیا ہے اور خیال طاہر کیا ہے کہ اس میں جسمانی اور مادی واسطے معدوم ہو جاتے ہیں اور روحوں کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔

خط کی ایک خصوصیت ہیت ہوتی ہے جو مندرجہ ذیل اجزاء پر محیط ہوتی ہے:

مکتوب نگار کا نام اور پتہ، تاریخ تحریر، نشانِ مجاریہ، مقدمہ (SUBJECT)، حوالہ نشان، القاب، اداب، نفسِ مضمون، خاتمہ، مکتوب نگار کا دستخط، مکتوب الیہ کا نام اور پتہ خط کے کئی اقسام بھی ہیں مثلاً: نجی و شخصی خطوط، دفتری یا سرکاری خطوط، کاروباری خطوط، تجارتی خطوط، اخباری خطوط، مراسلے، ادبی خطوط، عشقیہ خطوط اور سیاسی خطوط وغیرہ ۔مذکورہ بیان کردہ جزاء مکتوبات کی نوعیت پر منحصر کرتے ہیں۔ضروری نہیں کہ تمام اجزاء ہر خط میں پائے جائیں۔بعض میں سب کے سب ہو سکتے ہیں اور بعض میں چند کا اہتمام ہوسکتا ہے۔غور کیا جائے تو خط دو افراد کے درمیان ترسیل خیالات کا وسیلہ ہوتا ہے جس میں ایک شخص دوسرے کو اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط دیگر قسم کے خطوط سے مختلف ہوتے ہیں کہ ان میں عملی اور ادبی باتیں ہوتی ہیں۔فکر انگیز علمی اور ادبی مسائل پر بخشش ہوتی ہیں جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔مرزا غالب کے بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں علمی و ادبی بخشش ملتی ہیں ۔کسی میں الفاظ کے معنی اور اس کے استعمال کی صورت بیان کی گئی ہے تو بعض میں اشعار کی اصلاح اور اس کی تفہیم کی

گئی ہے۔کہیں نثر کی قسمیں بیان کی گئی ہیں تو کہیں حقائق ومعارف کے فلسفیانہ مباحث ہیں۔غرض علمی وادبی خطوط کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔اس لئے دیگر قسم کے خطوط سے زیادہ ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور عالموں کے خطوط خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔اردو میں ایسے مکتوب نگار موجود ہیں جن کے ادبی خطوط میں فکری پہلو پوشیدہ ہیں۔پروفیسر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ:

''ادبی خطوط میں اس (ادیب) کی ادبی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے ۔متعدادبی مسائل پر اس کی منحصر رائے معلوم ہوتی ہے۔بعض ادبی خطوط میں تنقید وتحقیق کے جواہر پارے بھرے ہوتے ہیں۔کسی ادیب کے ذہنی ارتقاء، ادبی سفر اور اس کی تصانیف کو سمجھنے میں اس کے مکاتیب سے جو مدد ملتی ہے، وہ سب سے مستند تحقیقی مآخذ ہے''۔

مقدمہ حرفِ شیریں۔مرتبہ رام لعل۔ص ۲۱۔۱۹۹۰

خطوط کی ادبی، سوانحی اور تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔وہ تمام محاسن جو ایک اچھے فن پارے میں موجود ہوتے ہیں، خطوط میں پائے جاتے ہیں۔خطوط دوریوں میں قربت کا احساس دلانے والا فن ہے۔یہ وہ فن ہے جو مکتوب نگار کی شخصیت اور اس کی نفسیات کو پیش کرنے میں پوری طرح معاون ہوتا ہے۔اس لئے غالب کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ''دل کا معاملہ اشعار میں اتنا نہیں کھلتا جتنا خطوط میں''۔مولوی عبدالحق نے بھی خطوط کو انسانی سیرت کو ظاہر کرنے کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ''مکتوب دلی حالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے''۔خورشید الاسلام نے بھی خطوط کے بارے میں لکھا ہے کہ ''خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنتے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دنیا کا لطف ہے''۔

اگر غور کیا جائے تو خطوط نگاری کا فن اپنے جملہ خصوصیات کے اعتبار سے دل کے پوشیدہ اسرار کو ظاہر کرنے کا فن ہے۔مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان فاصلہ ہونے کے باوجود خود کلامی اور سرگوشی کے سبب وصال کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔خیریت کا تبادلہ، اس فن کو پراسرار بھی بناتا ہے اور معتبر بھی۔اکیسویں صدی کے آتے آتے اس فن پر زوال کا سایہ منڈرانے لگا۔جدید ترین الیکٹرانک سہولیات نے اس فن کو بہت نقصان پہنچایا۔انفارمیشن ٹیکنالوجی نے جیسے جیسے اپنے پاؤں پسارے ہیں اور پوری دنیا کو ایک مٹھی میں سمیٹ دیا ہے، اس کا اثر اس فن پر سب

سے زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔خط لکھنا اور لکھنے میں اپنے جذبات و خیالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا،،خط کے جواب کا انتظار کرنا اور جلد جواب حاصل کرنے کی امید میں بے چین رہنا، گویا اب ختم ہو چکا ہے۔موبائل کی سہولیات سے سے اب ساری باتیں ہو جاتی ہیں،اس لئے بے چینی اور تڑپ کی کوئی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوتی۔خطوط نگاری کے فن پر زوال ہے تاہم جو خطوط ادیبوں،شاعروں،دانشوروں اور عالموں نے لکھے ہیں اور جن کے مجموعے موجود ہیں ان کی حیثیت اج بھی مسلّم ہے اور ادب میں اس کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

۱۔۴ اُردو میں خطوط نگاری کی ابتداء:

کسی بھی صنف یا فن کی ابتداء کے سلسلے میں حتمی تاریخ کا تعین مشکل کام ہے۔اس لئے اکثر و بیشتر اصناف یا علوم وفنون کے آغاز کے تعلق سے مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔خطوط نگاری کی ابتدء کے سلسلے سے بھی علمائے ادب اور ادبی مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اردو میں خطوط نگاری کی ابتدا کے تعلق سے بھی آراء دیکھنے کو ملتی ہیں ،لیکن اس بات پر ناقدین اور محققین متفق ہیں کہ اردو میں خطوط نگاری کی ابتداء انیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں ہوئی۔سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

> ''اردو خطوط نگاری کا اولین دور فارسی انداز سے متاثر تھا۔وہی القاب و آداب،وہی سرنامے،وہی عنوان،وہی اختتامیے،وہی رنگِ انشا،وہی مادی تکلف،وہی رنگینی مگر انیسویں صدی کے ربع اوّل میں سادگی کا کچھ میلان پیدا ہوا''۔
>
> رسالہ مکاتیب نمبر۔جلد۔۱۔ص۔۲۷

انیسویں صدی کے نصف میں جب فارسی زبان پر زوال آیا تو اردو نے اس کی جگہ لے لی۔اس دور میں اردو خطوط نگاری کا کا باقاعدہ آغاز ہوا۔مرزا غالب کو اردو خطوط نگاری کا موجد سمجھا جاتا ہے تاہم ہمارے محققین نے غالب سے پہلے بھی خطوط دریافت کئے ہیں اران پر اظہارِ خیال بھی کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ غالب کے خطوط کا اسلوب ماقبل کے خطوط میں نہیں ملتا۔خواجہ احمد فاروقی نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ

> ''رجب علی بیگ سرور اور غالب سے پہلے شاکر اور شکوہ الملک ثانی کے

علاوہ تپش، راسخ، قتیل، پاس آوری اور تاثیر عظیم آبادی، اردو انشا کے
میدان میں قدم رکھ چکے تھے اور انھوں نے اردو میں خطوط بھی لکھنا شروع
کر دیے تھے''

مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء۔ص۔۷

یہ آج بھی تحقیق طلب ہے کہ اردو میں پہلا خط کس نے تحریر کیا۔ثریا حسین، حامد حسن قادری، خلیق انجم، مالک رام وغیرہ کی رائے ایک جیسی نہیں ہے۔ثریا حسین، افتخار الدین علی خاں شہرت کو پہلا مکتوب نگار خیال کرتی ہیں۔خواجہ احمد فاروقی شاکر، شکوہ الملک ثانی، تپش، راسخ، قتیل یاس اور تاثیر کو ابتدائی مکتوب نگار خیال کرتے ہیں۔اس سلسلے میں گارساں دتاسی کا بھی نام لیا جاتا ہے۔بعض رجب علی بیگ سرور کو تو بعض غلام غوث بے خبر کو تو بعض راجہ رام موہن رائے کو اردو کا پہلا مکتوب نگار خیال کرتے ہیں۔عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ

''اردو کا پہلا دستاب شدہ خط ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء کا ہے جس کے کاتب والدہ جاہ
بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے حسام الملک بہادر ہیں۔انہوں نے یہ خط اپنی
بڑی بیٹی بھابھی نواب بیگم صاحبہ کو لکھا تھا''۔

مکاتیبِ احسان۔ص ۳۷

مذکورہ تحقیق پر اعتبار کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رجب علی بیگ سرور اور مرزا غالب سے پہلے بھی اردو خطوط نگاری کی روایت موجود تھی۔رجب علی بیگ سرور کے خطوط کا مجموعہ " انشائے سرور 1886 میں نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوا تھا۔غلام غوث بے خبر کے مکاتیب "انشائے بے خبر "اور " فغانِ بے خبر" حسبِ ترتیب 1938 اور 1940 میں اگرہ اور الہ آباد سے شائع ہوئے۔غلام غوث بے خبر مرزا غالب سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن انہوں نے مرزا غالب سے پہلے اردو میں خط لکھا۔غالب اور بے خبر کے درمیان بھی خط و کتابت ہوئے تھے۔مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فارسی زبان کا رواج کم ہوا اور اردو کو مقبولیت ملی تو شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی فروغ ملا۔مرزا غالب سے قبل جو مکتوبات اردو زبان میں ملتے ہیں انکی عبارت عموماً فارسی آمیز اور مقفٰی و مسجع ہیں۔تکلفات سے مزین مکتوبات کی تحریریں فارسی خطوط کا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔القاب و آداب کا وہی طریقہ جو فارسی میں رائج تھا' اردو کے ابتدائی خطوط میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس دور میں واجد علی شاہ کے ذریعے اپنی بیگمات کو لکھے گئے خطوط بھی اہمیت

کے حامل ہیں۔اودھ کے نواب واجد علی شاہ کی تحریر بھی فارسی آمیز اسلوب ہی سے عبارت ہے۔گویا غالب سے قبل جو مکتوبات ہمیں ملتے ہیں وہ اردو میں تو ہیں لیکن انکی زبان اور اندازِ بیان پر فارسی کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔مقفّی و مسجع سے عبارت بوجھل نظر آتی ہے۔رجب علی بیگ سرور کے خطوط کے یہ انداز ملاحظہ کریں

''بھائی جس دن سے یہاں منڈ پاؤلٹا ہے،سارے شہر سے کھانا پینا چھٹا ہے۔فلک نے لکھنؤ کی خاک آڑائی ہے،کیا لکھوں جو ایذا دکھائی ہے۔نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ہے ہر دم جان کا دغدغہ زلیت باقی ہے اور جتنے مل جائیں گے،یہ کہانی زبانی سنائیں گے''

(انشائے سرور۔ص۔۲۰۔نول کشور پریس لکھنؤ۔اشاعت پنجم۔۱۹۱۶۔)

''میر کرم علی صاحب کو سلام اور یہ پیغام پہنچے۔مرزا صاحب کی محبت خط لکھوائی ہے وگرنہ آج کل دوات بھٹی ہے قلم کی زبان جلی جاتی ہے''۔

(ایضاً ص۔۲۰)

یہی صورت غلام غوث بے خبر کے خطوط کی بھی ہے۔ان کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:-

''خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں محبوب صورت،مرغوب سیرت،حسنِ شمائل ، پسندیدہ خصائل،مہم رسا، ذہن وذکا،عقلِ سلیم،طبیتِ مستقیم،علمِ مفید، بختِ سعید،تقریر کی فصاحت،تحریر کی بلاغت، اخلاقِ تام،مقبولیتِ عام، صولت وثروت،قدرتِ حکومت۔۔۔''

(انشائے بے خبر۔مرتبہ اسد مرتضٰی بلگرامی،علی گڑھ۔ص۱۰)

اس دور میں مرزا غالب کی خطوط نگاری نے اسلوب کے اعتبار سے بہت اہم کردار ادا کیا۔ان کی زندگی میں ''عودِ ہندی'' شائع ہوا اور انتقال کے انیس دنوں بعد ''اردوئے معلٰی'' کی اشاعت ہوئی۔ان کے علاوہ بھی کئی مجموعے شائع ہوئے۔مرزا غالب نے بقولِ حالی 1850ء سے اردو میں خط لکھنا شروع کیے۔بعض دیگر محققین نے 48-1847ء اور 1849ء بھی بتائے ہیں تاہم غالب کے مکتوبات کا انداز اور اس کے فکری پہلو نے مکتوبات نگاری کے ذیل میں ایک نئی پیش قدمی کی۔القاب وآداب اور تکلفات کو جو رسماً چلے آئے تھے،ترک کر دیا اور شوخی اور

ظرافت اور بے تکلفی کا ایسا انداز اختیار کیا جو ان سے قبل کسی کے مکتوب میں موجود نہیں تھا۔ انہوں نے ایک خط میں اپنے اس انداز کے لیے خود کو موجد قرار دیا اور مراسلے کو مکالمہ کہا۔

حاتم علی مہر کو انہوں نے لکھا تھا کہ:-

''میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

(اردوئے معلیٰ۔ص258)

مرزا ہرگوپال تفتہ کو بھی انہوں نے لکھا تھا کہ:-

''بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔''

(اردوئے معلیٰ۔ص38)

مرزا غالب کے خطوط کا یہی بے تکلفانہ انداز خطوط نگاری کے ذیل میں ایک نیا باب ہوا کرتا ہے۔ مرزا غالب کے انداز و اسلوب کو اپنا کر سلیس و سادہ روش اختیار کرنے والوں میں سرسید، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، وقار الملک، محسن الملک، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی اور علامہ شبلی نعمانی نے خطوط لکھے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو مذکورہ خطوط نگاروں کے یہاں سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کو فروغ دیا گیا۔ بامقصد اور کارآمد گفتگو کو اہمیت دی گئی۔ قافیہ پیمائی، تکلفات، تصنعات سے اجتناب برتا گیا۔ شگفتگی اور ظرافت کے عناصر سے مکتوب کی تحریر کو پر تکلف بنایا گیا۔ اردو کے ابتدائی دور کے خطوط میں ہمیں یہی دو رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اول وہ جن میں فارسی کے اثرات زیادہ ہیں اور ایسی عبارتیں مقفٰی، مسجع اور تکلفات سے بھری ہوئی ہیں۔ دوم وہ ہیں جن میں بے تکلفی ہے، سادگی ہے اور دلی جذبات کا فطری اظہار ہے اور خوش دلی کا بھرپور اظہار ہے۔ ابتدائی خطوط کے یہ دو رنگ اپنے اپنے انداز سے اس دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تہذیبی اور تاریخی عناصر کو پیش کرتے ہیں۔ زبان و بیان کے تغیر و تبدل کی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ علمی، ادبی اور فلسفیانہ مباحث کے آثار بھی ہمیں ان خطوط میں ملتے ہیں جن سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے علمی و ادبی شوق و جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب نے خطوط نگاری کو جو اسلوب اور ذہن عطا کیا اسی کی بدولت یہ صنف اور فن کے درجے پر پہنچی۔

۵۔۱ پریم چند سے قبل اردو خطوط نگاری

اوپر غالب کے ان معاصرین مکتوب نگار کا ذکر کیا جا چکا ہے جنھوں نے ان کے اثرات قبول کیے اور خطوط نگاری کو ایک سمت و رفتار عطا کی۔ یہ سلسلہ یہیں نہیں تھما بلکہ ان کے بعد آنے والے ادیب، شاعر، عالم اور دانشور نے بھی اس صنف کو نئی منزل تک پہنچانے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ پریم چند سے قبل اور مرزا غالب کے بعد خطوط نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ یہاں مختصراً چند کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس دور میں خطوط نگاری کی کیا صورتِ حال ہے؟

سرسید احمد خاں، جو اپنے دور کے ایک بڑے مخلص، اصلاح پسند، علم پرور، ادیب اور دانشور تھے۔ انھوں نے اپنے مقصد کی حصولیاتی کے لئے اپنے بہت سے معاصرین کو خط لکھے۔ ان کے خطوط کے مجموعے ''انتخاب مکاتیب سرسید'' اور ''سرسید کے خطوط'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ''خطوط سرسید'' کو راس مسعود نے ترتیب دے کر بدایوں سے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ ''انتخاب مکاتیب سرسید'' جس میں شبلی اور اقبال کے نام مکتوبات ہیں۔ اس مجموعے کو شیخ عطا اللہ نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ ''سرسید کے خطوط'' کے نام سے وحید الدین سلیم نے پانی پت سے شائع کیا جس پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بھی سرسید کے دستیاب شدہ خطوط شائع ہوئے ہیں۔ سرسید نے اپنے خطوط کی زبان کو بالکل سادہ اور سلیس رکھا اور فطری اندازِ بیان کو اختیار کیا۔ انہوں نے محمد حسین ازاد یا حالی کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بار بار تاکید کی گئی ہیکہ اپنی تحریر کو سہل آسان اور عام فہم بناؤ اور فطری اندازِ کلام اختیار کرو۔ اس لئے ان کے خطوط کی فضا بڑی دلچسپ اور مانوس نظر آتی ہے۔ سرمور گزٹ کے مدیر سراج الدین احمد کو ایک خط میں لکھتے۔

> ''بھائی سراج الدین تمھارا خط پہنچا۔ ہم کو خدا نے دُنیا میں اسی لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ بُرا کرنے والے کی بُرائی سے ہم کو کیا کام ہے۔ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھی کھلی رکھنی چاہیے۔ بدوں یا بد۔ پر افسوس کرنا چاہیے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں، ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہئے۔
> (خطوط سرسید۔ ڈاکٹر سر راس مسعود۔ ص۔ ۱۶۱)

سرسید کے خطوط مختلف موضوعات پر اپنے معاصرین کو لکھے گئے ہیں جن میں علمی و ادبی باتوں کے علاوہ تہذیبی ،تاریخی اور مذہبی کشمکش کا بھر پور اظہار ملتا ہے ۔الطاف حسین حالی ،سرسید کے رفیق کار تھے اور علمی اور ادبی اعتبار سے اردو ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے ۔اردو میں تنقید کی ابتداء کا سہرا انہیں کے سر ہے ۔اردو شاعری اور نثر کو فروغ دینے میں ان کی خدمات بہت ہیں ۔انہوں نے بھی اپنے معاصرین کو متعدد خطوط لکھے ۔ان کے خطوط کو دو جلدوں میں ترتیب دے کر ۱۹۲۵ء میں پانی پت سے شائع کیا گیا تھا۔لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا پھر محمد اسمعیل پانی پتی نے اسی نام سے اردو مرکز لکھنؤ سے شائع کیا جس پر سال اشاعت درج نہیں ہے تاہم اندازہ ہے کہ یہ ملک کی آزادی کے بعد ہی منظرِ عام پر آیا ہوگا۔

حالی کے خطوط ان کے احباب اور معاصرین، غالب وسرسید خوس حالی اور مدرستہ العلوم علی گڑھ پر روشنی پڑتی ہے ۔حالی قناعت پسند اور عجز وانکسار کے حامی تھے تعریف وتوصیف سے پرہیز کرتے تھے ۔خصوصاً اس وقت جب خود ان کی تعریف کا پہلو نکلنے کا اندیشہ ہو۔مولوی عبدالحق نے حالی کے خطوط کی روشنی میں ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے اور بہت سے ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے ۔جو عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں ۔غالب کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے ان کے خطوط میں جابجا ادبی اور علمی مباحث ملتے ہیں ۔خواجہ احمد فاروقی نے حالی اور شبلی کے خطوط کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> ''حالی کے خطوں میں کہیں نہ کہیں ادبی نکات ہیں ۔ہاتھ اور ہات کی بحث ہے ،تکان کے لفظ پر غور کیا ہے ۔قوافی کے اصول بتائے ہیں ۔غالب اور میر انیس کی ملاقات کو غلط ثابت کیا ہے لیکن یہ ہریالی کہیں کہیں ہے ۔بعض جگہ بالکل چٹیل میدان ہے ۔شبلی کے خطوں میں جو ادبی چاشنی ،موسیقی اور مصوری ہے وہ ان کے یہاں ناپید ہے ۔وہ حسین دیوانگی اور وہ کشمکش جو آسودگی سے تعبیر کی جاسکتی ہے وہ حالی کے یہاں نہیں ملتی ۔''
>
> (مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخی ارتقاء۔ص ۔۳۰۲)

ملک کی تہذیبی ساعمیت اور قومی رواداری پر جابجا ان کے خطوط میں ڈالی گئی ہے ۔اپنے اسلوب کے اعتبار سے حالی ویسی رنگ آمیزی نہیں کر پائے جیسی شبلی نے کی تاہم ان کی منشا ،ان کی نیت ،ان کے ارادے ، میں کوئی جھول

نہیں تھا۔ وہ صاف گو تھے اور ایک مثبت ذہن رکھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی پر انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ

''جو لوگ ہندو اور مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، برہمن ہوں یا آریا''۔

(مکتوباتِ حالی۔ جلد اوّل۔ ص۔ ۸۴)

اس دور کے تیسرے اہم مکتوب نگار علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ اردو ادب میں شبلی کی حیثیت کئی اعتبار سے ہے۔ وہ مورخ، محقق، ناقد، شاعر، سوانح نگار، ادیب اور عالم دین کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ہیں ''مکاتیب شبلی'' (دو جلدوں میں) اور ''خطوط شبلی'' ہیں۔ ''مکاتیب شبلی'' میں شامل خطوط احباب و اقارب اور بعض معاصرین کو لکھے گئے ہیں جبکہ ''خطوط شبلی'' میں شامل اس دور کی تعلیم یافتہ دو بہنوں عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی کے نام لکھے گئے ہیں اسے محمد امین تبریزی نے ۱۹۳۵ء میں ترتیب دیا۔ شبلی کے خطوط میں بڑی جدّت، تازگی اور توانائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لطافت اور بے ساختگی ان کے اسلوب کا اہم پہلو ہے۔ جہاں بھی علمی اور ادبی مباحث کا اظہار کیا ہے وہاں غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا ہے۔ ان خطوط سے نہ صرف شبلی کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کے افکار و خیالات کی تفہیم بھی ہوتی ہے اس دور میں مسلم عورتوں کا دنیاوی تعلیم حاصل کرنا اور خود کفیل ہونا سماجی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں تھا مگر شبلی کے ہر شعبے میں ان کی ترقی اور آزادی کے خواہاں تھے۔ عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دینوی علوم اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے''

(خطوط شبلی۔ محمد امین زبیری۔ ص۔ ۴۱۔ ۱۹۲۶)

مذکورہ خطوط کی تحریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی عورتوں کی ہمہ جہت ترقی اور معاشرتی زندگی میں ان کی

شرکت داری کے حامی تھے۔ان کے بہت سے خطوط میں زبان و بیان میں اور لغت کی لغزشوں پر اصلاح دی گئی ہے ۔کہیں وہ کسی لفظ کے برتنے ،موقع محل پر استعمال کرنے یا خلافِ لغت ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کہیں محاوروں کے برمحل استعمال اور اس کے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔گویا اس سے شبلی کی زبان پر گرفت اور زبان دانی کا پتہ چلتا ہے۔ان کے خطوط میں عالمانہ سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے جس میں ظرافت کے پہلو بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔شبلی کے خطوط عام طور پر مختصر اور جامع ہیں اس اختصار اور جامعیت میں جو زبان کی تازگی و شگفتگی، بے تکلفی اور بے ساختگی ملتی ہے وہ ان کے کسی معاصرین کے یہاں نہیں ملتی۔

۶۔۱ خلاصہ

انیسویں صدی میں اردو میں جن اصناف کی داغ بیل پڑی ان میں خطوط نگاری بھی ہے۔انیسویں صدی کے ابتدائی دوسرے تیسرے دہے میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ابتدائی خطوط فارسی آمیز زبان میں لکھے گئے لیکن مرزا غالب کے تصّرف سے صدی کے نصف میں تبدیلی واقع ہوئی اور تکلّفات سے آزادی ملی۔مرزا غالب نے کئی اعتبار سے اس صنف کو فن کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔زبان میں سادگی اور دلکشی پیدا کی۔خط کا بنیادی کام خبر رسانی ہے لیکن غالب نے اسے صنف ملاقات کا حامل بنا دیا۔دل کے بوجھ کو کم کرنے اور ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے جو طریقے غالب نے ایجاد کیے وہ اس دور میں کسی کے حصّے میں نہیں آیا۔پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور یکے بعد دیگر مکتوب نگاروں کا قافلہ وجود میں آ گیا۔سرسید،محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، وقار الملک،محسن الملک،الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی،شبلی نعمانی وغیرہ نے اس صنف کو اعتبار بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ان خطوط نے اردو زبان کے لئے زاویے تراشے۔ناقدین و محققین نے ادبی و لسانی، تاریخی و تہذیبی پہلو سے اس کا جائزہ لیا اور اردو کی غیر افسانوی نثر میں اس کا مقام و مرتبہ متعین کیا۔مکتوب نگاری نے اپنے دور کی سچی آواز بننے میں اہم رول ادا کیا۔حقائق کو سامنے لانے میں بڑی پیش قدمی کی اور ضمیر کی سچی تصویر کشی کی۔دل کے معاملے کو ادیبوں ،شاعروں اور دانشوروں نے اپنے خطوط میں بیان کئے وہ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ان خطوط میں جو علمی اور ادبی گفتگو کی گئی ہے وہ بھی ہمارے ذہن و دل کو منور کرتے ہیں۔

۷۔۱ فرہنگ

طول	:	لمبائی
عرض	:	چوڑائی
خط استوا	:	وہ فرضی لکیر جو زمین کے گرد قطبین کے درمیان تسلیم کی جاتی ہے
مکتوب نگار	:	خط لکھنے والا
مکتوب الیہ	:	جس کے نام خط لکھا گیا ہو
نعم البدل	:	اچھا بدلا
ترسیل	:	روانہ کرنا/ بھیجنا
محیط	:	احاطہ کرنے والا
محاسن	:	خوبی ،اچھائی
معاون	:	مددگار
اسرار	:	بھید/ راز
مقفّی	:	قافیہ دار
مسجّع	:	قافیہ سے سجایا ہوا
حسن شمائل	:	اچھی خصلت
فہم	:	سمجھ
رسا	:	پہنچ
ذہن وذکا	:	ذہانت
بختِ سعید	:	نیک بخت
تصنّات	:	بناوٹ، تصنّع کی جمع
اجتناب	:	پرہیز کرنا

تغیر وتبدّل : فرق/تبدیلیاں

دستیاب : حاصل ہونا

رواداری : پاس ولحاظ

اتحاد و یکجہتی : ملّت اور اتفاق

تصّرف : استعمال/عمل

۸۔۱ نمونہ سوالات

۱۔ خطوط نگاری کسے کہتے ہیں

۲۔ مکتوب نگاری کے کون کون سے اجزاء ہیں؟

۳۔ نوعیت کے اعتبار سے خطوط کی چند قسمیں بتائیں؟

۴۔ مرزا غالب سے قبل کو مکتوب نگار کے نام بتائیں؟

۵۔ مرزا غالب کے خطوط کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟

۶۔ پریم چند سے قبل خطوط نگاری کی کیا صورتِ حال تھی؟

۷۔ حالی اور شبلی کی مکتوب نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کریں؟

۹۔۱ سفارش کردہ کتابیں

۱۔ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء: خواجہ احمد فاروقی ۲۰۱۳ء

۲۔ اردو زبان میں ادبی خطوط نگاری کی روایت: بیگم نیلوفر ۲۰۰۷ء

۳۔ اُردو خطوط ۔شمس الرحمٰن ۔۱۹۹۷ء

۴۔ نقوش خطوط نمبر۔محمد طفیل۔۱۹۶۸ء

۵۔ ادبی نثر کا ارتقاء۔شہناز انجم ۔۲۰۰۸ء

۶۔ غیر افسانوی اردو نثر۔عطیہ رئیس ۔۲۰۰۸ء

پریم چند کے خطوط

سبق کی ساخت:

4.1 تمہید

4.2 مقاصد

4.3 پریم چند کے معاصر خطوط نگار

4.4 پریم چند کے خطوط

4.5 خلاصہ

4.6 فرہنگ

4.7 نمونۂ امتحانی سوالات

4.8 سفارش کردہ کتابیں

4.1 تمہید

منشی پریم چند اردو کے مایہ ناز ادیب اور فکشن نگار ہیں۔ انکے ناول اور افسانے اردو اور ہندی میں بہت مقبول ہیں۔ پریم چند نے اپنے دوستوں اور ہم عصروں کو خطوط لکھے اور اُن خطوط میں اپنی ذاتی، ادبی، سیاسی اور معاشی ومعاشرتی زندگی کو پیش کیا۔ اس سبق میں آپ پریم چند کی خطوط نگاری سے واقفیت حاصل کریں گے۔ ساتھ ہی پریم چند کے معاصر خطوط نگاروں کی مکتوب نگاری سے بھی واقف ہوں گے۔ آپ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ پریم چند نے اپنے دوستوں کو خطوط میں کن کن مسائل سے آگاہ کیا ہے اور خطوط میں ان کی نثر کا اسلوب کیسا ہے۔ پریم چند کے معاصرین کی خطوط نگاری اور ان کے معاصرین کے خطوط نگاری میں کیا فرق ہے یعنی اسلوب اور موضوع ومواد کی سطح پر ان میں کیا۔ چیز مشترک ہے اور کیا مختلف۔ آپ اس سے بھی واقف ہوں گے کہ پریم چند کے مکتوب الیہ

کون لوگ تھے اور ادبی اور سماجی اعتبار سے ان کی حیثیت کیا تھی۔ آپ کو اس بات سے بھی آگاہی ملے گی کہ پریم چند نے خطوط کے فن کو کس سطح پر برتا ہے اور ان کے خطوط میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور کون کون سے نقائص ہیں۔ پریم چند سے قبل کی مکتوب نگاری کے تعلق سے آپ گزشتہ سبق میں پڑھ چکے ہیں۔ اس سبق میں آپ پریم چند کی خطوط نگاری پر پیش روؤں کے اثرات سے بھی واقف ہوں گے۔

4.2 مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ یہ سمجھ پائیں گے کہ

- ☆ پریم چند کے خطوط کی ادبی حیثیت کیا ہے؟
- ☆ پریم چند کے خطوط کی لسانی اہمیت کیا ہے؟
- ☆ پریم چند کے خطوط کے مضامین کیا ہیں؟
- ☆ پریم چند کے معاصرین اور ان کی خطوط نگاری کا معیار و مقام کیا ہے؟
- ☆ اردو خطوط نگاری میں پریم چند کی ادبی حیثیت کیا ہے؟
- ☆ پریم چند کے دور میں مکتوب نگاری کے فن کی کیا صورت حال تھی؟
- ☆ پریم چند نے خطوط نگاری کے فن کو مستحکم کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟

4.3 پریم چند کے معاصر خطوط نگار

پریم چند سے قبل جن مکتوب نگاروں نے اس فن کو نئی معنویت دینے کی کوشش کی تھی، اُن کی پیش قدمی سے آنے والے دور میں خطوط نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی اور نجی و ادبی ضرورتوں کے تحت خطوط کی اشاعت میں دلچسپی لی گئی۔ پریم چند کے عہد میں ایسے بہت سے ادیب سامنے آئے جنہوں نے خطوط کے مجموعے شائع کئے۔ ان خطوط کے مجموعوں کی اشاعت سے ان کی زندگی، شخصیت اور ان کے ادبی افکار و خیالات سامنے آئے اور اس دور کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کے مخفی پہلوؤں پر سے بھی پردہ اٹھا۔ یہاں آپ ایسے ہی چند منتخب مکتوب نگاروں سے واقف ہوں گے جن کو دیگر ادبی حیثیتوں کے علاوہ مکتوب نگاری میں بھی شہرت حاصل ہوئی۔ ان تمام مکتوب نگاروں کا

تعلق پریم چند کے عہد سے ہی ہے اور یہ اُن کے قریبی معاصرین ہیں۔ان میں سے خصوصاً مولوی عبدالحق، علامہ اقبال، نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری اور سید احمد شاہ پطرس بخاری کا ذکر یہاں کیا جائے گا۔

مولوی عبدالحق (1872-1961):

مولوی عبدالحق ''بابائے اردو'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔اردو زبان وادب پر ان کی تحقیق وتنقید سے آنے والی نسلوں کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔ اردو میں انہیں ایک زود نویس مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ان کے ہزاروں خطوط دستیاب ہو چکے ہیں جو مجموعوں کی شکل میں منظر عام پر آئے۔مندرجہ ذیل ان کے مجموعوں کی فہرست دیکھیں۔

۱۔ مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم محمد امامی۔اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، 1960

۲۔ اردوے مصفی، مرتبہ ہاشمی فرید آبادی۔1961

۳۔ مکاتیب عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی۔اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی۔1963

۴۔ مکتوبات بابائے اردو بنام پیر حسام الدین راشدی۔1964

۵۔ Letters by Moulvi Abdul Haq. 1966

۶۔ خطوط عبدالحق مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی۔1967

۷۔ عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام مرتبہ افضل العلماء۔ڈاکٹر عبدالحق۔1968

مذکورہ مجموعوں کے علاوہ بھی ان کے خطوط کے مجموعے شائع ہوئے ہیں جنہیں مختلف ادیبوں نے ترتیب دیا ہے۔ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے انکشاف میں اس فن سے خوف فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو لطیف مزاج اور شائستہ طنز کے ساتھ بے تکلفی سے پیش کیا ہے۔ان کے خطوط میں جہاں ایک طرف ادبی فضا بندی کا احساس نمایاں ہے تو وہیں دوسری طرف سادگی بھی ملتی ہے۔ان کے خطوط میں زبان وبیان اور اسلوب کے اعتبار سے ادبی شان موجود ہے۔جس میں صاف گوئی اور بے باکی نے چار چاند لگائے ہیں۔اُن کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''سر اقبال کے متعلق میں برابر فکر میں ہوں مگر کیا کروں جن صاحب سے معاملہ پڑا ہے وہ بڑے کمینہ پرور ہیں۔ایک اور تجویز سوجھی ہے جسے میں کسی وقت بیان کروں گا۔کچھ وقت ہی ایسا آ گیا ہے ورنہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔دوسرے یہاں کے فنانس کی حالت اب ایسی نہیں رہی جیسی کہ عام طور پر مشہور ہے۔'' (خطوط عبدالحق، بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ص ۳۴)

علامہ اقبال (1877-1938):

اقبال اردو ادب میں ایک شاعر اور فلسفی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔انہوں نے مشرق و مغرب کے افکار سے استفادہ کیا اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے۔اقبال نے اپنے دوستوں اور معاصرین و بزرگوار کو بے شمار خطوط لکھے۔ان کے ادبی خطوط نیز ذاتی خطوط کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے جن کی روشنی میں ان کی شخصیت، ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہوئی۔اقبال نے شاد عظیم آبادی کو متعدد خطوط لکھے۔ان کو یکجا کر کے محی الدین قادری زور نے شاد و اقبال کے نام سے 1942ء میں شائع کیا۔شیخ عطاء اللہ نے اقبال کے مختلف خطوط کو یکجا کر کے ''اقبال نامہ'' کے نام سے 1945ء میں شائع کیا۔''خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی'' انگریزی انگریزی زبان میں 1947ء میں شائع ہوا۔نیاز الدین خاں نے ''مکاتیبِ اقبال'' کے نام سے 1954ء میں ایک مجموعہ شائع کیا۔سید نذیر نیازی نے ''مکتوبات اقبال'' کے عنوان سے 1957ء میں خطوط کا مجموعہ شائع کیا۔اسی طرح ''انوارِ اقبال''، ''مکاتیبِ اقبال بنام گرامی''، ''نوادرِ اقبال''، ''خطوطِ اقبال''، ''اقبال نامہ'' وغیرہ خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے۔اقبال خطوط کی تحریروں کو مختصر رکھتے تھے اور طول کلامی سے پرہیز کرتے تھے۔ان کے خطوط میں علمی اور ادبی بحثیں ملتی ہیں۔بعض خطوط میں مذہبیات اور تصوف کی بنیادی مباحث کو بھی پیش کیا ہے۔اقبال کا ذہنی لگاؤ چوں کہ فلسفہ سے تھا اس لئے فلسفیانہ موشگافیاں بھی ان کے خطوط میں ملتی ہیں۔ان خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی شخصیت اور فکر و خیالات رکھتے تھے۔علوم و فنون اور شعر و فن کے بارے میں ان کی رائے کیا تھی۔ان کی وسعتِ نظر کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان کے، خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں جو انہوں نے محمد اسلم جے راج پوری کو لکھا تھا۔

''جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام
عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے ایک
کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔''
(اقبال نامہ۔ص54)

اقبال کے خطوط سوانحی نقطۂ نظر سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ان خطوط سے ان کے احوال ذاتی وصفاتی کے پتہ چلتا ہے۔ان کی زندگی کے نشیب وفراز، معاصرین ومتعلقین سے تعلقات، عصر حاضر کی صورتِ حال وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

نیاز فتح پوری(1884-1966):

اس دور کے ایک اہم مکتوب نگار نیاز فتح پوری بھی ہیں۔اپنے علمی وادبی کارناموں کی وجہ سے اردو ادب میں ان کا قد بہت بلند ہے۔ان کے خطوط رسالہ ''نگار'' میں شائع ہوتے تھے۔بعد میں مکتوبات نیاز کے عنوان سے اسے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔نیاز فتح پوری عام طور پر اپنے مکتوبات میں القاب وآداب سے پرہیز کرتے تھے جس کی وجہ سے کئی بار انہیں اعتراض جھیلنے پڑے۔کئی بار اس اعتراض کا معقول جواب بھی تحریر کیا اور لکھا کہ ''خدا جانے وہ کون تھا جس نے یہ رسم ڈالی کہ کسی خط کو لکھو تو ابتداء القاب وآداب سے کرو۔'' تاہم بعض خط میں وہ مکتوب الیہ ہی سے پوچھتے ہیں کچھ بتاؤ میں تمہیں کس طرح خطاب کروں اور کبھی کبھی جب وہ خطاب اور القاب استعمال کرتے ہیں۔تو یوں مخاطب ہوتے ہیں.....قبلۂ روحانیاں، جانِ عالم، کرم گستر، اے صاحب مکارم اخلاق، صاحبِ الطاف عمیم، غارت گر تمکین وہوش، قبلۂ مستمنداں، نیاز نوازاً، آرام جاں، وغیرہ

نیاز فتح پوری نے مکتوب نگاری میں مرزا غالب کی اتباع کی ہے۔ان کے خطوط میں بھی وہی بے تکلفی، سادگی، فطری انداز واسلوب، وہی طرزِ فکر، وہی لطف وکرم کی باتیں اور علمی بو باس ملتی ہے جو غالب کے خطوط کی پہچان ہے۔نازفطرت کی نیرنگیوں کو بھی اکثر اپنے خطوط کا حصہ بناتے ہیں۔رومان کی ایک دبیز لہر ان کے اسلوب کو تقویت عطا کرتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نیاز اپنے انداز واسلوب کے اعتبار سے ایک بڑے انشا پرداز بھی ہیں۔خواجہ احمد فاروقی نے ان کی مکتوب نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

''ان کے خطوط میں اسلوب کا اچھوتا پن، بیان کی ندرت، تخیل کی بلندی،
ظرافت کی بہار سب کچھ ہے۔'' (نگار۔ نیاز نمبر۔ حصہ اول۔ ص149)

نیاز کے خطوط میں جو شگفتگی اور بالیدگی ہے وہ ان کے طنز کی زہرناکی کو تیز نہیں ہونے دیتی۔ ان کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''درتوبہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہمیشہ گناہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس لئے تمہارے اعتراف کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ بت شکنی کا کفارہ ''تعمیر کعبہ'' سے بھی نہیں ہوسکتا۔ تمہاری جھوٹی باتوں کی کیا حقیت ہے۔''

ابوالکلام آزاد (1888-1958):

مولانا آزاد کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ نثر نگار، مذہبی اور سیاسی رہنما، ادیب اور صحافی تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی لیکن انہوں نے اردو میں مقام و مرتبہ حاصل کیا وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا۔ ان کے تبحر علمی سے ادب، مذہب اور سیاست کے مردِ میدان بھی متاثر تھے۔ سیاسی اور علمی سمجھ بوجھ کے لئے جواہر لال نہرو نے ان کی تعریف کی، سرسید کے مذہبی نقطۂ نظر کا مدلل جواب فراہم کرنے کے سبب علمائے دین نے سراہا اور ان کی ادبی فتوحات پر تو ناقدین و محققین نے صفحے کے صفحے سیاہ کیے اور ان کی انشا پردازی کا اعتراف کیا۔ مولانا آزاد کے کئی خطوط کے مجموعے شائع ہوئے۔ کاروانِ خیال، غبارِ خاطر، نقشِ آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد، تبرکاتِ آزاد، جیسے مجموعوں سے اُن کی شہرت غیر معمولی طور پر پڑھی۔ ان مکتوبات کے مجموعوں میں سب سے زیادہ شہرت ''غبارِ خاطر'' کو ملی۔ اس مجموعے کے خطوط قلعہ احمد نگر جیل میں حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور نواب صدر یار جنگ کے نام لکھے گئے۔ تین سال کی اس قید میں یہ خطوط لکھے گئے مگر انہیں ارسال نہیں کئے گئے اور ''غبارِ خاطر'' کے نام سے اسے شائع کیا گیا۔ ان خطوط سے مولانا آزاد کی شخصیت ان کی انشا پردازی، ان کی علمیت، ان کی سیاسی دروراندیشی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے خط کا یہ اقتباس جو حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھا گیا تھا ملاحظہ کریں:

''جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی تاہم طبع نالہ سنج

گولیاں کریں۔فریاد یاسیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔آپ سن رہے ہوں یا نہ
سن رہے ہوں، میرے ذوق مخاطب کے لئے یہ خیال بس کرتا ہے کہ
روئے سخن آپ کی طرف ہے۔'' (غبارِ خاطر۔ص7)

رشید احمد صدیقی (1892-1977)

اردو ادب میں رشید احمد صدیقی کئی حیثیتوں سے مشہور ہیں۔وہ انشائیہ نگار، خاکہ نگار، خودنوشت نگار، نقاد، مکتوب نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔انشائیوں میں ان کا مزاحیہ اسلوب آج بھی ذہن ودل کو گدگدا دیتا ہے۔رشید احمد صدیقی غالب، اکبرالہ آبادی، اقبال، حسرت اور فانی کے شیدائی ہیں۔ان شعراء کے بارے میں ان کی تنقیدی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔رشید احمد صدیقی نے اپنے معاصرین، دوستوں اور بزرگوں کو متعدد خطوط لکھے۔وہ خطوط کی اشاعت کے بالکل قائل نہیں تھے۔ان کا ماننا تھا کہ خطوط نجی اور پرائیویٹ ہوتے ہیں اس لئے ان کی اشاعت نہیں ہونی چاہئے۔یہی وجہ ہے کہ اصغر گونڈوی کے انتقال پر ان کے گھر جا کر ان کو لکھے گئے تمام خطوط واپس لے آئے۔رشید احمد صدیقی کے ادبی خطوط کی تعداد بھی بہت ہے۔ان کے کئی خطوط کے مجموعے شائع ہوئے جیسے۔خطوط رشید احمد صدیقی، مکاتیب رشید، رشید احمد صدیقی کے خطوط، رقعات رشید وغیرہ۔ان مکتوبات میں رشید احمد صدیقی کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔وہ ایک پڑھے لکھے باشعور ادیب تھے۔ان کی زبان اور اس زبان میں ان کی عملیت اور گہرے مطالعے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان کے خطوط میں علم وادب اور تاریخ وتہذیب کی ایسی گہری گہری باتیں ملتی ہیں جو ذہن کے دریچے کھولتی ہے۔ان کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''اچھا ادیب اور بڑا شاعر مذہب، اخلاق، فلسفہ، تصوّف، فنونِ عالیہ، سب
سے استفادہ کرتا ہے۔لیکن کسی کا پابند نہیں ہوتا۔شاعری اور تذکرہ کی
صورت میں یہی فرق اور امتیاز ہے۔البتہ یہ لازمی ہے کہ شاعر عفت
وعظمت انساں سے روگردانی نہ کرے بلکہ نگراں اور نگہبان رہے۔''
(مکاتیب رشید۔ص85)

فراق گورکھپوری(1896-1982):

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اردو کے بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔ان کی غزلیں اور نظمیں بہت معروف اور پرکشش مزاج رکھتی ہیں۔انہوں نے تنقید بھی لکھی اور خطوط بھی۔انگریزی ادب کے پروفیسر ہونے کے ناطے مغربی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔سنسکرت شعریات کا بھی انہیں گہرا علم تھا۔اس لئے ان کی تحریروں میں علمیت کے ساتھ ساتھ جمالیات کا بھی گہرا شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔''من آنم'' کے نام سے ان کے خطوط کا مجموعہ 1962ء میں محمد طفیل نے شائع کیا تھا جو انہیں کے نام لکھا گیا تھا۔ان کے خطوط میں بھی فراق کی زندگی کی بھرپور تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ادبی اور علمی باتوں کے ساتھ فلسفیانہ مباحث بھی ان کے خطوط کو زندگی بخشتے ہیں۔دانش اور آگہی ان کے خطوط خشک نہیں ہونے دیتے۔حسن و جمال کی باتوں سے بھی ان کے خطوط معطر ہیں اس لئے کہیں بھی بے کیفی نظر نہیں آتی۔ بے تکلفی اور غیر رسمی انداز نے ان کے خطوط کو نئی زندگی عطا کی ہے۔فراق نے اپنے بیشتر خطوط میں اپنی شاعری کے جواز پیش کیے ہیں۔اس اعتبار سے ان کی شعر فہمی اور شاعری کے بارے میں ان کے نظریات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ فراق کے خطوط میں محض ان کے شعری تصورات وخیالات ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے شعراء وادیب کے بارے میں بھی انہوں نے بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ان کے خطوط کے اسلوب میں بڑی جاذبیت ہے۔ان کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا ہوں کہ زندگی کے خوشگوار حالات وتجربات سے ایک سچا جمالیاتی احساس پیدا کیا جائے زندگی کا ایک وجدانی شعور حاصل کرنا وہ آسودگی اور طمانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے دکھ سکھ دونوں نامکمل رہتے۔ یہی احساس میرے محرکاتِ شعری رہتے ہیں۔''(من آنم۔ص18)

سید احمد شاہ پطرس بخاری (1898-1958):

پطرس بخاری اردو کے ممتاز مزاح نگار ہیں۔ان کے انشائیوں میں مزاحیہ اسلوب کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔اردو ادب میں وہ صحافی، مترجم اور نقاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔انھوں نے زندگی کا مطالعہ بہت

گہرے انداز سے کیا تھا اس لئے زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے لئے لائق توجہ ہوتی تھیں۔ وہ جس زندہ دلی سے لکھتے ہیں اس سے ان کے اسلوب میں جان پڑ جاتی ہے۔ بے تکلفی، برجستگی، بزلہ سنجی اور خوشدلی صرف ان ک یا نشائیوں میں نہیں ملتی بلکہ ان کے خطوط میں بھی یہی اسلوب کی خوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''پطرس کے خطوط'' 1994ء میں شائع ہوئے جس میں تیرہ اشخاص کے نام 61 خطوط ہیں۔ سب سے زیادہ عبدالمجید سالک کے نام 30 خطوط ہیں۔ اسی طرح ان کے مکتوب الیہ میں غلام رسول میر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سید ہاشم رضا، امتیاز علی تاج، عبدالرحمٰن چغتائی وغیرہ ہیں۔ ان کے بعض خطوط رسالہ ''نقوش'' میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے خطوط میں سیاسی صورت حال پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مکتوب الیہ کو روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے واقف کراتے ہیں۔ یو۔ این۔ او کی باتیں بتاتے ہیں مختلف ممالک اور شہروں کی زندگی کے بارے میں خبر دیتے ہیں۔ ایک بے ساختگی ان کے خطوط میں ملتی ہے جو اپنی سادگی اور سلاست کی وجہ سے دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ خلوص اور ایثار کا جذبہ بھی ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''میکسکو مجھے بے حد پسند آیا۔ پہاڑی ملک ہے۔ آب وہوا خوشگوار ہے۔ لوگ رنگین طبع، با اخلاق، رنگین پوش ہیں۔ پابندی اوقات کو رذیلوں کا شیوہ سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور ناچ اور سواری کے بے حد شوقین ہیں..... گفتگو میں آپ، جناب، حضور وغیرہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں ناممکن ہے کہ رزیل سے رزیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ ادا نہ کرے ..... یہاں اکثریت اصل باشندوں کی ہے۔ ان سے کم دو غلے لوگ ہیں اور اصلی خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔''
>
> (کلیاتِ پطرس، ص 750)

4.4 پریم چند کے خطوط

اردو ادب میں پریم چند کی شناخت ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے جس کے بارے میں تفصیل سے آپ پچھلے سبق میں پڑھ چکے ہیں۔ اپنی ذاتی ضرورتوں اور نجی و ادبی معاملات پر پریم چند نے اپنے دوستوں، معاصر

ادیبوں اور بزرگوں کو بے شمار خطوط لکھے۔ ان کے خطوط کو جو 1905 سے 1936ء کے درمیان لکھے گئے تھے انہیں دوحصوں میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے اور مدن گوپال نے ترتیب دیئے اور 1962ء میں 'ہنس پرکاشن' کے زیراہتمام شائع کیا۔ ان میں کل 260 خطوط شامل ہیں۔ بعد میں مدن گوپال نے جب کلیات پریم چند، کی اشاعت کی تو اس کے سترہویں جلد میں دستیاب شدہ تمام خطوط کو شامل کرلیا۔ یہ تمام، خطوط دیا نارائن نگم، جتندر کمار جین، امتیاز علی تاج، بنارسی داس چترویدی، فراق گورکھپوری، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، اپندر ناتھ اشک، وشنو پربھاکر، مالک لال جوشی، اندر ناتھ مدان، کیشو رام سبھر وال، درگا سہائے سرور وغیرہ جیسے مشاہیر، مصنّفین وناشرین کے نام لکھے گئے ہیں۔ پریم چند کے جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں تقریباً اتنے ہی تلف بھی ہوئے۔ بعض ادیبوں نے ان کے خطوط سنبھال کر نہ رکھ سکے، بعض ملک کی تقسیم کی نذر ہوگئے، بعض کسی دوسرے حادثے میں ضائع ہوگئے۔ مثلاً فراق گورکھپوری نے بھی پریم چند کے خطوط کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ان کو لکھے گئے بیشتر خطوط تلف ہوگئے۔ کچھ خطوط قاضی عبدالغفار کے گھر پر کسی حادثے کی نذر ہوگئے۔ اسی طرح دلارے لال بھارگو اور ونود شنکر ویاس نے مدن گوپال کو خطوط یا خطوط کی نقل تک دینے سے انکار کردیا۔ گویا آج تک وہ خطوط منظر عام پر نہیں آئے۔ پریم چند کی بیوہ اور اولاد نے بھی بہت سے خطوط کو سنبھال کر رکھنے میں ناکام رہے۔ پریم چند کے بعض خطوط ان کی زندگی میں بعض رسائل میں بھی شائع ہوئے۔ اب تک جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن پر دن، تاریخ مرقوم نہیں ہیں۔ پریم چند اکثر خط لکھتے وقت دن، تاریخ اور سال بھول جایا کرتے تھے۔ اس سے خط کے زمانی تعین میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ چند خطوط ایسے بھی دستیاب ہوئے جو خراب اور خستہ حالت میں تھے اور بعض جلدی میں لکھے گئے تھے جن کو پڑھنا دشوار تھا۔ پریم چند کے دستیاب خطوط کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خطوط میں زیادہ تر ذاتی زندگی کی پریشانیوں کو پیش کیا گیا ہے یا نوکری اور مالی پریشانیوں کو بیان کیا گیا ہے یا اپنی کہانیوں اور ناولوں کی اشاعت اور ان پر ملنے والی مالی مدد کے لئے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چند خطوط میں کہانیوں اور ناولوں کے اردو سے ہندی یا ہندی سے اردو ترجمہ کا ذکر بھی ہے۔ ان خطوط کی روشنی میں جو باتیں سامنے آتی ہیں ان سے ہم پریم چند کی شخصیت، ان کی فکر، ان کے رشتے، ان کے مطالعے کی سمت، ان کے اخلاق اور زندگی کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

پریم چند کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچوں کو زیادہ تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔ کاروباری

زندگی میں کامیابی کے لئے اور دولت کمانے کے حق میں تھے۔عورتوں کو تعلیم کے حق میں بھی وہ نہیں تھے۔ان کا خیال تھا کہ عورتیں بس اتنا پڑھ لکھ لیں کہ اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنا سکیں۔شادی سے قبل لڑکا اور لڑکی کو ایک دوسرے کو دیکھ لینے کے حق میں تھے۔پریم چند پردے کے بالکل قائل نہیں تھے۔وہ شادی سے قبل لڑکا لڑکی کو ملنے جلنے کے قائل نہیں تھے۔پریم چند لڑکیوں کے لئے انگریزی، ہندی، سلائی کڑھائی کے حق میں تھے لیکن اسی حد تک کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔وہ لڑکیوں کو کھانا بنانے کے ہنر میں ماہر ہونے کے طرفدار تھے۔وہ بیٹی کو جہیز دینے کے قائل بھی نہیں تھے تاہم چاہتے تھے کہ بینک میں ایک معقول رقم اس کے نام سے جمع کرائی جا سکتی ہے۔پریم چند کو بچوں سے محبت تھی۔پریم چند تعلیم یافتہ لڑکوں کی جانب سے بدگمان تھے۔یونیورسٹی کی تعلیم کو تباہ کن، بدمزاجی، بدتمیزی اور کج خلقی پر منتج کرتے تھے۔اسی طرح ان کے بہت سے خطوط ایس ہیں جن میں کہانیوں کی شاعت کا ذکرہ ے، ان پر ملنے والی رقم یا اس رقم میں کی جانے والی تخفیف کا ذکر ہے یا برطانوی حکومت کے مظالم کا ذکر ہے۔دو ادیبوں کے موازنے کے بھی پریم چند قائل نہیں تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس سے دلوں کے دریاں بڑھتی ہیں۔وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کو سماجی مقصد کے تحت لکھنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔کہانیوں میں نفسیاتی گرہ کسائی کے بھی قائل تھے اور قدرت کے تقاضوں کے بھی۔وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے تھے اور وہ جمہوریت کے بھی قائل نہیں تھے۔پریم چند کو ادب میں زنانہ پن پسند نہیں تھا۔اسی سبب انہیں ٹیگور کی نظمیں پسند نہیں تھیں۔شاعروں میں وہ غالب کو پسند کرتے تھے۔اردو زبان انہیں ہندی کے مقابلے زیادہ پسند تھی۔ان کا ایسا ماننا تھا کہ اردو زبان نکھری ہوئی امور لوچ دار ہے جو ہندی سے زیادہ لطف دیتی ہے۔انہیں اپنی کہانیوں اور ناولوں کا کم قاری ہونے پر ناراضگی تھی۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے بیشتر لوگ اَن پڑھ ہیں اور جو پڑھے لکھے ہیں وہ پوری ادب پر جان دیتا ہے۔ان کا یہ بھی خیال تھا کہ غلام ملک کا ادب بھی غلام ہی ہوتا ہے۔ہندوستان جب تک آزاد نہیں ہوتا یہاں کا ادب بلند پرواز نہیں ہوسکتا۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل مکمل آزادی ہے۔بڑے ادیب کو وہ کسی خاص قوم یا ملک کا خیال نہیں کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ بڑے ادیب کسی زبان یا ملک کی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ وہ سب کے ہوتے ہیں اس لئے بنکم چندر چڑھی کا بھی اتنا ہی احترام ہونا چاہئے جتنا اقبال اور جوش کا ہوتا ہے۔ہندی کے ادیبوں سے انہیں شکایت تھی کہ وہ اردو کے ادیبوں جیسا ادب پیدا نہیں کر رہے، ان پر یاسیت کا عالم طاری ہے اور ان کا رویہ اردو شعراء کی طرح حقیقت پسندانہ اور فلسفیانہ نہیں ہے۔اردو ادیب جس طرح قوم کو اخوت، مساوات

اور جمہوریت کے اصولوں کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں ویسے ہی ہندی والوں کو بھی رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ پریم چند نے مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اگر اردو داں طبقہ ساتھ دیتا ہے تو پریشد کی زبان اردو ہندوستانی بنے گی اور اگر نہیں دیتا تو ہندی ہندوستانی بنے گی۔ پریم چند کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔

پریم چند دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف تھے۔ مذہبی رسومات کے بھی خلاف تھے۔ وہ ہنومان جی کو ایشور نہیں مانتے تھے لیکن وہ کسی کے عقیدے کو بھی ٹھیس پہنچانے کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں اردو، ہندی، عربی، فاسی، ہر زبان کے الفاظ استعمال کئے اور قومی و مذہبی رواداری کو فروغ دیا۔ پریم چند کا اسلوب ان کے افسانوں کی طرح خطوط میں بھی سادہ اور دل نشین ہے۔ ان کے خطوط کی اصل قوت ان کے مرسلہ پیغام میں ہے جو ان کے افکار و خیالات کو بھی واضح کرتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے دور کی خطوط نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کے چند خطوط کے اقتباسات ملاحظہ کریں:

خط بنام وین بہاری شری واستو 4/اپریل 1928 لکھنؤ

پریہ وپن بابو۔

بابو ستیہ دیونرائن ساہی جب یہاں آئے تھے، تب انہوں نے آپ کا نام مجھے بتایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ جب وہ کچھ دن بعد دوبارہ بنارس پہنچیں گے تب آپ سے آپ کے ویواہ کے سمبندھ میں بات کریں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ودھ گتی، ودھیوئی کے کارن وہ ابھی آپ سے نہیں مل پائے ہیں۔ اس بیچ میں میں نے اپنے بڑے بھائی سے نولائی کیا تھا کہ وہ آپ سے ملیں اور آپ سے آپ کا درشٹی کون تتھا آپ کی اچھاؤں کو جانیں۔ انھوں نے ویسا ہی کیا اور ان کی رپورٹ پر، جو انھوں نے آپ سے مل کر مجھے دی، یہ پتر آپ کو سمرپت کیا جارہا ہے۔

مجھے آپ کو لڑکی دکھانے میں کوئی آپتی نہیں۔ یہ اچھا نشانت سوبھاوک ہے اور میں آپ سے پرنتہ سہمت ہوں۔ آپ یہاں آسکتے ہیں، بلکہ میرے ہی خرچے پر ایک کالمینک نامک ے ساتھ مجھ سے ملیں۔ میرا پتہ او پر لکھا ہے اور کوئی بھی اکّا آسانی سے اسٹیشن سے آپ کو لے آسکتا ہے۔ یدی آپ سوچت کریں کہ آسکیں گاڑی سے آرہے ہیں تو میں اسٹیشن پہنچ جاؤں گا اور آپ کو لے آؤں گا۔

آپ کا ہتشی دھنپت رائے

....

خط بنام دیانارائن نگم　　　　16/جولائی 1919ء گورکھپور

بھائی جان، تسلیم!

جب سے آیا ہوں آپ خاموش ہیں۔ امید ہے کہ آپ خوش ہوں گے۔ معلوم نہیں کلکتہ سے مہاویر پرشاد پودوار نے کاغذ کا نمونہ بھیجا یا نہیں۔ مجھے بھی انہیں یاد دلانے کا خیال نہ رہا۔ آج یاد دہانی کر رہا ہوں۔ کتابت جب تک جاری رہے۔

مضمون بھی لکھ رہا ہوں۔ ذرا پریشان تھا۔ ابھی تک عیال الٰہ آباد سے نہیں آئے، آ جائیں تو مجھے فرصت ہو۔

زیادہ والسلام

نیازمند دھنپت رائے

....

خط بنام امتیاز علی تاج　　　　25/اگست 1919ء گورکھپور

جناب مشفقی، تسلیم!

نوازش نامہ صادر ہوا۔ آپ اپنے سلسلۂ اشاعت کی توسیع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ امر میرے لئے خاص طور پر باعث اطمینان ہے۔ وہیں رسالے اور اخبارات تو بہت ہیں، شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لئے کہ مسلمان ایک لٹریری قوم ہے اور ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے تئیں مصنف ہونے کے قابل سمجھتا ہے لیکن پبلشروں کا یکسر قحط ہے۔ سارے قلمبر و ہند میں ایک بھی ڈھنگ کا پبلشر موجود نہیں۔ بعض جو ہیں ان کا عدم اور وجود برابر ہے..................

اردو کو ہر ایک شعبے کی اچھی اور مستند کتابوں کی جتنی ضرورت ہے وہ محتاج بیان نہیں اور حالاں کہ اس بے بضاعتی کا باعث ایک بڑی حد تک ہماری سیاسی بے دست و پائی ہے۔ تاہم اپنے لٹریچر کی طرف ابھی اتنی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر ہمیں اپنی لاج رکھنی ہے تو اپنے لٹریچر کو فروغ دینا پڑے گا اور چاہے یہ کام افراد کریں یا مجموعۂ افراد۔ مگر اسے کاروباری اصولوں پر کئے بغیر استحکام نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ ایک مشترکہ سرمائے سے کوئی پبلشنگ کا کام جاری کرسکیں تو کیا کہنا۔ لاہور جیسے تجارتی مقام پر ایسی کمپنی کھولنا مشکل نہ ہونی چاہئے۔ بہر حال اگر آپ اشاعت کے کاروبار میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں تو کہکشاں کو بند کیجئے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ کو اس کے جاری رکھنے میں سراسر خسارہ ہے۔ یہی میری دوستانہ صلاح ہے۔ امید ہے آپ میری

صاف گوئی کو معاف فرمائیں گے۔

خاکسار پریم چند

....

خط بنام رام کشور چودھری 4/نومبر 1932ء، سرسوتی پریس

پریہ رام کشور جی

میں ابھی پریاگ گیا تو یہ سن کر گھبراہٹ ہوئی کہ تم بیمار ہو گئے ہو۔ دھنو کی ماں نے کہا کہ دلہن کو بلا بھیجنا۔ مجھے بڑی جلدی تھی۔ سوچا تھا منّا کو بھیج دوں گا۔ پریہ سماچار پا کر نہ بھیجا اب کر پیہ لکھو کہ کیسی طبیعت ہے۔ دلہن کے سواستھ کا کیا ڈھنگ ہے؟

ہم لوگ کشل سے ہیں۔ بیٹی دیوڑی سے دسمبر میں آئے گی۔

شیش کشل

سیریم دھنپت رائے

....

خط بنام محی الدین قادری زور ہنس کاریالیہ، بنارس 31/اگست 1935

جناب مکرم بندہ، تسلیم!

''دکن کا اردو شاعری'' کے لئے شکریہ۔ چوں کہ بمبئی میں دفتر میں کوئی اردو خواں آدمی نہیں ہے اور مضامین کے ترجمے کی ذمہ داری مجھ پر عائد کی گئی ہے۔ میں بہت جلد مضمونِ ہذا کا ہندی ترجمہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ خیال یہی ہے کہ دیرینہ وہ جائے کیوں کہ پہلی ستمبر سے پرچے کی طباعت شروع ہو جائے گی۔ اگر مجھ پر اعتبار کر سکیں تو میں اس کا ذمہ لےلوں گا کہ آپ کے مضمون کا بہترین ترجمہ ہوگا اور اصل سے کسی طرح انحراف نہ ہوگا۔ ہاں، اصل کی خوبیاں ترجمے میں آنی مشکل ہیں جو شاید آپ خود تسلیم فرمائیں گے۔

''ہنس'' کے ادب میں اس وسیع میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کی ہے، دیکھیں اسے کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔

پریم چند

....

بنام کیشو رام گھر وال　　نولکشور پریس،لکھنو،20 ستمبر 1929

عزیز سبھر وال

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کتنا احسان فراموش ہوں کہ آپ کی مہربانیوں کو پی گیا اور جواب تک نہ لکھا۔ مجھے 'جاپان ٹائمز' کے شمارے ہر ماہ پابندی سے مل رہے ہیں۔ سالنامہ مجھے خاص طور پر پسند آیا کیونکہ اس میں جاپان کے متعلق جامع معلومات تھیں۔ ان نوازشوں کے لیے میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں ٹائمز بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ کیونکہ یہ بہت ولولہ انگیز اور روح پرور ہوتا ہے۔ اس کے ادبی مضامین سے مجھے خصوصی دلچسپی ہے۔ کیا آپ نے ہندستان کے مشہور اہل قلم کو 'ٹائمز' کے لیے لکھنے کی دعوت نہیں دی؟ کیونکہ میرے خیال میں اس سے دو قوموں کے درمیان زیادہ خوشگوار تعلقات قائم ہونے میں مدد ملے گی۔ بطور ایک ہندستانی مجھے اس بات پر دکھ ہے کہ اس رسالے کو ہندستان اور اس کی جدوجہد آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہندستان بجا طور پر جاپان پر فخر کر سکتا ہے۔ اور قدرتی طور پر اس سے ہمدردی کی توقع رکھتا ہے۔ جاپان میں ڈاکٹر ٹیگور کے شاندار استقبال سے ہر شخص یہی سمجھا تھا کہ جاپان کی ہندستان سے دلچسپی بالکل ختم نہیں ہوئی مگر افسوس کہ جاپان کی دلچسپی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

کیا 'مادھوری' اور 'وشال بھارت' میں شائع شدہ میری کوئی حالیہ کہانی آپ کو پسند آئی؟ آپ اُن کے مقصد کو شاید پسند نہ کریں۔ مگر جب تک ہندستان غلام ہے اس کا آرٹ بلند ترین پروازیں نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غلام ملک کا ادب کسی آزاد ملک کے ادب سے مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے سماجی اور سیاسی حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ جہاں بھی موقعہ ملے لوگوں کو تعلیم دینے کی کوشش کی جائے۔ جذبات جتنے شدید ہوں گے تصنیف اس قدر ناصحانہ ہوگی۔ نوجوان اہل قلم اس سلسلہ میں زیادہ قصوروار ہیں۔ جوانی کے جوش میں وہ آرٹ کے اصولوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا انھیں معاف کیا جا سکتا ہے؟

میں نے حال ہی میں دو مختصر ناول 'نرملا' اور 'پرتکیا' کے نام سے لکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ادبی شاہکار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان کے ذریعہ صرف سماجی برائیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کیا آپ انھیں پڑھنا پسند کریں گے؟ مطلع فرمائے گا۔

اس سال بارش سے بہت نقصان ہوا ہے۔ کچھ صوبوں میں سیلاب آئے۔ لیکن اگر ستمبر کے مہینہ میں بارش نہ

ہوئی تو اب تک کی بارش سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

دعائے خیر

آپ کا، دھنیت رائے

....

بنام اپندر ناتھ اشک سرسوتی پریس، کاشی، 14 فروری 1934

پریہ اپیندر ناتھ جی، آشیرداد

ایک مدت کے بعد تمہارا خط ملا جسے پڑھ کر دُونی چُنتا پیدا ہوگئی۔ لیکھکوں کے لیے یہ بڑی آزمائش کا زمانہ ہے۔ خاص کر جب صحت خراب ہو جائے۔ ہندی میں اخباروں کی حالت اردو سے بہتر نہیں ہے۔ میں خود دو اخبار نکال رہا ہوں اور دونوں میں برابر گھانا آرہا ہے یہاں تک کہ اب جی بے زار ہو گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ کسی طرح خوب صورتی سے نجات پا جاؤں۔ آپ کو میں اس کے سِوا اور کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ دس پانچ افسانے ہندی میں نکل جانے دیجیے۔ اس کے بعد غالباً آپ سے ایڈیٹر صاحبان افسانے مانگنے لگیں گے۔ اور شاید کچھ ملنے بھی لگے۔ مگر حالت نہایت حوصلہ پست کرنے والی ہے۔ بک سیلروں کا تجربہ آپ کو جیسا کڑوا ہوا اس سے زیادہ کڑوا مجھے ہو رہا ہے۔ وہ تیرتھ رام میرے ڈیڑھ سو روپے دبائے بیٹھا ہے، پچاس روپیہ محض اخبارات کے اس کے ذمہ نکلتے ہیں۔ مگر دینے کا نام نہیں لیتا۔ اک دوسرا ایک سیلر لاہور ہی میں میرے قریب سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے اور بک سیلروں کا یہ حال۔ بیچارا لیکھک کیا کرے۔ میں نے تمہارا افسانہ 'ہنس' میں دے دیا ہے۔ کہیں کہیں زبان کی اصلاح کرنی پڑی مگر دس پانچ افسانے نکلے بغیر کتاب کے نکلنے میں دِقّت ہوگی اور کیا لکھوں۔ مجھ سے تمھاری جو کچھ امداد ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے حاضر ہوں۔

شبھاکانکشی، پریم چند

4.5 خلاصہ

پریم چند نے اپنے زمانے کے مشاہیر، معاصرین، مصنّفین اور بزرگوں کو خطوط لکھے۔ ان خطوط میں انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والی ہر مشکلات کو بیان کیا۔ ادبی، ذاتی، مالی، معاشی ومعاشرتی، تمام طرح کے تجربوں

کو کھلے دل سے بیان کیا۔ اپنی پسند و ناپسند کا بھی ذکر کیا۔ اردو اور ہندی زبان سے لیکر دیگر یورپی زبانوں، ان کے ادبیات پر اظہار خیال کیا۔ اردو، ہندی کے ادیبوں، ان کے مثبت اور منفی رویوں پر روشنی ڈالی۔ اردو اور ہندی کے ادبی رسائل کو موضوع بنایا۔ کہانیوں کی اشاعت، ناول کی اشاعت، ان کے ترجموں، ان پر ملنے والی مالی امداد، نوکری، تبادلے، اپنی کسمپرسی، دوستوں کی دلجوئی، ان کے فریب، رشتے داروں کی سرد مہری اور مہربانیاں، سب کچھ پریم چند نے اپنے خطوط میں بیان کیے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پریم چند نے اپنی تمام زندگی کے عکس کو خطوط کے حوالے کیا ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے مکمل پریم چند ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پریم چند کی ادبی فکر ہی نہیں سماجی فکر بھی سامنے آتی ہے۔ وہ خود کو کیا سمجھتے تھے، دیگر ادیبوں کی نظر میں وہ کیا تھے، عورتوں کی تعلیم و تربیت کیا اور کیسی ہونی چاہئے، لڑکوں کی تعلیم کیسی ہونی چاہئے۔ شادی بیاہ میں لڑکے لڑکیوں کا انتخاب، ان کا ملنا جلنا، بیوی بچوں کی کفالت، بیوہ کی شادی، غرض ان کے خطوط ان سب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پریم چند کے خطوط اس دور کی تاریخ و تہذیب کا آئینہ ہیں اور ان کی حیثیت دستاویزی ہے جو ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

4.6 فرہنگ

معاصر : ہم عمر، ہم زمانہ

مشترک : شریک کیا ہوا، ایک جیسا

نقائص : نقص کی جمع، کمیاں

پیش رَو : آگے گزرنے والے، پرانے لوگ

زودنویس : جلد جلد لکھنے والا

استفادہ : فائدہ اٹھانا

موشگافی : باریک بینی، چھان بین

وسعتِ نظر : نظر کی کشادگی

القاب : لقب کی جمع

آداب : ادب کی جمع

اتبّاع	:	پیروی کرنا، فرماں برداری
شیدائی	:	عاشق، دیوانہ
جاذبیت	:	جذب کرنے کی صلاحیت
ضائع	:	تلف/رائیگاں
مرقوم	:	لکھا ہوا
اِزدواجی	:	شادی شدہ
تخفیف	:	کمی، گھٹاؤ
ملکیت	:	جائداد، مال واسباب
اخوت	:	بھائی چارہ
پیش گوئی	:	کسی بات کی پہلے سے خبر دینا
کسمپرسی	:	بے چارگی

4.7 نمونۂ امتحانی سوالات

1۔ پریم چند کے معاصر خطوط نگار کی خطوط نگاری پر روشنی ڈالیے۔

2۔ نیاز فتح پوری کے خطوط کا اسلوب کیسا ہے؟

3۔ ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعہ ''غبارِ خاطر'' پر اظہارِ خیال کیجئے؟

4۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط کا امتیازی پہلو کیا ہے؟

5۔ پریم چند کے خطوط کے موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

4.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔ خطوط پریم چند۔ مدن گوپال۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2003

2۔ مکتوباتِ اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء۔ خواجہ احمد فاروقی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2013

3۔ ادبی نثر کا ارتقاء۔شہناز انجم۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1985
4۔ غیر افسانوی اردو نثر: عطیہ رئیس۔ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی۔2008
5۔ مکتوباتی ادب۔شمس بدایونی۔اتر پردیش اردو اکادمی، 2010
6۔ نقوش مکاتیب نمبر 1957

پریم چند کے مضامین

سبق کی ساخت

۱.۱ تمہید:۔

۱.۲ مقاصد:۔

۱.۳ مضمون نگاری:۔

۱.۴ پریم چند کے مضامین:۔

۱.۵ خلاصہ:۔

۱.۶ فرہنگ:۔

۱.۷ نمونۂ امتحانی سوالات:۔

۱.۸ سفارش کردہ کتابیں:۔

۱.۱ تمہید:۔

اُردو ادب میں پریم چند کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ناول او افسانہ نگاری کے میدان میں اُن کے کارناموں سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔اُنھوں نے ناول اور افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور ماٰمین بھی لکھے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ انھیں جوشہرت اور مقبولیت ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں ملی، وہ دوسری اصناف میں نہ مل سکی۔ان کے مضامین کے موضوعات ناول، افسانہ شاعری، مصوّری اور ڈرامہ سے متعلق ہیں۔انھوں نے ان مضامین میں مذکورہ بالا موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔پریم چند کے مضامین ان کے فکر اور ذہنی نشو نما کو سمجھنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ان میں پریم چند کی ہمہ گیر شخصیت کے بعض ایسے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں جو ان کی دوسری تحریروں میں نہیں ملتے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھے گئے ان مضامین میں انھوں نے سادگی اور بے تکلفی سے اظہارِ خیال کیا ہے۔حالانکہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ پریم چند بنیادی طور پر ایک فنکار تھے، ناقد نہیں۔اس لئے ان کے

مضامین میں تنقیدی شعور سے زیادہ تخلیقی احساس کارفرما ہے۔

۲.۱ مقاصد:۔

اس اکائی میں آپ:

- ☆ مضامین کے معنیٰ اور مفہوم سے واقف ہوں گے۔
- ☆ مضامین بحیثیتِ غیر افسانوی نثر سے آشنا ہوں گے۔
- ☆ پریم چند کے مضامین سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- ☆ اردو ادب میں پرین چند کے مضامین کی اہمیت سے روشناس ہوں گے۔

۳.۱ مضمون نگاری:۔

ادبی نثر کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر۔افسانوی نثر میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ کو شامل کیا جاتا ہے جبکہ غیر افسانوی نثر میں مضامین، خطوط، سوانح، خاکہ، انشائیہ، سفر نامہ، رپورتاز وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔مضامین کو غیر افسانوی نثر میں اوّلیت اور اہمیت حاصل ہے کیونکہ سرسید اور ان کے رفقاء نے سنجیدہ نثر کی جانب توجہ دے کر کو غیر افسانوی تحریریں لکھیں وہ مضامین ہی تھے۔

مضمون کسی موضوع یا مسئلے پر معلوماتی یا تجزیاتی تحریر کو کہتے ہیں جس میں علمیت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے ۔اختصار اور غیر جانبداری مضمون کی نمایاں خصوصیات ہیں۔تاہم اکثر صورتوں میں مضمون نگار کی ذاتی پسند و ناپسند اور ترجیحات در آتی ہیں۔موضوع کے لحاظ سے مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔بنیادی طور پر مضامین کو ادبی اور غیر ادبی دو قسم کے موضوعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ادبی موضوعات سے متعلق مضامین کی نوعیت تنقیدی، تحقیقی اور لسانیاتی ہوتی ہے۔غیر ادبی مضامین میں مذہب، فلسفہ، سماج، اخلاق، سیاست، اقتصادیات، ماحولیات، طب، قانون اور سائنس وٹکنالوجی وغیرہ سے متعلق موضوعات شامل کئے جاتے ہیں۔مضمون کو انگریزی زبان میں ESSAY کہتے ہیں۔essay کو سب سے پہلے مغرب میں Johnson نے رواج دیا تھا۔مغرب میں مضمون نگاری کی روایت بہت

مستحکم رہی ہے۔مغرب سے ہی اردو نے اس فن کو مستعار لیا ہے۔

ایک اچھے اور کامیاب مضمون میں موضوع یا مسئلے کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے تمام اہم پہلو زیرِ بحث آ جائیں۔مضمون کی تمہید میں موضوع کا تعارف اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے تمام اہم پہلو زیرِ بحث آ جائیں۔مضمون کی تمہید میں موضوع کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے کہ اس کی اہمیت اور مضمون نگار کی منشا مکمل طور سے واضح ہو جائے۔اس کے بعد منفی ترتیب میں سنجیدہ اور مدلل انداز سے اہم نکتوں کو سامنے لایا جاتا ہے۔اس دوران تحریر میں ربط و تسلسل کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔تحریر میں انتشار سے بچتے ہوئے ضروری وضاحت کے ساتھ بات پوری کر کے مضمون کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔مضمون میں اندازِ بیان اور زبان کی بھی بڑی اہمیت ہے ۔مضمون کی کامیابی کا انحصار زبان و بیان کی سادگی اور شفّافیت پر بھی ہوتا ہے۔

اردو میں اخباروں اور رسالوں کے فروغ کے ساتھ مضمون نگاری کو رواج ملا۔۱۸۵۷ء کے بعد بدلے ہوئے حالات میں مستقل نثری کتابوں کے مقابلے مضامین سے زیادہ کام لیا گیا۔اُس عہد میں دِلی کالج میں ایک پرچہ مضمون نگاری کا ہوتا تھا۔اچھے مضامین لکھنے والے کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ماسٹر رام چندر،سرسید احمد خان،محمد حسین آزاد،نذیر احمد اور ذکاء اللہ وغیرہ شہرت یافتہ مضمون نگار تھے۔ماسٹر رام چندر نے ''فوائد الناظرین'' اور ''محبّ ہند'' کے نام سے دو رسالے بھی جاری کئے تھے۔جن میں علمی و ادبی مضامین چھپتے تھے۔۱۸۵۷ء کے بعد جاری ہونے والے رسالوں میں 'تہذیب الاخلاق'، 'معارف' اور 'مخزن' اہم تھے۔ان رسالوں نے اردو مضمون نگاری کو عام کیا۔سرسید اور ان کے رفقاء کے مضامین مستقل طور سے تہذیب الاخلاق میں چھپتے رہتے تھے ۔الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کے مضامین 'مقالاتِ حالی' اور 'مقالاتِ شبلی' کے نام سے شائع ہوئے۔ان بزرگوں کے علاوہ عبدالحلیم شرر،مہدی افادی،محمود شیرانی،رشید احمد صدیقی،فرحت اللہ بیگ،وحید الدین سلیم ،مولوی عبدالحق،مولانا ابوالکلام آزاد،عابد حسین اور ذاکر حسین وغیرہ نے مضمون نگاری کی روایت کو استحکام بخشا۔دورِ حاضر میں اردو اخبارات اور رسائل کی تعداد میں اضافے کے باعث مضمون نگاری کی روایت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔

۴.۱ پریم چند کے مضامین:۔

فنِ تصویر:۔

ابتدا میں پریم چند کو فنِ مصوری سے خاصا شغف تھا۔وہ اس فن کا مطالعہ نہایت خوش ذوقی اور ناقدانہ بصریت سے کرتے تھے۔مصوری سے متعلق ان کا مضمون 'فنِ تصویر' مارچ ۱۹۰۷ء میں زمانہ میں چھپا تھا۔پریم چند نے اس مضمون میں مصوری کو شاعری کی طرح انسان کے نازک احساسات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک جو کام شاعر کرتا ہے وہی مصور کرتا ہے۔شاعر زبان سے اور مصور پنسل یا قلم سے۔وہ مصوری کا شاعری سے موزانہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سچی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ تصویر کھینچ دے اور سچی تصویر کی صفت یہ ہے کہ اس میں شاعری کا مزہ آئے۔جس طرح شاعر کانوں کے ذریعے سے روح کو مسرت پہنچاتا ہے اُسی طرح مصور آنکھوں کے ذریعے سے آگے مصوری کو شاعری سے برتر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوت باصرہ بہ نسبت قوت سامعہ کے زیادہ نازک اور ذکی الحس ہے۔اسی لئے جو بات مصور ایک نشان، ایک خط یا ذرا سے رنگ سے ادا کر دے گا وہ شاعر کے صدہا اشعار سے ادا نہ ہو سکے گی۔شاعر جب اپنے اشعار پڑھتا ہے تو محض زبان کو اظہارِ خیال کے لئے کافی نہ سمجھ کر آنکھ، ابرو اور انگلیوں سے ایسے اشارے کنائے کرتا ہے جن سے اس کے اشعار کا لطف دوبالا ہو جائے۔گویا اسے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے تصویر نگاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر مصور کی تصویر ہی اس کا خیال ادا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔پریم چند نے اس مضمون میں مصوری کو شاعری سے زیادہ مشکل فن قرار دیا ہے۔اس دعوے کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاعری کا تعلق زبان سے ہے اس لئے شاعر کے دل میں بات پیدا ہوئی اور اس نے زبان سے ادا کر دی۔مصوری کے لئے نگاہ کی درستی، ہاتھ کی صفائی اور رنگ آمیزی کا علم از بس ضروری ہے۔اس لئے مصور ایسی آسانی سے اظہار خیال نہیں کر سکتا جیسا کہ شاعر۔

کلامِ اکبر پر ایک نظر:۔

یہ مضمون ۱۹۰۹ء میں زمانہ میں شائع ہوا تھا۔جیسا کہ مضمون کے عنوان سے واضح ہے کہ اِس کا موضوع اردو کے مشہور شاعر اکبرالہٰ آبادی کی شاعری ہے۔پریم چند نے اس مضمون میں اکبرالہٰ آبادی کی شاعری کا تنقیدی

جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اکبر کو قدامت پرستی اور جدت پسندی کے درمیان کا شاعر تصور کیا ہے۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں دونوں رنگ اعتدال کے ساتھ موجود ہیں اور اسی وجہ سے ان کی شاعری اس درجہ مقبولِ خاص وعام ہے۔ پریم چند کے مطابق اکبر کو دلچسپی اور دلفریبی کے لحاظ سے پرانے طرزِ سخن کا بھی پاس ہے اور اس کے ساتھ ہی خیالات میں اس کے تنگ حدود کی پابندی منظور نہیں۔اسی وجہ سے ان کی شاعری موجودہ معیار کے مطابق ہے۔اس میں ایشیائی اندازِ بیان میں مغربی خیالات کے اعلیٰ ترین نمونے ملتے ہیں۔موجودہ زندگی کے مختلف مسائل پر بھی خاطر خواہ ہدایت اور ہمدردی ہوتی ہے۔جذباتِ انسانی کی بھی جھلک ہوتی ہے۔ پریم چند نے اس مضمون میں اپنی بات واضح کرنے کے لئے کلامِ اکبر سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ یہ مثالیں مضمون کے آدھے سے زائد حصے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ان تمام باتوں کے باوجود مضمون میں تنقیدی بصیرت کا فقدان نظر آتا ہے۔ایسا اس لئے ہے کہ پریم چند بنیادی طور سے ایک فکشن نگار تھے،شاعر یا ناقد نہیں۔

ناول کا فن:۔

یہ مضمون ہندی کے ایک رسالے میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ یہاں اس کے اردو ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس مضمون میں پریم چند نے ناول کی تعریف اور اس کے فن سے بحث کی ہے۔وہ ناول کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔اس کے بعد وہ کردار نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔اس ضمن میں پریم چند دو دبستانوں کا ذکر کرتے ہیں:۔اوّل حقیقت پسند اور دوم مثالیت پسند۔وہ نہ تو خالص حقیقت پسندی اور نہ ہی خالص مثالیت کے حامی نظر آتے ہیں۔ان کے نزدیک حقیقت پسندی اگر ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے تو مثالیت پسندی ہمیں اٹھا کر کسی سکون بخش مقام پر پہنچا دیتی ہے۔اس لئے وہی ناول اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہیں جن میں حقیقت اور مثالیت آمیزش ہو۔اسے آپ مثالی حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔مثالیت کو زندگی دینے کے لئے ہی حقیقت کا استعمال ہونا چاہیے اور اچھے ناول کی خوبی بھی یہی ہوتی ہے۔ناول نگار کا کمال اسی میں ہے کہ وہ ایسے کرداروں کی تخلیق کرے جو اپنے حسن وعمل اور طرزِ فکر سے قاری کی دلچسپیوں کو متاثر کرے۔کردار کو پرکشش اور مثالی بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بالکل معصوم ہو۔اعلیٰ سے اعلیٰ انسان میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔کردار کو دلکش بنانے کے لئے اس کی کمزوریوں پر پردہ

ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ یہی کمزوریاں اس کردار کو انسان بنا دیتی ہیں۔ پریم چند اس مضمون میں ادب کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ادب کا سب سے اونچا آدرش یہ ہے کہ اس کی تخلیق فن کی تکمیل کے لئے کی جائے فن برائے فن کے اصول سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا لیکن وہی ادب قابلِ قدر ہوسکتا ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مظاہر پر رکھی جائے۔ محبت اور رقابت، غصہ اور حرص، عقدیت اور نفرت، تکلیف اور آسائش۔ یہ سب ہماری مختلف ذہنی حالتیں ہیں۔ ان ہی کی جھلکیاں دکھانا ادب کا بنیادی مقصد ہے۔

مختصر افسانہ:۔

پریم چند نے یہ مضمون بھی ہندی میں لکھا تھا۔ بعد میں اس کا ترجمہ اردو میں ہوا۔ اس مضمون میں افسانہ نگاری کے فن سے بحث کی گئی ہے۔ مضمون میں پہلے مذہبی قصوں میں افسانوی عناصر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مغرب بالخصوص روس اور فرانس کے اہم افسانوں کی خوبیوں کا ذکر ہے۔ پریم چند مغرب کے نمائندہ افسانوں کی اہم خصوصیات، سادگی اور روانی بتاتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ کے فن پر ناول سے موزانہ کرتے ہوئے مدلل بحث کی ہے۔ ان کے مطابق افسانہ اور ناول میں اختصار اور وسعت کے علاوہ بھی بہت بڑا فرق ہے۔ ناول، واقعات اور تصویروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔، افسانہ صرف ایک واقعہ ہے۔ دوسری تمام باتیں اسی ایک واقعے کے زیرِ اثر ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس کا موازنہ ڈرامہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ناول میں آپ خواہ کتنے ہی واقعات لائیں، کتنے ہی مناظر کھینچیں اور کتنے ہی کرداروں کی مصوری کریں۔ یہ ضروری نہیں وہ سب واقعات اور کردار کسی ایک نکتہ پر مل جائیں۔ ان میں کتنے ہی کردار تو صرف جذبات اور احساسات نمایاں کرنے کے لئے ہی رہتے ہیں۔ افسانہ میں اس اجتماع کی گنجائش نہیں بلکہ بعض ماہرینِ فن کی رائے تو یہ ہے کہ اس میں صرف ایک ہی واقعہ یا کردار کا بیان ہونا چاہیے۔ ناول نگاری میں آپ کے قلم میں جتنی طاقت ہو اتنا زور دکھایئے۔ سیاست سے بحث کیجیئے، کسی محفل کے بیان میں دس بیس صفحے لکھ جایئے کوئی گرفت نہیں۔ افسانہ کا معاملہ یہ ہے کہ آپ محفل کی طرف سے گزر جائیں گے اور اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھا سکتے۔ افسانہ میں تو ایک لفظ اور ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو افسانہ کے مقصد کو واضح نہ کرتا ہو۔ اس کے علاوہ افسانہ کی زبان بھی بہت سہل اور عام فہم ہونی چاہیے۔

ڈرامہ جنگ روس و جاپان:۔

پریم چند کا یہ مضمون فروری ۱۹۰۴ء میں زمانہ میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں پریم چند نے ظفر علی خان کے ڈرامہ جنگِ روس و جاپان' کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا ہے۔ پریم چند خود ایک ڈرامہ نگار تھے اس لئے اس فن سے وہ واقف تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اس تجزیے میں 'ڈرامہ جنگ روس و جاپان' کی خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ پریم چند نے اس ڈرامے کو ناول سے زیادہ قریب بتایا ہے۔اس ڈرامے کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں کہ ظفر علی خان نے جنگِ روس و جاپان پر ایک ڈرامہ لکھا ہے جس میں جنگ کے اسباب، جاپانی سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی حب الوطنی، روسی فوج کے باہمی عناد و فساد اور اس کے نتائج بڑے پر لطف پیرائے میں دکھائے گئے ہیں۔کہیں کہیں حسن و عشق کی چاشنی بھی دی گئی ہے جس سے کتاب کی دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے۔مگر ڈرامہ کا اعلیٰ ترین وصف یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ جوشِ دل سے گرم ہوا اور سننے والے کے دل سے کبھی گدگدی، کبھی سوز و گداز، کبھی جوش و خروش اور کبھی غم و غصہ پیدا کرے۔اس لحاظ سے ہم اس کتاب کو بجائے ڈرامہ کے ناول سے زیادہ مشابہ سمجھتے ہیں۔علاوہ بریں ایک نقصِ فن یہ ہے کہ ساری کتاب پڑھ جایئے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون ہیرو ہے اور کون ہیروئن۔عموماً ڈرامہ میں ہیرو سے ایسے اہم پارٹ ادا کرائے جاتے ہیں اور کل اقتباسمیں اس کا حصہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کو دوسرے معمولی کیرکٹروں سے تمیز کر لینا بہت آسان ہوتا ہے۔مگر اس ڈرامہ میں غور کرنے سے بھی یہ سمجھ نہیں آتا کہ کس کو ہیرو قرار دیں اور کس کو ہیروئن۔اسی طرح کی دیگر خامیوں کی نشاندہی اس مضمون میں پریم چند نے کی ہے۔

گالیاں:۔

پریم چند نے ہندوستان کی سماجی اور عام تہذیبی زندگی کے بعض مسائل پر بھی اصلاحی نقطۂ نظر سے متعدد مضامین لکھے ہیں۔' گالیاں' اسی قسم کے مضامین کا نمونہ ہے۔یہ پریم چند کی انشا پردازانہ قدرت کا ثبوت ہے کہ ایسے نازک اور ناگفتنی موضوع پر لکھتے ہوئے مضمون میں ابتدا سے آخر تک ایک شائستہ، شگفتہ اور پاکیزہ انداز برقرار رہا ہے۔ پریم چند کے دوسرے مضامین سے قدرے مختلف یہ مضمون 'زمانہ' میں ۱۹۰۹ء میں چھپا تھا۔اس مضمون کا موضوع اصلاحی ہے جس میں پریم چند نے ہندوستان کی عوامی زندگی میں رائج گالیوں پر طنز آمیز لہجے بھرپور روشنی ڈالی ہے

۔پریم چند لکھتے ہیں کہ ہر قوم کا طرزِ کلام اس کی اخلاقی حالت کا پتہ دیتا ہے۔ اگر اس لحاظ سے سے دیکھا جائے تو ہندوستان روئے زمین کی تمام قوموں میں سب سے نیچے نظر آئے گا۔اس کے نزدیک طرزِ کلام کی متانت اور شستگی ،قومی عظمت اور اخلاقی پاکیزگی ظاہر کرتی ہے۔اس کے برعکس بدزبانی،قومی زبان کا پختہ ثبوت ہے۔جتنے گندے الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں،شائد ہی کسی مہذب قوم کی زبان سے نکلتے ہوں۔ہماری زبان سے گالیاں ایسی بے تکلّفی سے نکلتی ہیں گویا ان کا زبان پر آنا ایک ضروری امر ہے۔ہم بات بات پر گالیاں بکتے ہیں اور ہماری گالیاں ساری دنیا کی گالیوں سے نرالی ،مکروہ اور ناپاک ہوتی ہیں۔اس مضموم میں پریم چند نے گالیوں کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔

سوامی وویکانند:

پریم چند کی ابتدائی تصانیف میں سوامی وویکانند کے اصلاحی عقائد کا نقش بہت گہرا ہے۔وہ وویکانند کی شخصیت سے حد درجہ متاثر تھے۔مئی ۱۹۰۸ء میں انھوں نے سوامی وویکانند کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا۔اس مضمون میں پریم چند نے وویکانند کی زندگی کے چند اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔پورے مضمون میں وویکانند کی خوبیوں کا ہی ذکر ہے۔ان کی خامیوں یا کمزوریوں سے پریم چند نے گریز کیا ہے۔پریم چند کے نزدیک ہندوستان میں زمانہ قدیم سے جب جب مادتے پرستی حاوی ہوئی ہے،تب تب روحانی پیشواؤں نے یہاں کی عوام کو روحانیت کا درس دیا ہے،اس ضمن میں وہ کرشن جی،گوتم بدھ اور شنکراچاریہ کے بعد وویکانند کا ذکر کرتے ہیں۔پریم چند لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں جب مادیت پرستی نے ہندوستانی تہذیب اور مشرقی روایات پر حملہ کیا۔ایسی حالت میں ہندوستان کی خاک سے پھر ایک بزرگ اُٹھا جو روحانیت کے جوش سے معمور تھا۔جس کا حوصلہ بلند اور نظر وسیع تھی۔جس کا دل جوش محبت سے لبریز تھا ۔اس کی صداقت امیز للکار نے دم زردن میں مادی دنیا میں ایک تہلکا سا ڈال دیا۔اس نے مادیت کے قلعہ میں گھس کر ثابت کر دیا کہ یہ روشنہ جسے تم روشنی سمجھتے ہو،تاریکی ہے۔اس مضمون میں پریم چند نے سوامی وویکانند کے متعدد اسفار کا بیان کرتے ہوئے روحانیت کے موضوع پر ان کی تقریروں کا بھی حوالہ دیا ہے۔

ادب کی غرض وغایت:۔

یہ مضمون پریم چند کا کطبہ صدارت ہے جو ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنّفین کی صدارت کے دوران دیا تھا۔

پریم چند کے تمام مضامین میں ''ادب کی غرض و غایت'' سب سے اہم اور قابلِ قدر ہے۔ پریم چند ادب کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ شستہ اور لطیف ہو۔ جس میں دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔ پریم چند کے مطابق ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ اسی خطبے میں پریم چند نے حسن کی حیثیت اضافی بتاتے ہوئے اس کے معیار کو بدلنے پر زور دیا ہے ترقی پسند مصنفین کا عنوان ناقص ہے کیونکہ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً ترقی پسند ہوتا ہے ۔اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو وہ ادیب نہ ہوتا۔ اسی طرح پورے مضمون میں ادب اور ادیب سے متعلق مفصل اور مدلل بحث دیکھنے کو ملتی ہیں۔

مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ قمر رئیس نے مضامین پریم چند میں دیگر مضامین بھی شامل کئے ہیں۔ ان مضامین کے عنوان اس طرح ہیں: ہندوستانی مصوری، رینالڈس اور اس کی مصوری، جامی کی مثنوی زلیخا، ناول کا موضوع، سرشار اور شرر، مختصر افسانے کا فن، راشد الخیری کے سوشل افسانے، اردو ہندی، ہندوستانی، ۔ یہ تمام مضامین ،پیش کردہ مضامین سے افکار و نظریات اور زبان و بیان کی سطح پر مماثلت رکھتے ہیں۔

۵۔۱ خلاصہ

کسی موضوع یا مسئلے پر علمیت اور سنجیدگی کے ساتھ لکھی جانے والی معلوماتی تحریر کو مضمون کہتے ہیں۔ مضمون کی خصوصیات اختصار، غیر جانبداری اور ربط و تسلسل ہیں۔ مضمون کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں ادب، سماج، مذہب، اخلاق، فلسفہ، سیاست، اقتصادیات، ماحولیاتی، سائنس و ٹیکنالوجی وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں مضامین کی ابتدا ۱۸۵۷ء کے بعد ہوتی ہے جب سرسید اور ان کے رفقاء نے سنجیدہ نثر کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ ان اکابرین نے مضامین کی داغ بیل ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے فروغ کے لئے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ انیسویں صدی میں خطوطِ غالب کو چھوڑ کر غیر افسانوی نثر کا جو سرمایہ ہے اس کا بیشتر حصّہ مضامین کی ہی شکل میں ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے تا حال بیشتر ادیبوں نے مضامین قلمبند کئے۔ یہ الگ بات ہے کہ

کسی کو اس میدان میں شہرت حاصل ہوئی اور کسی کو اس میدن میں شہرت حاصل ہوئی اور کسی کے مضامین گوشہ گمنامی کا شکار ہوئے۔

پریم چند ایسے ہی ادیب ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے لیکن ناول اور افسانوں کی مقبولیت کے باعث ان کے مضامین ناقدین اور محققین کی توجہ سے محروم رہے۔ پریم چند نے مصوری، شاعری، ناول ،افسانہ، ڈراما اور اصلاحی موضوعات پر مضامین لکھے جن میں مذکورہ اصناف کے سلسلے میں ان کے افکار و نظریات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مصوری سے متعلق پریم چند کا مضمون ''فن تصویر'' ہے جس میں انھوں نے اس فن سے متعلق اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مضمون میں پریم چند نے مصوری کا شاعری سے موازنہ کرتے ہوئے مصوری کو شاعری سے مشکل فن تسلیم کیا ہے۔ شاعری پریم چند کا مضمون ''کلامِ اکبر پر ایک نظر'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں انھوں ے اکبر الہ آبادی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے لیکن یہ مضمون تاثراتی نوعیت کا ہے جس میں اکبر کے کلام کی خوبیوں سے زیادہ سروکار رکھا گیا ہے۔ ناول نگاری کے میدان میں پریم چند کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے ناول لکھنے کے ساتھ ساتھ اس فن پر بھی اپنے مضامین میں بحث کی ہے۔ انھوں نے ناول کا مقصد انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا قرار دیا ہے۔ ناول کے بعد پریم چند نے مختصر افسانے کے فن پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے افسانہ کے لئے اختصار کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ افسانے کی زبان سہل اور عام فہم ہونا چاہیے۔ پریم چند نے اپنے مضمون ''ڈرامہ جنگِ روس اور جاپان'' کے حوالے سے ڈرامہ کے فن پر بھی بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ''ڈرامہ جنگِ روس و جاپان'' کی متعدد خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان اصناف کی علاوہ پریم چند نے کچھ متفرق موضوعات پر بھی مضامین قلمبند کئے ہیں ۔اصلاحی موضوع پر لکھا گیا ان کا مضمون ''گالیاں'' میں ہندوستان کی عوامی زندگی میں رائج گالیوں پر طنز کیا گیا ہے۔ شخصی مضامین ''سوامی وویکانند'' پریم چند کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے انیسویں صدی کے مصلح قوم اور ع روحانی لیڈر سوامی وویکانند کی زندگی کے چند اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ پریم چند کے تمام مضامین میں سب سے اہم اور قابل قدر ''ادب کی غرض و غایت'' ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے کا صدارتی خطبہ ہے۔ اس مضمون میں پریم چند نے ادب کی تعریف اور اس کے مقاصد پر مدلل بحثیں اُٹھائی ہیں۔

۶۔۱ فرہنگ

مضامین : مضمون کی جمع
نشوونما : ترقی
ہمہ گیر : ایک سے زائد موضوعات پر مہارت رکھنے والا
تجزیاتی : جس میں تجزیہ کیا جائے
ترجیحات : غلبہ، ترجح کی جمع
لسانیاتی : علمِ زبان سے متعلق
منشا : ارادہ، مقصد
مدلل : دلیل کے ساتھ
شفافیت : کسی چیز کا شفاف ہونا
استحکام : مضبوطی، استواری
باعث : وجہ، سبب
شغف : دلچسپی
خوش ذوقی : مزاج کی خوبی
ناقدرانہ بصیرت : اچھے بُرے میں فرق کرنے کی صلاحیت
قوتِ باصرہ : دیکھنے کے صلاحیت
قوتِ سامعہ : سننے کی صلاحیت
صدہا : سینکڑوں
قدامت پرستی : قدیم روایت کا حامی ہونا
جدت پسندی : نئی طرز کا حامی ہونا
اعتدال : نپا تلا، توازن
فقدان : کسی چیز کی کمی ہونا
رقابت : دشمنی

آسائش : آرام

سوز وگداز : رنج وغم کی کیفیت

مشابہ : ملتا جلتا

شگفتہ : تروتازہ، کھلا ہوا

متانت : سنجیدگی

امر : کام

معمور : بھرا ہوا

دمِ زردن : ذراسی دیر میں

اسفار : سفر کی جمع

طبعًا : فطری طور پر

علمیت : علمی قابلیت

۷۔۱ نمونہ امتحانی سوالات:۔

۱۔ مضمون کی تعریف کرتے ہوئے اردو مضمون نگاری کی روایت سے بحث کیجیے؟

۲۔ غیر افسانوی نثر کی حیثیت سے مضمون نگاری کا جائزہ لیجئے؟

۳۔ پریم چند کے مضامین پر ایک مفصل نوٹ لکھیئے؟

۴۔ پریم چند کے مضامین کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالیے؟

۸۔ ۱ سفارش کردہ کتابیں

مضامین پریم چند۔قمر رئیس

اردو مضمون کا ارتقاء ۔سیدہ جعفر

مضامین پریم چند ۔عتیق احمد

Course Contributors:

1. **Dr. Nehal Ahmed Ansari (Lession 1,2,3,4,5&6)**
   (Asstt. Professor, Urdu, MANUU, College of Teacher Education

2. **Mr. Immudin (Lession 7,8 & 9)**

3. **Dr. Imteyaz Ahmed (Lession 10,11,12,13,14)**

Editing. : Dr. Iftakhar Ahmed
Lect. Department of Urdu, DD&OE.JU. Jammu.

© Directorate of Distance & online Education, University of Jammu, Jammu 2024

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the DDE, University of Jammu.

* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the DDE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By :

DIRECTORATE OF DISTANCE & ONLINE EDUCATION, UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF INSTRUCTION MATERIAL
M.A. URDU (III SEMESTER)

COURSE NO: 306 **Semester-III**

Title: (Study of Prem Chand) **Lesson : 1-14**

UNIT : I-IV

PROF. SHOHAN INAYAT MALIK
COURSE CO-ORDINATOR P.G. URDU (DD& OE)
H.O.D DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF JAMMU, JAMMU.

DR. IFTAKHAR AHMED
TR. INCHARGE P.G. URDU
DD&OE UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

http:/www.distanceeducationju.in

(C) All copyright privileges of the material vest with the Directorate of Distance & Online Education, University of Jammu, Jammu-180006